بلوچ ساحل اور سمندر

1

شاہ محمد مری

سنگت اکیڈمی آف سائنسز

ضابطہ:
جملہ حقوق بحقِ مصنّف محفوظ

کتاب: بلوچ ساحل اور سمندر
مصنّف: شاہ محمد مری
پہلی اشاعت: 2004ء
دوسری اشاعت: 2014ء
تیسری اشاعت: 2016ء
قیمت: 300روپے

زیرِاہتمام:
سنگت اکیڈمی آف سائنسز
مری لیب، فاطمہ جناح روڈ کوئٹہ، بلوچستان
فون:+92-81-2843358
web:www.sangatacademy.net

انتساب

بلوچ ماہی گیروں کے نام.....

جن کے پاس کوئی زمین نہیں،

جن کی کشتیاں اور جال، جاپانی کوریائی ٹرالروں کے سامنے ہیچ ہیں،

جو سنگاپور اور چین کی بڑی توندوں کی خوراک ہیں،

اور.....

جن کی کوئی ٹریڈ یونین نہیں!!

فہرست

2014ء کا پیش لفظ

حصہ اول

سورج کا شہر

تربت سے گوادر کا سفر 11

گوادر میں پہلا دن 17

سمندر، باکرامت 23

یونانی و پرتگالی سام راج 29

بلوچ ساحل و سمندر 41

گوادر بندرگاہ 60

سموراج کی حالت 90

عجوبے 96

’آئی آگ مانگنے، گھر کی مالکن بن بیٹھی!‘ 104

گوادر واپس جانے نہیں دیتا! 110

حصہ دوم

پندرہ برس بعد

بلوچستان کی سڑکوں پر 119

ہنگول نیشنل پارک 134

ہنگول سے ہنگلاج 139

بلوچ مائتھالوجی اور ہنگلاج ماتا مندر 146

اومیتانی بانک 171

اور ماڑہ اور پسنی کے بیچ 182

پھر گوآدر میں..... 192

2014ء کا پیش لفظ

4

کسی قوم کے خلاف سب سے بڑی بددعا یہ ہوگی کہ اُس کی تاریخ اُس سے کھو جائے۔ گم کردہ تاریخ والی قوم کی دعائیں بے اثر، اشجار بے ثمر، اذہان بے خبر اور سارے اعمال باجبر ہوتے ہیں۔ بے تاریخ قوم، لامحالہ بے جغرافیہ بھی بن جاتی ہے.....ہم نیم درجن ممالک میں بکھرے بلوچ تو نہ اپنی تاریخ مکمّل طور پر جانتے ہیں، اور نہ ہمیں اپنی جغرافیائی وسعتوں کا ادراک ہے۔ مطالعہ اور مسافری، تاریخ کی گہرائی اور جغرافیائی گیرائی جاننے کے بہترین ذرائع ہیں۔ میں نے مکران نہیں دیکھا تھا۔ میں نے جغرافیہ نہیں دیکھا تھا۔

انسانی حقوق کمیشن کے وفد میں، میں بھی شامل تھا جب اُس نے مکران کے دورے کا پروگرام بنایا۔ پتہ نہیں اس سفر میں انسانی حقوق ہم نے دریافت کیے یا نہیں، یا کمیشن والوں کو میری موجودگی سے کوئی فائدہ ہوا یا نہیں، البتہ یہ ضرور ہوا کہ مجھے پتہ چل گیا کہ مکران کا علاقہ عرب حملوں سے بہت عرصہ قبل مسلمان ہو چکا تھا۔ میں حیران ہوں کہ اگر بلوچ پہلے ہی مسلمان تھے تو پھر بعد کی فتوحات کو کراچی اور لاہور کے دانش وروں کی طرح ' اسلامی فتوحات' لکھا جائے یا' عربوں کی فتوحات؟!

دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ میں سوڈیڑھ سو صفحوں کا ایک پمفلٹ نما کتابچہ تیار کرنے میں کامیاب ہوا۔ پتہ نہیں یہ سفرنامہ ہے، تحقیق ہے، یا کیا ہے؟ کچھ تو ہے جس کی اُس زمانے میں کچھ کچھ تعریفیں

ہوئی تھیں۔ کتاب آئی، گئی۔ نہ کتاب نے ہم سے کچھ مانگا، نہ ہم نے کتاب سے کچھ چاہا۔ اور اِس عرصے میں ایک نسل جوان ہوئی جو اس کتاب کے بارے میں جانتی ہی نہیں۔ کم سن احباب عمر میں بڑے ہوگئے، میری دوسری تصانیف پڑھیں تو اس کو پڑھنے کی فرمائشیں کرنے لگے۔ چنانچہ 2004 میں جو کتاب ہم سے سرزد ہوئی تھی، 2014 میں اسے دوبارہ چھاپنے کا خیال آیا۔.....شاید اِس میں انہیں اپنے لیے کام کی ایک آدھ بات مل جائے۔

اِن دس گیارہ برسوں میں بلوچستان پہ چلتن پہاڑ جتنی بلند لہریں وارد ہوتی رہیں۔ سرکار مخالف وہ جنگ جس سے پورا مکران ابھی تک ناواقف تھا، ''ہائی ڈیٹڈ'' سِسٹ کی طرح بلوچستان بھر میں سرایت کرگئی۔ اور ایک وقت تو ایسا بھی آیا کہ لگنے لگا پوری جنگ انہی ساحلوں، ریگ زاروں کو شفٹ ہوگئی ہو۔ ایسی شدید اور طویل لڑائی جس میں ہزاروں خاندانوں نے غیر فطری موت کو اپنے آنگن میں دیکھا۔ اولادِ آدم کے مسخ اجسام زندگی کا ایک انوکھا فلسفہ سمجھا رہے تھے۔ بوڑھے، جوان، بچے اور عورتیں۔ سیدھا سیدھا فیوڈل سرکار کی لائی موت، اُس کے بنائے ہوئے لشکروں کے ہاتھوں موت، اُس کی ابھاری ہوئی فرقہ واریت کی موت، موت کی سلطنت، موت کا راج۔ اتنی ہول سیل موت کہ نئے قبرستان وضع ہوئے..... نئے ادب کا ایک دبستان تو وجود میں آنا تھا ناں!۔

انسانی قدرت اور رسائی سے ماورا بلوچستان کا حسن، انسان کے ہاتھ کا بنایا ہوا تو پہلے ہی نہ تھا، مگر جو کچھ قدرت نے اس باب اُسے میں عطا کیا تھا، بگڑ گیا۔ انصاف، صداقت، بھائی چارہ، ماحول دوستی سب برباد.....اور پھر انھیں گوادر بیچ ڈالنے کا خیال آیا۔ پیسہ اور ٹکنالوجی والے تو ایسی سٹریٹجک بندرگاہ خدا سے مانگتے تھے، بردار ممالک کو بھی گوادر کو گود لینے کی بچگانہ خواہش ہوئی۔ یوں گوادر سوئر، کتے اور چوہے خوروں کی جبلّت کا شکار ہوا۔ اُسے چھابڑی میں رکھے منگ پھلی کی طرح پہلے آسٹریلیا کو فروخت کیا گیا، نہ چلا تو یہ چین کی گردن بُر سرمایہ داری کے حوالے ہوا۔ نہ بولی لگی، نہ ٹینڈر کھلے، بس مشرقی میدانوں کی ترقی کے تاوان میں گوادر کو لونڈی بنا دیا گیا۔

یا ہم ''بے پڑھ ناپوہ وناسمجھ'' لوگ ہیں، یا پھر خریدار احمق ہیں، احمقوں سے بھی احمق۔ کسی

نے گوادر کے کیکڑے اور اُن کی کاٹ دیکھی ہی نہیں۔ ارے بابا گوادر کو گوادریوں کے لیے ڈویلپ کرنا اور بات ہے مگر اُسے فروخت کرنے کے لیے سنوارنا اور بات ہے۔ یہاں تو گوادر کو اپنے دولہے کے لیے نہیں بلکہ ''اُس'' بازار کے لیے سجایا، سنوارا، سنگھارا جارہا ہے۔ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ رام کو کیا کیا جتن کرنے ہوں گے، سیتا کو کیا کہا سہنا پڑے گا اور خود راون کا انجام کیا ہوگا!

لگتا ہے کہ خطے میں گوادر کا اغوا سب باتوں پر بھاری رہے گا!

شاہ محمد مری

ماوند

29 جنوری 2014ء

حصہ اول

5

سورج کا شہر

6

تربت سے گوادر کا سفر

مکران ڈویژن کے ہیڈ کوارٹر تربت سے، ''انٹرنیشنل'' ائیر پورٹ، گوادر کے لیے جانے والی ''عظیم لوگوں کی'' پی آئی اے والی پرواز اچانک کینسل ہوگئی تھی۔ (پی آئی اے کے لیے مکران میں ''اچانک'' اور ''معمول'' کے لفظ اپنے اصل معنی کھو دیتے ہیں)۔ ہم ایک لحاظ سے خوش ہوئے کہ اس طرح ہمیں زمینی راستے سے جانے کا موقع ملے گا اور اس طرح ہم اپنا وطن قریب سے دیکھ پائیں گے۔ تربت میں میرے مری قبائل کی اچھی خاصی آبادی رہائش پذیر ہے۔ ان عظیم مہمان نوازوں کی فیاضی کے نتائج سے بچنے کے لیے چھپتے چھپاتے اور کہیں کہیں زبردست قسم کے بہانے تلاش کرتے ہوئے، کہیں طلاق و سوگند کا امرت دھارا استعمال کرتے ہوئے ہم نے ایک ڈبل ڈور پک اپ 2500 روپے میں بک کرلی۔ اور دن کے ایک بجے تربت سے گوادر کی طرف روانہ ہوئے۔

تربت بازار میں کتابوں کی ایک مشہور دکان سے ہم نے کراچی کا شائع کردہ بلوچستان کا نقشہ ساٹھ روپے میں خریدا تا کہ علاقوں، جگہوں سے اچھی طرح واقف ہوسکیں۔ (بلوچستان کا نقشہ تک کراچی میں چھپتا ہے)۔ مگر اس نقشے میں بالیچہ کو بلیابا، ناصر آباد کو نصیر آباد، کلاتک کو کلانوک، نلینٹ کو نالیں لکھا ہوا تھا۔ اس طرح کے اور بھی کئی مزاحیہ الفاظ اور لکیریں تھیں۔ آگے چل کر ہمارے اس نقشے کے ساتھ بلوچستان نے وہی حشر کرنا تھا جو یہ دھرتی، سکندر اعظم کے ساتھ کر چکی تھی۔ ہمیں کوئی اور وارث شاہ تلاش کرنا تھا۔

بلوچستان کی بلوچ بیوروکریسی کی اکثریت مکران سے تعلّق رکھتی ہے اور یہ بیوروکریٹ محفلوں میں بیٹھ کر اپنی ترقی، تہذیبی بلندی اور ترقی پسندی کی بہت سی ہوائیاں چھوڑتے رہتے ہیں۔ مگر اُن کی اصل حقیقت ہم نے جا کر اُن کے گھر، اُن کے گاؤں اور اُن کے علاقہ میں دیکھی، جہاں نہ سڑک ہے نہ سنگِ میل، نہ بجلی نہ آبنوشی کی سکیم۔ ماوند اور مکران میں کوئی فرق نہیں..... پسماندگی میں مساوات۔

مگر یہ مساوات بھی نہیں ہے، اس لیے کہ سرکار کو ہٹا کر ساری بات قدرت پہ رکھیں تو مکران میں تو پہاڑوں کی کمی اور صحرا کی وسعت کے سبب وہ سبزہ بھی نہیں جو مری علاقہ میں ہے۔ نہ بارشیں ہوتی ہیں اور نہ بارشوں سے ہونے والی فصلات، اور نہ فصلات پہ پلنے بڑھنے والے مویشی۔ یہاں تو جہاں دیکھیں مسجدیں ہی مسجدیں ہیں..... پکی مسجدیں، کچی مسجدیں، جھونپڑی جھگی والی مسجدیں، عربی مسجدیں، افغانی جہاد کی مسجدیں، سرکاری فنڈ کی مسجدیں، تبلیغی مسجدیں، ذکری مسجدیں، نمازی مسجدیں.....

ہم مکران جانے والے ہیومن رائٹس کمیشن کا دو رکنی وفد تھے۔ اُس کی سرکردگی بلوچستان برانچ کا سربراہ ڈاکٹر امیر الدین کر رہا تھا۔ رمضان کا مہینہ ہے اور مکران میں روزہ ہے۔ سنو لوگو! مکران میں روزہ ہے۔ سیکرٹری، ڈی سی سمگلر تو ہر جگہ کے بڑے نمازی ہوتے ہیں کہ ہر گناہ گار، ظالم اور دولت مند مزاروں اور مندروں کی بہت دیکھ بھال کرتا ہے۔ چندے اور خیرات پہ سارا زور کہ شاید گناہ دھل جائیں۔ مگر مکران میں تو عام آدمی بھی تیزی کے ساتھ تبلغی جماعت کی ساخت کا چہرہ اپناتا جا رہا ہے۔ سیاست دانوں کی سیاہ کاریوں اور اعتماد شکنیوں نے مکرانیوں کی ساری امیدیں، سارے سہارے چکنا چور کر دیے اور یہ لوگ اپنے عالم گیر سہارے، دائمی سہارے، حتمی سہارے کی طرف لوٹ رہے ہیں..... اور بڑی شدومد سے لوٹ رہے ہیں۔

چنانچہ صحرا کے اس سفر میں مسافروں کو بھی چائے نہیں ملتی۔ حد تو دیکھو کہ غیر آباد دشت میں جھٹکے کھاتے کھاتے جب ہم کھڈان کے موڑ پہ پہنچے تو وہاں جو چھپر والا ہوٹل ہے، وہ بھی بند ہے۔ باہر

بیٹھے ہوئے اس کے مالک نے چائے کی ہماری فرمائش پہ ایسی بے نور آنکھوں اور بے بس لہجے میں ''رمضان'' کہہ دیا، جیسے تیس دن کے بجائے چنگیز خان کے تیس ہزار گھڑسواروں نے اُس پر حملہ کر دیا ہو۔ ایسی سختی مارشل لا والے بریگیڈیئر اخیان گل کے کوئٹہ میں بھی نہ تھی۔ روزہ اور ریت نے ملک کر اس ہوٹل والے کا حلیہ ''سنوار'' دیا تھا۔

یہ پورا علاقہ دشت کہلاتا ہے۔ جو کیچ کی چار سب ڈویژنوں (تربت، بلیدہ، تمپ اور دشت) میں سے ایک ہے۔ خود کیچ بطور ضلع یکم جولائی 1977ء کو اس وقت وجود میں آیا جب مکران کو ڈویژن بنا دیا گیا اور اسے تین اضلاع میں تقسیم کیا گیا تھا۔ واضح رہے کہ 1970ء میں ون یونٹ ٹوٹنے کے وقت پورا مکران ایک ضلع تھا جو بلوچستان کے کل آٹھ ضلعوں میں سے ایک تھا۔ 1995ء میں اس ضلع کا نام تربت سے کیچ رکھ دیا گیا۔ دشت سب ڈویژن کی دو تحصیلیں ہیں؛ دشت کھڈان اور بل نگور۔

دشت کا راستہ، کچا ہے۔ سکندر سے سسی کے عہد تک اور پھر سسی سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کے نصف تک یہاں کوئی کہکشاں وجود میں نہ آ سکی۔ پک اپ گاڑیوں کا زبردستی کا بنایا ہوا کچا راستہ، مسافروں کو مشکل ترین پی ٹی ڈرل کے کاشن دیتا ہوا بے مہر راستہ۔ ویران و بے گیاہ راستہ۔ علاقے کا لینڈ سکیپ ایسا ہے جیسے بچے بلوچی کھیل ''کلیڑو'' کھیلتے ہیں۔ جیسے کسی نے مٹی کی ڈھیریاں بنا بنا کر انہیں اناج کے خرمنوں کی طرح حد نظر تک ایستادہ کر رکھا ہو۔ جیسے مدفون ڈائنو ساروں کی ریڑھ کی ہڈیاں قطار اندر قطار پڑی ہوں۔ صدیوں سے پڑے مٹی یعنی دلدل کے سوکھے ڈھیر، ہر موڑ کا نیا منظر نامہ، ہر ٹیکری کے پار نیا نظارہ۔

کولواہ کے بعد دشت پورے مکران کا دوسرا بڑا بے آب و گیاہ قطعہِ زمین ہے۔ چٹیل میدان جس کے اردگرد پہاڑ ہیں۔ درمیان میں چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں آتی ہیں۔ جہاں سے چھوٹے ندی نالے اس میدان کے چہرے پر بے ترتیب جھریاں ڈالتے آتے ہیں۔ کہور، کہیر کے درخت ہی سبزہ کے سفیر ہیں دشت میں۔ (ان دونوں درختوں سے کتنے سارے محاورے، کتنے استعارے، کتنی

کہانیاں اور کتنے واقعات بنائے گئے ہیں بلوچی زبان میں!!)۔

تربت سے گوادر سفر کے لیے گاڑی بک کراتے ہوئے میں نے اس بات کا خاص خیال رکھا کہ راستے میں بلوچستان کے اس حصے کی لوک موسیقی سنتا جاؤں گا۔ مگر ہمارا ڈرائیور مسلسل جگجیت وَ پنکج کی اردو غزلیں سنتا جاتا ہے۔ میں نے کمالان کے بلوچی کیسٹ تربت سے خرید رکھے تھے۔ اور چاہا کہ اس کی بلوچیت جگا کر دیکھوں۔ میں نے ایک کیسٹ اسے دے دی۔ اس نے لگا تو دی، مگر اس قدر بے دلی سے جیسے اُسے قاعدہ بغدادی پڑھنے کو دیا ہو۔ جوں ہی کیسٹ ختم ہوئی اس نے اس پھرتی سے کیسٹ نکال کر دوبارہ جگجیت لگا دیا، جیسے مچھ جیل سے چودہ سال کاٹ کر رہا شدہ سیاسی قیدی کو گیٹ پہ کسی اور دفع کا وارنٹ دکھا کر پھر اندر ہو جانے کا ڈر ہو۔ بلوچی کا مستقبل کیا ہوگا!!

دشت میں زیادہ تر آبادی دشتیوں پر مشتمل ہے۔ دشتی مشرقی بلوچستان میں میرے اپنے مری قبیلے میں بھی ایک ذیلی طائفے کی صورت میں موجود ہیں جو لوہارانی فرقے میں شامل ہیں۔ میرے ماما خیل وہیں کے دشتیوں میں سے ہیں۔ ہم دوسرے مری، دشتیوں کے بارے میں کہتے ہیں؛

''دشتی بے گوئشتی'' ....(دشتی ضدی)

دشت کا علاقہ ہمارے مکران کے حکمران بیوروکریٹوں کی پسماندگی، لاتعلّقی، بے دردی اور نااہلی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بجلی، سڑک، پانی کچھ بھی نہیں۔ پورے دشت میں پانی نہیں، کنچتی کے آس پاس پیاس ہے، نلینٹ میں پانی نہیں، کپّر بے پانی ہے...... گوادر سے لے کر ڈیرہ غازی خان تک پانی نہیں۔ معزز، مستور، محترم اور پاک بلوچ عورتیں پانی کے سرچشمے تک پہنچنے کے لیے گھنٹوں کا سفر طے کرتی ہیں۔ پتہ نہیں بلوچوں کی توجہ اس مسئلے پر کیوں نہیں جاتی!۔

******

ہم دشت کو چیرتے ہوئے جنوب مغرب کی طرف جاتے ہیں اور ساتھ گرد و غبار کے زبردست بگولے پیدا کرتے جاتے ہیں۔ اگر تین چار گاڑیاں دشت میں جا رہی ہوں تو ان کے پیدا کردہ گرد و غبار سے ایسا لگے گا جیسے جنات کی بارات جا رہی ہو۔ گرد و غبار سے سوار خود بھی جن بن جاتا

ہے ۔ چنانچہ پک اپ کے بند دروازوں کے اندر بھی ہمارے کوٹ ، ہمارے سوٹ کیس ، ہمارے چہرے، ہمارے بال اکیسویں صدی کے بلوچ تخفے یعنی مٹی سے ایسے لیپ دیے گئے تھے کہ اگر ہمیں ہمارے اپنے بچے دیکھ لیتے تو وہ بھی چیخ مار کر بھاگ جاتے۔

جنوب مغرب کی طرف جاتے جاتے سڑک پھر، مغرب کو ہو جاتی ہے ۔قبلہ کی سمت ، ڈوبتے سورج کی طرف ۔اور ہمیں جنوب میں بائیں جانب سمندر نظر آیا۔دلکش ہے بلوچستان جس کا سورج نکلتا ہے حضرت سخی سرور کے پرنُور مزار سے، اور ڈوبتا ہے کرامت بھرے بحیرۂ بلوچ میں ۔ہم سمندر کے متوازی چلتے رہے، چلتے ہی رہے اور پھر پہلی بندرگاہ، پہلا بلوچستانی ساحلی شہر، ''سھر بندر'' نظر آیا۔ پورا شہر سمندر کے کنارے کنارے آباد ہے۔شہر کے ساتھ سمندر کے اندر ایک سکائی سکریپر پہاڑ ہے جس کی ساخت اتنی خوب صورت ہے کہ پریوں کا مسکن لگتا ہے ۔ایسا منظر، کہ ہمیں ہالی وڈ کے سارے فلم سازوں کی جغرافیہ سے لاعلمی پہ سخت تعجّب ہوا۔ بلوچ ساحل فطری حسن اور چھوٹی انسانی آبادیوں کا امتزاج ہے، جن کی بہت ہی ابتدائی اور فرسودہ معیشت ہے۔ پتہ نہیں ماڈرن عہد اس کا کیا حشر کردے۔

ساحلوں سے پرے پہاڑیاں اور پہاڑ، ساحلی پٹی کو باقی سرزمین سے ممتاز کیے دیتے ہیں۔کثیر الجہت ہے ساحل کی خوب صورتی اور مختلف النوع ہے یہاں کی جغرافیائی ساخت۔تقریباً یہیں سے پکی سڑک شروع ہوئی۔ یہ واحد 35 میل سڑک ہے پورے مکران ڈویژن میں ۔ وہ بھی مملکت خداداد نے نہیں، USAID نے بنوائی۔اور پھر سڑک کے ساتھ ساتھ لیویز، کوسٹ گارڈ وغیرہ کی چیک پوسٹوں سے ہوتے ہوئے کوہِ مہدی کے سلسلے کے ساتھ ساتھ چلتے رہے۔(اس کوہِ مہدی کا تربت والے کوہِ مراد سے کوئی تعلق نہیں)۔

اور جونہی مہدی نے اجازت دی ہم گوادر کی پھیلائی بانہوں میں تھے۔مٹی سے اَٹے ، جمپوں سے انجر پنجر شدہ اور جوڑ جوڑ میں درد۔ جو حکمران اپنے عوام کو اچھی سڑکیں نہیں دیتا، وہی سب سے زیادہ اسلام اسلام کے نعرے بلند کرتا ہے!!۔

8

گوادر کے مضافات میں دس پندرہ کلومیٹر، یک لخت جنوب میں چلتے رہنے کے بعد شہر شروع ہوا۔شہر کیا تھا، لمبی لمبی دیواروں کے غیر آباد احاطوں کا مجموعہ تھا۔ یہ قبضہ کے احاطے تھے۔ چیک پوسٹوں کے قبضہ کردہ احاطے، دینی مدرسوں کے قبضہ کردہ احاطے، مسجدوں کے احاطے، سیاسی لیڈروں اور زور آوروں کی طرف سے قبضہ کی ہوئی چار دیواریوں کے احاطے..... گوادر، قبضہ شدہ شہر ہے۔

شہر کی وسعتوں میں ماہی گیروں کے لیے کوئی جگہ نہیں۔امیروں، حاکموں، غنڈوں، اور لینڈ مافیا نے مل کر پورا علاقہ قبضہ کرلیا ہے اور بڑے بڑے قطعات پہ چار دیواریاں بنوا کر اپنی ملکیت کی مہر لگا رکھی ہے۔ قبضہ گروں کے احاطوں کی دیواروں پر فرقہ وارانہ نعرے، دھمکیوں، زندہ بادوں مردہ بادوں کے نعرے کندہ تھے۔انہی نعرہ بردار چار دیواروں کے درمیان چلتے چلتے ہماری پک اپ، کمیونی کیشن ڈیپارٹمنٹ کے اُس ریسٹ ہاؤس میں پہنچی، جو ڈی سی نے ہمارے لیے بک کرائی تھی۔

اُس زمانے میں گوادر میں کل آٹھ ریسٹ ہاؤس تھے۔ پرانا گورنر ہاؤس بھی ہے۔ جسے وی آئی پی ریسٹ ہاؤس کے بطور استعمال کیا جاتا ہے۔ڈی سی کا بک کردہ ریسٹ ہاؤس زبردست تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کسی بھی ڈاگ بنگلے (ریسٹ ہاؤس) سے بہتر۔دومنزلہ طویل عمارت، وسیع کشادہ کمرے، نوآبادیاتی افسروں کے شایان شان پردے، بیش بہا فرنیچر، خدام و غلام، غلام گردشیں، پھول و چمنستان اور عین پاؤں کے نیچے سمندر..... یہ عمارت بلوچ لوک کہانیوں کے شہزادوں کے محل کے تصور سے بھی بہت زیادہ شان دار عمارت تھی۔مگر چاند پہ بھی تو ایک داغ ہوتا ہے، سو اس ریسٹ ہاؤس میں بھی ایک داغ تھا: یہاں باورچی خانہ نہ تھا۔اور ہمیں اطلاع دی گئی کہ کھانا کھانے آپ کو ''قریبی'' بخشی ہوٹل جانا پڑے گا۔

حالاں کہ یہاں سے بخشی ہوٹل اچھا خاصا دور تھا۔اتنا کہ پیدل جاتے تو سیدزادے (امیر الدین) کی رانوں کے پٹھے چڑھ جاتے اور جسم کے درد کو دور کرانے (ٹانگیں دبانے) ہم کوئٹہ سے ان کے جواں عمر ملازم کو بھلا کیسے منگواپاتے۔

9

گوادر میں پہلا دن

ضلع گوادر، ضلع کیچ کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کی پوری جنوبی سمت، بحیرہ بلوچ پر مشتمل ہے۔ اس ضلعے کا ساحل چھ سو کلومیٹر طویل ہے۔ گوادر کے مغرب میں بلوچستان کا وہ حصہ ہے جو ایران کے قرعہ میں گیا ہوا ہے۔ انگریز تیری تو قرعہ اندازی مردہ باد ہو! اچھے بھلے وطن کو تقسیم کر ڈالا۔ اور صدیوں تک باہم الگ کر ڈالا۔

گوادر ضلع کے مشرق میں آواران اور لسبیلہ اضلاع ہیں۔ اس ضلع کا کل رقبہ ایک لاکھ اسی ہزار کلومیٹر ہے۔ دو لاکھ افراد پر مشتمل اس ضلع میں بڑے بڑے قصبہ جات گوادر، پسنی اور ماڑہ اور جیوانی ہیں (اور ہر ایک مالا مال ہے تاریخی، ادبی اور حربی ورثے سے)۔ گوادر، کراچی سے 650 کلو میٹر کے فاصلے پر ہے۔ لسبیلہ کی طرح گوادر میں بھی عام طور پر زندگی وہیں پائی جاتی ہے، جہاں پہاڑی نالے یا دریا سمندر میں مل جاتے ہیں۔ اہم نالے دشت (جس کے دہانے پر جیوانی ہے) اور شادی ہے، جہاں پسنی واقع ہے۔

ہم ساحلِ گوادر کے حسن میں گم سم کھڑے تھے کہ ہمیں علی بلوچ نامی ایک شخص کی خوب صورت انگلش میں لکھی چٹ ملی۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ یہ چٹ علی بلوچ کے ہاتھ کی لکھی نہیں ہے اور یہ انگلش اس نے کسی اور سے لکھوائی تھی)۔ علی بلوچ گوادر میں ایک معزز شخص ہے، سیاسی سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے اور گوادر میں ہمارا میزبان ہے۔ اس کی لکھوائی ہوئی چٹ کا

مفہوم یوں تھا؛ ''ہم نے بخشی ہوٹل میں بندوبست کر رکھا ہے، وہیں جانا ہے''۔ سو ہم پھر اپنی ڈبل ڈور پک اپ میں بیٹھے اور بخشی ہوٹل چلے گئے۔ جس کے گیٹ پر بخشی ہوٹل کے بجائے ''گوادر ٹورسٹ موٹل'' لکھا ہوا تھا۔ خوب صورت سمندر کے عین کنارے پر بنا ہوا یہ ہوٹل سرکار سے بخشی بلوچ نے لیز پر لے رکھا تھا۔

اندر گئے تو یہ ہوٹل کے بجائے ایک میوزیم لگ رہا تھا۔ ہوٹل کے سامنے والے احاطے میں گنز کے مقام سے ٹرکوں پر لاد کر لائی گئی ویل مچھلی کا ایک جبڑا رکھا ہوا تھا، 22 فٹ لمبا..... جی ہاں اس کا جبڑا 22 فٹ یعنی سات گز لمبا تھا۔ پتھروں پر اس کی ہڈی بطور آرائش رکھی ہوئی تھی اور ریڑھ کی ہڈی کے پروئے ہوئے کچھ مہرے نمائش کے لیے موجود تھے۔ جب کہ مچھلی کی اپنی لمبائی 72 فٹ یعنی 24 گز تھی۔ اب اگر یہی مچھلی بلوچستان میں کسی خشکی کے علاقے میں ہوتی تو لوگ اس کو دیوتا جان کر اس کی پرستش کرنے لگتے۔ واضح رہے کہ لورالائی اور زیارت کے مقام پر نوگزا بابا کے نام سے موجود مزاروں پر لوگ منتیں مانگتے ہیں، نذرانے دیتے ہیں اور مرادیں پاتے ہیں۔ ہمیں ایک اور ''24 گز ابابا'' مل جاتا۔

موٹل کے احاطے کے شمالی گیٹ کے اندر داخل ہوں تو وہاں چبوترے جیسا ایک اونچا پلیٹ فارم بنا ہوا ہے، جہاں سیڑھیاں چڑھ کر جایا جاتا ہے۔ اس اونچے پلیٹ فارم کے فرش پر دری بچھی ہوئی تھی۔ کرسیاں لگا کر ہمیں وہاں بٹھا دیا گیا۔ دور دور تک سمندر کا منظر تھا۔ محض ہم سے دس بارہ گز کا فاصلہ۔ سمندر کا نظارہ، غروبِ آفتاب کا منظر..... جہاں دن بھر گناہوں، مظالم، لوٹ مار اور استحصال کا نظارہ کرتے کرتے تھکا ہارا گناہ گار سورج، پاپ دھونے بلوچ سمندر کے پانیوں میں چوروں کی طرح منہ چھپا رہا تھا، رات بھر کے لیے۔ جیسے سارے جرائم انسان نے نہیں اس بے بس بے چارے سورج سے سرزد ہوئے ہوں..... ہم پہ سمندر نے جادو کر دیا تھا۔ گوادر کے پشتی زر (پچھلا سمندر) کا یہ منظر لفظ ''خوب صورت'' کے جامے میں نہیں سما سکتا، خود جا کر دیکھنے کا تقاضا کرتا ہے۔ شالا ہر انسان کو یہ حسین منظر دیکھنا نصیب ہو۔

ہم انہی نظاروں میں غرق تھے کہ آٹھ رکنی لشکر کے ساتھ ایک شخص آن دھمکا۔قمیص کے سارے بٹن کھلے ہوئے، چھوٹا قد، گنجا سر، نیم مکرانی رنگت والا.....یہی تھا علی بلوچ، ہمارا میزبان اور گوادر میں انسانی حقوق کا بڑا۔کردار و کرتوت تو ہمیں بعد میں بھگتنے تھے مگر گفتار کی رفتار و مقدار میں اس کا ثانی پورے مکران میں نہ ہوگا۔اتنا بولتا ہے، اتنا بولتا ہے کہ شیام کمار بھی پناہ مانگے۔علی اردو بولتا ہے تو ساحلی انداز میں اس کے مذکر مؤنث کا جنازہ نکال دیتا ہے، بلوچی بولتا ہے تو اس میں قلندر کے دربار کے فقیر کے چوغے کی طرح جگہ جگہ اُردو الفاظ کے پیوند لگا تا جاتا ہے۔یہ ہنس مکھ شخص گوادر کا بہت ہی خوب صورت دل و دماغ والا انسان تھا۔ایسا بے پرواہ درویش منش شخص، اور، اس قدر وابستہ ہوا انسانی بہبود و بہتری کے کاموں میں!!۔اُس کی دوستی پہ مجھے فخر ہے!اس کی دوستی پر میرے مرحوم دوست امیر الدین کو فخر تھا۔

بخشی صاحب نے ہم سب حاضرین کے لیے چائے بھجوادی اور ساتھ مچھلی کا کباب بھی۔ یہ ڈش میرے لیے بالکل نئی تھی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار مچھلی کا کباب کھایا۔ بلوچستان کے کوہستانی قبائلی علاقوں میں مچھلی کو بطور خوراک کچھ زیادہ توقیر حاصل نہیں ہے۔ پہاڑ کے کسی مری کو پتہ نہیں کہ مچھلی کے کباب جیسا ''مزیدار'' پکوان بھی بنتا ہے دنیا میں۔(بلوچ قوم کو باہم پیوست کرنے کے لیے کتنی بڑی اور ارتکاز یافتہ منڈی کی ضرورت ہے!!! مگر منڈی بننے لگتی ہے تو اسی وقت سارے بورژوا دانش وروں کو بلوچ ثقافت خطرے میں نظر آتی ہے اور اسے بچانے اور سابقہ حالت برقرار رکھنے کی مضمون بازی شروع ہوجاتی ہے!!! منڈی حیران، کہ منجی کتھے ڈھاوے!!)۔

بخشی ہوٹل کی دیوار پر لکڑی کے پالش شدہ بڑے بڑے دانوں سے بنی ایک بہت ہی بڑی تسبیح لٹک رہی تھی۔ہم دم بخود رہ گئے یا اللہ، ہم پھر ملا کے حوالے ہوگئے؟۔اتنی بڑی تسبیح ملا اسامہ کے پاس بھی نہ تھی۔مگر پھر بتایا گیا کہ یہ تو بخشی کی جمالیات کا کارنامہ ہے۔آرٹسٹ ذہن کا مالک بخشی اُسے کراچی سے خرید لایا ہے اور اس نے اسے ہوٹل کی خوب صورتی کے لیے دیوار پہ سجا رکھا ہے۔(تسبیح اور خوبصورتی!!)۔ہمیں یاد ہے کہ ملّا بے نظیر بھٹو نے تسبیح کا ایسا رواج ڈال دیا تھا کہ پورا ملک قندھار

10

بن گیا تھا۔ چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے، بزرگ و جوان، مرد و زن۔تسبیحات ہی تسبیحات۔محترمہ نے ہمارے ساتھ اور بھی بہت کچھ کرنا تھا مگر اللہ نے ان کی بادشاہی کے شر سے اُمت کو وقت پر نجات دلوائی۔اور وہ اپنے ہی لیغاری کی شورشوں سازشوں سے دبئی چلی گئی۔مگر ملائیت کی صورتیں تبدیل ہوتی گئیں، پہلے لغاری اور پھر مسلم لیگ، پھر مسلم اور اب اصلی ملائیت، مارشل لا جو اِن سب ظاہری صورتوں کا حامی و ناصر ہے، ہمیشہ سے.....

یہ ہوٹل ٹورازم کے لیے بہت پرکشش ہے۔اس میں ایک طرف بلوچ طرز کا جھونپڑا بنا ہوا ہے۔جس کے وسط میں گندم پیسنے والی ہاتھ کی چکی (جنتر) رکھی ہے، جس کا دستک اپنی اصل جگہ کی بجائے ''گر'' میں گڑا ہوا ہے۔قریب ہی ایک دیوار کے ساتھ بخشی کا ہٹا کٹا پالتو بندر بندھا ہے جو وقفے وقفے سے اپنی جوئیں پکڑ پکڑ کر کھانے کے کریہہ عمل میں مصروف ہے۔''جوں خور ہنومان''!۔اگر مارکس، پوتر ہنومان جی کا یہ عمل دیکھتا تو نہ جانے انسان کو حقیر جانوروں (سانپ، گائے، بندر) کے سامنے سربسجود کرنے والے ہندوستان کے بارے میں مزید کیا کچھ لکھتا۔

بخشی خود درمیانے قد کا گورا چٹا ہنس مکھ انسان ہے۔ہلکی مڑی ہوئی مونچھیں، نرم گفتار، مخاطب کی توقیر کو فلک تک بلند کرتا ہوا شریف آدمی ہے۔وہ بی این ایم کی سنٹرل کمیٹی بھگت چکا ہے، بلدیاتی ممبری کر چکا ہے اور اب بھی بی این ایم (حال میں نیشنل پارٹی) سے وابستہ ہے۔اتنے اچھے انسان کو اللہ ایک اچھی سیاسی پارٹی عطا کر کے اچھے راستے پر لگا دے۔(کچھ سال بعد وہ خوب صورت انسان فوت ہوا)۔

دن بھر ایک غیر مہمان نواز صحرا، ناترس ریت و مٹی اور بل کھاتی، آنتیں نکالتی شاہراہ کے سفر میں ''دشت زدہ'' مسافر تھکے ماندے تھے۔ہوٹل انڈسٹری کے ماہر بخشی نے نہانے کے لیے پانی گرم کروایا اور غسل خانوں میں بالٹی رکھوادی۔ہمیں ''صاحب پانی تیار ہے'' والی لاٹ صاحبی، یا پھر موجودہ سوئی گیس کمپنی کے پنجابی، ہندوستانی افسروں جیسی اطلاع دی گئی۔گوادر میں سرکار، شام کو پانچ گھنٹے کی بجلی دیتی ہے ایک جنریٹر سے۔تین دن تک اسی حساب سے بجلی ملتی ہے۔اور چوتھے دن اس

علاقے کا ناغہ ہوتا ہے۔اور آج اسی ناغے کا دن تھا۔مگر بخشی، سرکار پر بھلا کب تکیہ کرتا تھا۔اس نے ہوٹل کے لیے ایک ذاتی جنریٹر خرید رکھا تھا۔ چنانچہ بخشی کا اپنا جنریٹر مدھم روشنی دینے کے لیے موجود تھا۔اچھے کشادہ باتھ رومز میں اچھی خاصی روشنی۔عین جب نہانے کے لیے ہم بیلٹ ''باندھ'' چکے اور پھر دو تین مگ سر پر ڈال دیے تو اہلِ گوادر کو بند کواڑوں کے پیچھے بھی ہمارا بے حجاب نہانا گوارا نہ ہوا۔ بخشی کے ہوٹل والا جنریٹر خراب ہو گیا۔ہم نے اندھیرے میں 'غسلِ تھکاوٹ' فرمایا۔میں یقین سے کہتا ہوں کہ بلوچ نے بہت لازم حالتوں میں بھی اندھیرے میں غسل نہ کیا ہوگا۔گوادر میں پہلا ''لوڈشیڈنگ باتھ''.....بلوچستان بہت سے انہونے کام کرواڈالتا ہے۔

جب باہر نکلے تو ہوٹل کا مالک، کمرے میں دبئی سے سمگل کی ہوئی ٹارچ روشن کرواچکا تھا۔ یہ Nova کمپنی کی خوب صورت ٹارچ تھی۔ یہ ٹارچ تو بہت ہی خوب صورت تھی۔اس میں ٹیوب لائٹ بھی ہے، ٹارچ بھی، سگنل والی لائٹ بھی، پنکھا بھی اور پھر ساتھ میں تین بینڈ کا ریڈیو بھی (واہ ڑے سرکار، تئی کمال!!)۔خوب صورت چھوٹے سے ڈبے میں یہ سارے عجائبات شامل ہیں۔گوادر، گوادر ہے۔

دن بھر کچی سڑک کے بڑے بڑے کھڈوں میں لگے جمپوں سے ہم پک اپ کی چھت اور سیٹ کے درمیان پنگ پانک کا بال بنے رہے تھے، اب رات ہوئی تو ہم تھکے ہارے مسافروں نے سر رکھا اور سو گئے۔رات کو ڈاکٹر امیر الدین بڑی ''نیند مار'' قسم کے خراٹے مارتا ہے۔رابرٹ اِنگرسول کی مریدی کے بلند بانگ دعوے کرنے والا امیر الدین بلا مبالغہ ہر رات کو دو تین بار بہ آواز بلند ''اللّٰہ'' بھی کہتا ہے اور ہر صبح اٹھ کر یہ کہہ کر میرا مذاق اڑاتا ہے کہ میں نان بلیور کیوں نہیں ہوں۔ ہر صبح ضرور پوچھتا ہے، ''میں خراٹے تو نہیں لیتا؟'' اور جب میں اُسے کہتا کہ تم اپنے زوردار خراٹوں کے ساتھ تین چار بار اللّٰہ کا نام بھی لیتے رہے۔دن کو مانتے نہیں ہو اور رات کو پکار پکار کر یاد کرتے ہو۔وہ یک دم کہتا، ''جاؤ، بکواس نہیں کرو''۔

بہر حال ہم بہت اچھی نیند سوئے۔صبح سویرے ملا نے بانگ دی تو میں جاگ گیا۔ساتھ

والے بستر پر امیر الدین نے بڑا مہیب خراٹا بھرا (گویا ملّا کا ساتھ دیا، یا پھر اسے بڑی سے گالی دی!)۔البتہ ملّا اپنی دُھن میں مگن ترنم میں بانگ دیے جاتا تھا۔ایک ملّا، پھر دو، پھر تین۔پھر پورا شہر بانگستان بن گیا۔ مجھے گوادر بھر کی بانگ میں اپنے گاؤں ماوند کے مؤذن ''اومری'' جیسی اپنائیت اور مقامیت نظر نہ آئی۔اُن کے لہجوں اور لَے میں ''عربیت'' تھی، مجھے کوئی بھی بلوچ نہ لگا۔مگر اسی وقت ایک بانگو (مرغا) نے بانگ دی تو میرا دل مچل کے رہ گیا۔جیسے بلوچستان بول رہا ہو، جیسے ماوند بول رہا ہو، ہمارا اپنا، لوکل سرٹیفکیٹ لیا ہوا بلوچ مرغا بول رہا تھا۔تھوڑی دیر میں تو جیسے مرغوں نے مقابلہ شروع کر دیا ہو: مقابلہِ بانگ!۔موٹی آواز میں، پتلی آواز میں، تحکم والی آواز میں، مفلسی کی نقاہت میں، نوجوان کی سی بے صبری کی بانگ، بوڑھے کی ٹھہری ٹھہری بانگ، جلد جلد سانس چڑھنے والی بانگ اور کسی مرغی کو پیغام دینے والے کو ڈ ڈ الفاظ والی بانگ۔ایک ''چریا'' مرغا تو دن کے دس بجے تک بانگیں دیے جا رہا تھا۔

اِسے روکو، گوادر والو! ورنہ تمہارا حشر بھی بامیان جیسا ہوگا۔

12

سمندر، باکرامت

صبح سویرے اٹھ کر کوہِ باتیل کی دیوار کے اِس پار مصنوعی جھیل جیسے خاموش اور صاف ستھرے نیلگوں سمندر کی دید کا لطف لینے ساحل پہ پہنچا۔ بہت ہی سویرے ہے۔ عظیم الشان گہرا نیلا سمندر اپنے عظیم سکوت میں تھا۔ ملائم پانی کی نازک لہریں ہیں۔ پوری دھرتی انبساط کے ہنڈولوں میں جھول رہی ہے۔ ایک عجیب جادوئی فضا ہے۔ ہم مشرقی بلوچستان کے لوگوں نے کبھی اتنی بڑی جھیل سوچی بھی نہ ہوگی۔ ہم اس منظر کے دیکھنے سے بھی ناواقف ہیں۔ ہم اس منظر کی تحریری منظرکشی سے بھی قاصر ہیں۔ مکمّل کھو جانا، مبہوت رہ جانا............ہم پہ جادو ہو چکا تھا۔ ہم بھونچکے تھے، گم سم، جیسے اسی سمندر جتنی شراب پیئے ہوئے ہوں۔ اتنا حسن ہے بلوچستان میں، اتنی نعمتیں ہیں میرے وطن میں......(اور کتنی بھوک ہے میرے دیس میں!)۔

اگر بلوچوں کو اپنی اولاد کو حب الوطنی سکھانی ہو، بلوچستان پہ فخر کروانا ہو، تو انہیں بلوچستان کے ساحل ضرور دکھائیں، عشق ہو جائے گا انہیں اُس سے، مر مٹیں گے اُس کی خاطر، سارا بلوچستان ہمّل بن جائے گا۔

میں ساحل سے ٹکرانے والی نرم نرم موجوں سے بچوں کی طرح کھیلتا ہوں، ایک ایک قطرہ میرا ہے، ایک ایک ذرہ میرا ہے۔ میں، بلوچ تو دھرتی پہ برگزیدہ مخلوق ہوں۔ کیا کیا نعمتیں ہیں جو مجھے نہ دی گئیں۔ میں سمندر سے کھیلتا جاتا ہوں اور آواز بلند سے رننگ کمنٹری بھی کرتا جاتا ہوں۔ وہ دیکھو

لہر آرہی ہے، شوں شوں کرتی ہوئی، میرے بوٹوں کو بھگونا چاہتی ہے، کافر۔ میں اسے ایسا کرنے نہیں دوں گا۔ میں بلوچ سمندر کی لہر سے بات کرتا ہوں......''بیابیا، نہ واڑ تئے صذ کہ''۔ جب بوٹ کو موج کے ہاتھوں گیلا ہونے سے کامیابی کے ساتھ بچا دیتا ہوں تو اسے ایک گالی نکالتا ہوں............پھر فوراً نعوذ باللہ پڑھتا ہوں، سمندر کو گالی دی بدتمیز؟۔ اس سے معافی مانگتا ہوں۔ مگر بڑی شان والا سمندر میرے مکمّل بچے میں ڈھل جانے کی کیفیت سے بے نیاز، کانوں اور آنکھوں کو ٹھنڈا کیے جاتا ہے............سکون آور سمندر۔ دیوتا سمندر۔

اِس ''پدی زر'' میں ترقی و ترتیب کے زبردست امکانات ہیں۔ یہاں ہوٹلوں کے امکانات ہیں، ساحلی سیر سپاٹے کے، کھیل کے میدانوں کے، پارکوں کے، دست کاریوں کی نمائش گاہوں کے، دکانوں کے، میوزیم اور سمندری حیات سے متعلّق علم گاہ کے، پانی کے کھیلوں کے، بوٹنگ کلبوں کے۔ اللہ وہ مہربان گھڑی ضرور لائے گا۔

یہ صبحِ کاذب کے دم توڑتے لمحے ہیں۔ بلوچ مشقّت کے لیے نکل پڑے ہیں۔ کُل گیارہ کشتیاں شہ مرید کی کمان کی شکل والے ساحل سے ماہی گیری کے لیے روانہ ہو چکی ہیں۔ اتنا بڑا سمندر اور اِدھر اُدھر بکھری صرف گیارہ کشتیاں۔ کچھ بے کشتیوں والے بے چارے یا، بزرگ سن، اور، یا پھر، کم سن مچھیرے ساحل کے قریب ہی پانی میں رات کو اپنا جال بچھاتے ہیں اور گھر چلے جاتے ہیں۔ صبح سویرے آ کر پانی میں ساحل سے بیس پچیس فٹ اندر بچھائے ہوئے اپنے جال کو جا کر آہستہ کھینچتے ہیں اور اس میں پھنسی مچھلیوں کو نکال لیتے ہیں۔ میں ایسے ہی ایک ماہی گیر بچہ پارٹی کے گروہ میں چلا جاتا ہوں۔ یہ پانچ لڑکے ہیں۔ سب سے بڑا ماہی گیر دس برس کا ہے۔ وہ جانداروں کے ہرغول میں موجود ''وڈے وڈیرے'' شخص کی طرح لگتا ہے۔ تجربہ کار، تحکم والا لہجہ، ٹھہراؤ والا انداز۔ شکاریوں میں سب سے چھوٹا سردی میں کانپتا ہوا سات سال کی عمر کا بچہ ہے۔

انہوں نے کل 17 لُجر (چھوٹی چار انچ لمبی مچھلیاں) پکڑی ہیں۔ وہ گوادر کی گلیوں میں جا کر اپنا شکار بیچیں گے۔ تازہ تازہ مچھلی کے بلوچی نعم البدل والی آوازیں لگاتے ہوئے گلیوں محلوں

میں پھیرے لگاتے ہیں۔ان کو ایک روپیہ فی لُجر مل جاتا ہے۔(جنہیں سکول جانا چاہیے،سائنس دان وانجینئر وڈاکٹر وسٹیٹس مین بننا چاہیے انہیں لُجر گیری پر لگا دیا گیا ہے۔بلوچستان کا اقتدار فیوڈلوں کے حوالے اور بلوچستان کے بیٹے لُجروں کے حوالے)۔

لُجر، پام فریٹ اور کبھی کبھی سولم نامی مچھلی بھی ملتی ہے۔عموماً دو تین سیر وزن والی ملتی ہے مگر کبھی کبھی دس دس سیر والی مچھلی بھی جال میں اپنا قدم رنجہ فرما کر نوجوان شکاریوں کی شکاری مہمات کی کہانیوں کے لیے موضوع عطا کرتی ہے۔

یہ ''پشتی زِر'' کم گہرا ہے۔آپ پانی میں 100 گز تک اندر جائیں بہ مشکل گردن گردن تک پانی ہوگا۔ماہی گیر یہاں رات بھر کے لیے جال بچھا کر چلے جاتے ہیں اور صبح سویرے اپنے شکار کی مچھلی چن لیتے ہیں۔مگر کبھی کبھی اگر ہوا چلے تو آپ کا جال دو تین کلومیٹر کے فاصلے پر دور بے عزت و بے ترتیب پڑا ہوگا۔

سورج نکلا تو سست، کاہل یا پھر لاٹ صاحبوں والی طبیعت کے لوگ بھی ماہی گیری کرنے نکلے۔اب کل اٹھارہ کشتیاں ہوگئیں۔ذرا طلوعِ آفتاب کو تو دیکھو۔سردیوں کا بے بس، ٹی بی زدہ، مریل سورج ہے۔بس ایک چمکتا ہوا فٹ بال، یا کانسی کا بنا ہوا تھال جس میں ہماری عورتیں آٹا گوندھتی ہوں۔بے کمال بے کرامت، منہ تک نہ دھویا ہوا سورج:

؎ جیسے مفلس کی جوانی، جیسے بیوہ کا شباب

سردیوں کا اس قدر بے دم سورج، گرمیوں میں قہر وغضب کا نشاں بن جاتا ہے۔ہمیں ڈاکٹر حاجی اکبر کی سنائی ہوئی مزے دار بات یاد آئی کہ سرد افغانستان کے علاقہ غزنی کا ایک باشندہ ملتان چلا گیا اور وہ بھی جون جولائی میں۔دوپہر کو سورج گرم ہوا تو غزنوی ماما تلملا اٹھا۔برف، پنکھا، غسل.....گرمی نے اَدھ موا کر کے رکھ دیا۔اس نے بے بسی، بے کسی میں سورج کی طرف دیکھا اور کہا، ''کرو مستیاں، یہ نہ سمجھو میں تمہیں جانتا نہیں۔تمہاری غیرت تو میں نے سردیوں میں غزنی میں دیکھ رکھی ہے''۔

میں نے شکاریوں کی ایک اور ''چھوٹو'' پارٹی دیکھی اور وہاں چلا گیا۔منیر احمد نامی سربراہ بچے نے 16,15 چھوٹی چھوٹی مچھلیاں پکڑی تھیں۔ان میں سے دو مچھلیاں دُم کی طرف سے آدھی کٹی ہوئی تھیں۔میں نے سبب پوچھا تو اس نے کہا کہ جال میں ان مچھلیوں کے ساتھ ایک تغس (کیکڑا) بھی پھنس گیا تھا۔اس نے خود اپنی موت کے اس جال کے اندر بھی بڑی بے رحمی سے دو مچھلیوں کو آدھے تک کھا ڈالا (سامان سو برس کا، پل کی خبر نہیں)۔Titanic جہاز جب ڈوب رہا تھا تو بھی اس کے فرسٹ کلاس میں بیٹھے سرمایہ دار مسافر ایک دوسرے کو رشوتیں دے رہے تھے۔تغس ازم مردہ باد!! (تغس بدتمیز کا نام مشرقی بلوچی میں ایسا ہے کہ اگر اردو ترجمہ کروں تو ہمایوں مری اسے عریانی قرار دے گا۔اس لیے بس تغس، تغس ہی ہے۔)

یہ ''پدی زر'' ایک دلچسپ حرکت کرتا ہے۔یہ سمندر رات کو پانی سے مکمّل بھر جاتا ہے پھر یہ موج آہستہ آہستہ کم ہوتی جاتی ہے، پانی سرکتا جاتا ہے پیچھے۔طلوع ہوتے سورج کے استقبال میں 50 گز، 100 گز حتیٰ کہ 150 گز تک بھی پیچھے ہٹ جاتا ہے۔پھر دن کے زوال کے ساتھ ساتھ یعنی ایک بجے دوپہر سے پھر آہستہ آہستہ بھرنا شروع کر دیتا ہے اور آدھی رات تک مکمّل بھر جاتا ہے۔شکر ہے کہ یہ پشتی زر جاپان میں واقع نہیں ہے اور یہ بھی شکر ہے کہ بلوچ سورج پرست نہیں ہیں، چڑھتے سورج کے پجاری نہیں ہیں۔

ہم مکمّل طور پر مبہوت روئی جیسی نرم و ملائم باریک ریت پر خراماں خراماں اِدھر اُدھر چہل قدمی کر رہے تھے۔دفعتاً جب اپنے پیروں کی طرف غور سے دیکھا تو ہمیں ایک زندہ، حرکت کرتی ہوئی مخلوق نظر آئی۔ہم جنہیں چونٹیوں تک کو پاؤں سے نہ کچلنے کا سبق ملا ہوا تھا، حیران تھے کہ اس مخلوق کو روندنے سے بچائیں کیسے۔یہ زندہ سیپیاں تھیں۔اس بچے نے بتایا کہ سیپی دراصل ایک چھوٹا سا جانور ہوتا ہے، جیلی جیسا اور اس پر ایک سخت شیل ہوتا ہے۔جب لہریں اسے ساحل پر دے مارتی ہیں تو جیلی جیسا جانور پانی کے بغیر فوت ہو جاتا ہے اور شیل بچ جاتے ہیں۔جسے ہم سیپی بنا کر سجاوٹ اور زیور کے بطور استعمال کرتے ہیں۔خصوصاً ہم مری، بگٹی، بزدار، قیصرانی لوگ۔ہمارے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ

بڑی مچھلیوں کے کان وغیرہ ہوتے ہیں۔

یوں ہم کائنات کے حسن کا ایک حقیر حصہ اپنے معمولی ذہن میں جذب کر کے، خوب کیمرہ بازی کر کے چالیس پچاس قدم کے فاصلے پر موجود اپنے ٹھکانے یعنی بخشی ہوٹل واپس پہنچے۔ جہاں بل نگور کا رہنے والا بہت ہی دوستانہ بیرا، سلیم ہم مسافروں کے لیے چائے لایا۔ اور جب ناشتے کی باری آئی تو وہ اس میں ایک دانہ مچھلی فرائی کر کے لے آیا۔ اس مچھلی کا نام پمفلٹ تھا (یہ غلط العام نام ہے۔ اس کا اصلی نام پام فریٹ Pomfrets ہے)۔ ہمارا خیال تھا کہ پام فریٹ کا سائز وہی ہوگا جو کوئٹہ میں میں ملتا ہے اور جس کو میرے بڑے بھائی میر وخان بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ مگر یہاں گوادر کا پام فریٹ تو ''کنگ سائز'' کا تھا۔ اسے دو آدمی کہاں کھا سکتے تھے؟، ویسے بھی ناشتے میں مچھلی..... بہت ہی غیر بلوچ تصور ہے (حالاں کہ بلوچستان صرف مشرق نہیں ہے!)۔

ماہی خوری کی بھی حد ہوتی ہے۔ میں نے احتجاج کیا اور علی بلوچ و عابد بلوچ و حمید بلوچ کو بھی دعوت دی کہ وہ اس بیل جتنی پام فریٹ کو نوچنے میں ہماری مدد کریں۔ علی نے اپنے روایتی انداز میں سارے میزبانوں کی جانب سے ساتھ دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا، ''صاحب! یہ کہاں سے بڑی ہے۔ یہ تو سمال ہے، بلکہ ایکسٹرا سمال ہے۔'' واہ ڑے علی واہ۔ اور پھر واہ ڑے امیر الدین واہ۔ اس نے پہلے ایک طرف کا صفایا کر دیا۔ پھر پلٹا کر دوسری جانب کو ختم کر دیا۔ درمیان میں وہ میری کم خوری، مچھلی سے میرا تعصّب اور اپنی رغبت کے تبصرے ٹھونکتا گیا۔

''ناشتہ'' سے فارغ ہو کر ہم نے ایک چھوٹا ٹیپ ریکارڈر خریدنا چاہا۔ لوگوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ اومان کے بلوچ فوجی، جب چھٹیوں پر بلوچستان آتے ہیں تو واپسی پر اُن کا سارا سرمایہ خرچ ہو چکا ہوتا ہے اور پھر وہ اپنا کیمرہ، ٹیپ ریکارڈر وغیرہ اونے پونے بیچ کر چلے جاتے ہیں۔ ہم ایسے ہی کسی اونے پونے ٹیپ ریکارڈر کی تلاش میں نکلے تا کہ اپنے ریسرچ کے کام میں اسے استعمال کیا جائے۔

گوادر بازار میں جو سب سے دلچسپ چیز لگی، وہ یہ تھی کہ وہاں ایک پورا بازار ہے جو صرف

اور صرف عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ گاہک بھی عورتیں، دکان دار بھی عورتیں (دکان دار کی مؤنث اردو میں ہے ہی نہیں۔ نہ ہی گاہک کی مؤنث موجود ہے۔ مقتدرہ زبان!!)

گوادر شہر کی دیواروں پہ دلچسپ نعرے لکھے ہیں۔ ایک سے ایک نعرہ ادب کا شاہ کار ہے۔ یہ نعرے سیاسی بھی ہیں، مذہبی بھی اور کمرشل اداروں کے بھی، مگر ہمیں سب سے زیادہ محظوظ اپنے ہی HRCP والے دوستوں کے اس نعرہ نے کیا؛

''We Want Bottom Rights''

(ہم بنیادی حقوق مانگتے ہیں!)

زبانیں اپنی باریکیوں میں کیا کیا مار، مارتی ہیں!

15

یونانی و پرتگالی سام راج

شام کو ہمارا پروگرام کوہِ باتیل کی سیر کا تھا۔ چنانچہ ہم استاد حمید کی گاڑی میں بیٹھ کر کوہِ باتیل دیکھنے چلے گئے۔ استاد حمید گوادر کا زبردست آدمی ہے۔ وہ میرے معزز دوست، علی بلوچ کا دستِ راست اور متحرک ترین معتمد ہے۔ علی کی رہنمائی میں انسانی حقوق کی جدوجہد میں جُتا ہوا ہے۔ بہت ہی دل نواز شخص ہے۔ وہ گاڑیاں مرمت کرتا ہے۔ اس کے گیراج میں طرح طرح کی گاڑیاں مرمت کے لیے آتی ہیں۔ لہٰذا گوادر کی سیر ہم ''برائے مرمت گاڑیوں'' میں کرتے رہے۔ مختلف سائز کی گاڑیاں، مختلف میڈ کی گاڑیاں، مختلف برانڈ کی گاڑیاں، بلوچ کی شان دار مہمان نوازی۔ حمید خود بھی دلچسپ آدمی ہے۔ یار باش، بے پرواہ، سینہ کشادہ ہے، (جسمانی طور پر بھی اور محاورتاً بھی)۔

ہم بتا چکے ہیں کہ وہ لوگ پان کے علاوہ سب کچھ طہارت والی کھاتے اور ''پیتے'' ہیں۔ اگر علی بلوچ معلوماتی فلسفیانہ باتیں کرتا ہے تو حمید بالکل عام بات کرتا ہے، لوگوں کی، عام آدمی کی بات۔ گپ شپ میں مزہ آتا ہے۔ ہر مکینک کی طرح حمید بھی کام کے وقت میلا کچیلا یونیفارم پہنتا ہے۔ کام کے دوران وہ محنت کی خوب صورتی کا شاہ کار بن جاتا ہے۔ ہاتھ، منہ، کپڑے سب موبل آئل زدہ، کالے۔ آستینیں چڑھی ہوئیں۔ مصروف، محنتی اور مکمّل اشرف المخلوقات.....وہی حمید جب فارغ ہوتا ہے کہ تو شیو کر کے، غسل کر کے صاف کپڑے پہن کر کنگھی شدہ سر کے ساتھ باہر نکلتا ہے تو ہندوستانی پرانی فلموں کا ہیرو لگتا ہے۔ صرف ایک بدصورتی ہے اس میں: پان بہت کھاتا ہے۔

منہ ہمیشہ سرخ لعاب سے بھرا ہوتا ہے۔ بات کے ساتھ سرخ رنگ کی بارش کی پھوار برستی ہے۔ پان خوروں ہی کی طرح ہونٹوں سے چاروں جانب تر بیلا بند باندھے گفتگو کرتا ہے.....حمید زندہ باد، اس کی گاڑیاں زندہ باد، اس کے یار بیلی زندہ باد، اس کا لیڈر علی بلوچ زندہ باد۔ اور ان سب کی مہمان نوازی زندہ باد.....مگر ان لوگوں کی پان خوری مردہ باد۔

گوادری لوگ ''باتیل'' یا ''بتیل'' چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں۔ ہمارے مشرقی بلوچستان میں یہ لفظ آدمیوں کے نام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ صرف تلفّظ کا فرق ہے۔ ہم اسے باثیل پکارتے ہیں، عربی والا ''ث'' ادا کرتے ہیں۔ حضرت مست توکلی نے باثیل سمیت اپنے دوستوں اور ہم دردوں کے نام یوں گنوائے ہیں؛

گوئر بلوچانا دعائیں ملخانی
آسرو اومیثے گریوانی
سرجمیں شاذی ہاں قلاتانی
تامیں ناں باثیل بور بناتاتی

البتہ ہم مشرقی بلوچستان کے بلوچوں کو باثیل کا مطلب نہیں آتا۔ معلوم نہیں کہ یہ لفظ اصلاً مشرقی بلوچی کا ہے یا مغربی کا۔ اور اگر مغربی بلوچستان کا ہے تو پھر یہ مشرقی بلوچستان میں کب آیا؟ اگر اس کے مطلب کشتی کے ہیں تو مشرقی بلوچستان میں اس نام کو برقرار رکھنے کا جواز سمجھ میں نہیں آتا، جہاں نہ کشتی ہے نہ سمندر۔ اُدھر، خود مکران میں مجھے باتیل نام کا ایک آدمی بھی نظر نہیں آیا۔

کوہِ باتیل، فطرت کی صورت گری کے چند نمونوں میں سے ایک ہے۔ آپ نیچے زمین پر سے دیکھیں تو لگتا ہے کہ قدیم دور کی کوئی فصیل ہے جسے ہزاروں بلڈوزروں نے برسوں محنت کر کے مٹی سے گویا پچھلے برس ہی مکمّل کر لیا ہو۔ گوادر کی حفاظتی مٹی کی دیوار۔ ساخت ایسی جیسے ہاتھ لگائیں تو بھربھرا ہو کر ڈھے جائے۔ لیکن اوپر جائیں تو یہ مٹی نہیں پہاڑ ہے، پہاڑ جیسا سخت۔ یہ فاسلز سے بھرا ہوا

ہے۔سمندری حیات کی آماج گاہ ہے۔اس پہاڑ پر گہرے نسواری رنگ کی بے ترتیب چوٹیاں ہیں، جو 500 فٹ تک بلند ہیں۔

کوہِ باتیل، گوادر کی جنوبی فصیل تشکیل دیتا ہے۔سمندر کو خشکی سے جدا کرنے والی دیوار۔ پہاڑ پر چڑھیں تو معلوم ہوگا کہ جیسے پانی کے ایک وسیع تھال کے اندر خشکی نے زبان نکال کر گویا سمندر کا مذاق اڑالیا ہو۔یہی نکلی ہوئی زبان گوادر ہے۔یہ زبان شمال میں مہدی نامی پہاڑ میں سے نکلتی ہے۔ اس خشکی کی پٹی کے دائیں طرف کا سمندر ''پشتی زر'' (عقب کی طرف کا سمندر) بن جاتا ہے اور انسانی زبان جیسی خشکی کی بائیں جانب ''دیمی زر'' (سامنے والا سمندر) اور زبان کے سامنے والا جنوبی حصہ دانتوں کی دیوار یعنی کوہ باتیل ہے جس کی لمبائی تقریباً 20 میل ہے۔اس پہاڑ کا مشرقی حصہ جمبیل کہلاتا ہے۔(مشرقی بلوچستان میں ایک بڑے پہاڑ کا نام تُمبیل ہے جو گوادر سے ہزار میل دور ہے۔نام، الفاظ، خیالات کس طرح سفر کرتے ہیں۔جُمبیل، تُمبیل! باتیل، باثیل!)

جُمبیل پہ نیوی کا اڈہ ہے۔اس مقتدرہ علاقے میں عام میلے کچیلے (بلوچ) لوگ نہیں جا سکتے۔بے نظیر پوائنٹ بھی اسی جُمبیل پہ واقع ہے۔

کوہِ باتیل کی شمالی چوٹیوں پر فصیل نما مورچے ہیں اور پتھروں کی چار دیواری کے آثار ہیں۔علی بلوچ اور اس کے ساتھی اُسے ''سکندرے سنگر'' (سکندر کا مورچہ) کہتے ہیں۔وہی ہمارا آپ کا جانا پہچانا سکندر، سکندر اعظم جو دنیا میں تھا تو تباہی بربادی پھیلاتا رہا اور گیا تو اس کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔یہ حضرت، جیسا کہ ہم جانتے ہیں ہندوستان کی فتوحات سے واپسی پر بلوچستان سے گزرا اور مکران میں وارد ہوا۔اس کے ایڈمیرل نیرکوس، (جس نے ساحل کے ساتھ ساتھ سفر کیا تھا) کے لیے سفرنامہ لکھنے والے آرین نے اپنی تحریر میں کلمت، گوادر، پیشکان اور چاہ بہار نامی مقامات کا نام لے کر ذکر کیا تھا، جب اس نے یہاں مصالحہ جات کی پیداوار کا ذکر کیا تھا(1)۔یہ بھائی صاحب کیٹی بندر سے روانہ ہوا، اور ماڑہ، کلمت، ہپت تلار، پسنی اور گوادر سے ہوتا ہوا آگے گیا۔

گوادر، پسنی اور ماڑہ اور جیوانی میں انسانی آبادکاری کی ایک طویل تاریخ ہے۔دوسرے

قابلِ ذکر مقامات میں پیشکان، سور بندر، گبد، سُنٹ سر، کپر، گنز، تنک، نوخ بر، شنزانی، چُر، رمبرا، گورسُنٹ، ماکولا، جافری، ہد، اور کولمیر سُنٹ شامل ہیں۔

اس کامران وکامیاب گلوبل فاتح کا بُھرکس عملی طور پر مکران نے نکال دیا تھا۔بارشوں اور سیلابی دریاؤں کے بپھر جانے اور بھون ڈالنے والی گرمی نے اس کی فوج کو پاؤں رگڑ ارگڑا کر مار دیا۔ بقیہ کو بلوچ مزاحمت نے کاٹ کھایا۔(اس کی پوری فوج کا 75 فیصد حصہ یہیں بے گوروکفن مرکھپ گیا تھا)۔تبھی تو سکندر نفرت سے بلوچوں کے بارے میں وہی الفاظ کہتا ہے جو بعد میں پرتگیریوں، عرب نوآبادکاروں، مغلوں، انگریزوں اور ایشیائی توسیع گروں نے اس آزادی پسند قوم کے لیے استعمال کیے: ''اوائل عمر سے لے کر زندگی کے آخر تک یہ وحشی طائفے ہاتھ پیروں کے ناخن نہیں کاٹتے تھے۔ اپنے سر اور چہرے کے بال نہیں کٹواتے تھے۔ان کے جسم کی کھال سیاہ رنگ کی تھی۔وہ مختصر لباس پہنتے تھے۔خوراک بھی ماہی اور لباس بھی ماہی.....'' (پتہ نہیں مہذب یہی میلے کچیلے بلوچ ہیں یا اُن پر صاف ستھرے، گورے چٹے یہ حملہ گر!!۔اور پتہ نہیں روح کے یہ میلے نیتوں کے یہ سیاہ لوگ بلوچوں کے ناخنوں، بالوں کی فکر میں کیوں بے چین رہتے ہیں۔ایسٹ انڈیا کمپنیوں کے خالق وحشی لوگ!!)۔

سکندر جان اس قدر درد اور کرب سے گزرا کہ جب وہ بہت سی مشکلات اور جانی ضیاع کے بعد موجودہ ''ایران شہر'' پہنچا تو باقی زندہ لوگوں کے بلوچستان سے سلامت آجانے پر اس نے سات دن سات راتوں تک جشن منایا، شرابیں پیں اور بدمستیاں کیں۔

سکندر کے جنرل نکاتر کی حکمرانی کے بعد سال 303 میں چندر گپت یہاں کا حکمران بنا۔ ''سکندرِ سنگر'' کوہِ باتیل کی بلندترین چوٹی پر اس قدر بلندی پر واقع ہے کہ واقعتاً سارے سمندر کی نگہبانی، رکھوالی کی جاسکتی تھی۔

ہم اِس چوٹی پر چڑھے۔یہاں سے ہمیں بھی سمندری بین الاقوامی شاہ راہ صاف صاف نظر آرہی تھی جہاں بڑے بڑے سمندری جہاز آجارہے تھے۔واضح رہے کہ بحیرہ بلوچ کا سمندری

روٹ دنیا میں مصروف ترین روٹس میں شمار ہوتا ہے۔تیل سے مالا مال خلیج فارس آنے جانے والے سارے جہاز اس علاقے سے گزرتے ہیں۔اندازہ ہے کہ سالانہ گیارہ ہزار جہاز جن کا وزن بارہ ہزار ملین ٹن ہے بحیرہ بلوچ سے گزرتے ہیں۔2500 آئل ٹینکر 33 ملین ٹن تیل لے جاتے ہیں۔(2)

چوٹی پر واقع اسی سنگر کے عین نیچے با تیل پہاڑ کی جڑ میں ایک تہہ خانہ بنا ہوا ہے۔اس میں تین کمرے بنے ہوئے ہیں پہاڑ کے اندر۔ ہمارے اچھے میزبان علی بلوچ اور اس کے ساتھی اُسے ''سکندر کا قید خانہ'' کہتے ہیں۔مگر اب اس غار کو سبز، سرخ، کالے، پیلے کپڑوں کی جھالروں سے سجا کر ایک درویش کے قدیم مسکن اور عبادت گاہ سے منسوب کیا گیا ہے۔روٹی بہت سے کام کرواتی ہے!

اس ''قید خانہ'' کے دروازے کے گرد کچی دیواروں کا ایک احاطہ تعمیر کیا گیا ہے۔جھالریں اگر بتیاں، ڈنڈے کونڈے.....احاطہ خوب جھاڑو شدہ ہے۔اندر جائیں تو بہت اندھیرا ہے، (کرامت کی جگہیں پتہ نہیں تاریک کیوں ہوتی ہیں!)۔اور صرف ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ۔مصنوعی روشنی میں ایک بغلی جگہ پر داخل ہونا ہوتا ہے، مٹی کے فرش میں ایک سوراخ نیچے ایک سرنگ میں اتر جاتا ہے۔ جہاں سے ایک راستہ زیر زمین دائیں جانب جاتا ہے اور دوسرا بائیں طرف۔علی بلوچ بتاتا ہے کہ اندر جا کر سات مقامات پر قیدیوں کے چیمبر سے بنائے گئے ہیں۔

گوادر اُس کے زمانے میں خوش حال چھوٹا سا قصبہ تھا جہاں باغات تھے اور کھجور کے جھنڈ تھے۔

غار میں داخلے کی جگہ پر پتھر کی ایک سل پر کھرچ کھرچ کر یہ تحریر کنندہ تھی؛

ایں مکان ساکنہ حاجی سید محمد حسن ثانیٰ تیار ساخت از ہذا ٹرنگی رب العزت جل جلالہ

در ماہ محرم 1339 عمر قادر در باران داد

اندرونی کمرے کے بغلی حجرے میں سنگ مرمر کی تختی پر یہ تحریر تھی؛

لہٰذا المکان الا اعلیٰ از کمترین خلق اللہ تعالیٰ السیّد حاجی محمد حسن بن السیّد بہرام القادری

المتوطن الفشنگی الخانسوری در زمان، سلطان تیمور بن سلطان فیصل العامل

ملا قادر داد جن باران تمت، دہم محرم الحرام 1339ھ

(ارے یہ فشنگی کہیں پشین تو نہیں ہے۔اور اگر ہے تو یہ صاحب یقیناً سود کا کاروبار کرنے بمبئی یا کڑمب (کولمبو) نہ جا سکا ہوگا اور یہاں گوادر میں ہمارا پیر بن بیٹھا!)

سکندر اور سمندر مبالغوں، روایتوں، داستانوں اور کہانیوں کے ساتھی ہیں۔

اُس کے دور میں، ہمارے سمندر پہ آج کی ایک اور غیر سمندری قوم یعنی پنجاب کی نیوی کے ہیڈ کوارٹر اور ماڑہ کو ''باگ سیرا'' کہتے تھے۔(3)

مکران سے حتیٰ کہ بارہویں صدی میں ھند، سندھ، زنجیبار، اور مصر کے لوگ، مشک، نیل، خوشبودار جڑی بوٹیاں، اور، ھند اور زنجیبار کے غلام، مخمل، شالیں اور دیگر نایاب ''اشیا'' کی تجارت کیا کرتے تھے۔وہ مصری اور شکر.....مکران سے ''بے خدا ممالک میں بھی اور اسلام والے علاقوں میں بھی'' برآمد کرتے ہیں۔(4)

واضح رہے کہ گوادر ساتویں، آٹھویں، اور نویں صدی میں ایک جانی پہچانی بندرگاہ تھا۔ جس کا عرب مؤرخین کے ہاں ''طیز'' (Tiz) کے نام سے تذکرہ ملتا ہے۔(5)

مارکو پولو جب واپس اپنے وطن جا رہا تھا تو 1290ء میں بلوچ ساحل سے گزرا تھا۔اس نے بھی ہماری فضاؤں کے ذائقے سونگھے، ہماری معطّر ہوائیں چکھیں اور ہمارے دل فریب ساحل دیکھے۔ہمیں اس کے بیان کے کچھ ٹکڑے ملے ہیں؛ ''کیچ مکران ایک سلطنت ہے جس کا اپنا ایک بادشاہ ہے اور ایک مخصوص زبان ہے۔ کچھ لوگ بت پرست ہیں۔وہ تجارت کرتے ہیں اور صنعت سے وابستہ ہیں، اس لیے کہ وہ پکے تاجر ہیں اور زیادہ تر مال سمندر اور زمین سے ہر طرف لے جاتے ہیں۔ان کی خوراک چاول، مکئی، ماھی اور دودھ ہے''۔(6)

صابر بدل خان سولہویں صدی کے وسط میں ترک ایڈمرل علی رئیس کی مکران آمد کا حوالہ دیتا ہے، جس نے یہاں کی آبادی اور ان کی بحری سرگرمیوں کی تفصیل دی ہے۔ وہ نوتک بلوچ کی کشتی سے اپنی مدبھیڑ کا ذکر یوں کرتا ہے؛

''یہاں ہمارا نوتک کے قزاق جہاز سے واسطہ پڑا جو کہ لُوٹ کے مال سے لدا پھندا تھا۔ اور جب چوکیدار نے ہمیں دیکھا تو انہوں نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ ہم نے انہیں بتایا کہ ہم مسلمان ہیں تو ان کا کیپٹن ہمارے جہاز پر آیا۔ اس نے شفقت سے ہمیں پانی دیا اس لیے کہ ہمارے پاس پانی کا ایک قطرہ بھی نہیں بچا تھا، اور اس طرح ہمارے تھکے ہوئے سپاہیوں کی جان بچ گئی.....اسی کیپٹن کی حفاظت میں ہم گوادر کے ساحل پہ اترے۔ وہاں کے لوگ بلوچستانی تھے اور ان کا سربراہ ملک جلال دین تھا جو کہ ملک دینار کا بیٹا تھا۔(7)

بلوچستان کے ساحلِ سمندر کے ساتھ ساتھ کئی مساجد، تاریخی عمارات اور مندر واقع ہیں جو سیاحوں کے لیے باعثِ کشش ہیں۔ لیکن ان مقامات تک رسائی نہ ہونے کے باعث لوگ اپنے ثقافتی سرمایہ کو نہیں دیکھ سکتے۔ سڑکوں کی تعمیر سے آثارِ قدیمہ اور تاریخی مقامات تک رسائی ہوتی جارہی ہے، اور خوب خوب بلوچستان شناسی ہونے لگی ہے۔

کوہِ باتیل پر سولہ کلومیٹر تک سنگار رہائشی سکیم بنائی گئی ہے۔ پکی سڑک اور سیوریج کا جال بچھایا جارہا ہے۔ اس سکیم میں بلوچستان کے دانش وروں، صحافیوں اور ادیبوں کے لیے پلاٹ مخصوص ہیں۔ دیگر لوگوں نے بھی یہاں پلاٹ بنا رکھے ہیں۔ حکمران طبقات کے وابستگان بھی اس حسین اور خوب صورت مناظر سے بھرے علاقے میں اپنی رہائش گاہیں مخصوص کروا چکے ہیں۔

علی بلوچ کا مشاہدہ ہے کہ گوادر گناہ گاروں کو پہچانتا ہے اور سزا دیتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ جتنے بھی سربراہانِ مملکت، گورنر اور بڑے لوگ گوادر کا دورہ کرتے ہیں تو واپسی پر برطرف ہو جاتے ہیں۔ وہ اس بارے میں بے نظیر بھٹو کی مثال دیتا ہے، نواز شریف بھی دورۂ گوادر کے بعد بادشاہ نہ رہا، امیر الملک بھی گوادر سے واپسی کے بعد بڑا قاضی نہ رہا تھا۔ گورنر بلوچستان میاں گل کو یہیں سے واپسی پر صوبہ سرحد بھجوا دیا گیا تھا۔ یا پیرانِ پیر! گوادر کا احتساب جاری رہے!!۔

باتیل پہاڑ پر قدیم زمانے کی زمینداری کے زبردست آثار ہیں۔ یہاں بہت ہی قدیم زمانے کا بنا ہوا ایک تالاب ہے جہاں بارش کا پانی جمع ہوتا ہے۔ ایک کنواں ہے، زمینیں اور بندات

ہیں۔ پتھر کے بڑے بڑے بلاک خوب صورت ترتیب سے ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں۔ گوادر کی تاریخ کا گرو، علی بلوچ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ان آثار کو پرتگیزیوں کے دور کا قرار دیتا ہے۔ واضح رہے کہ سولہویں صدی کے اوائل میں پرتگیزیوں نے ہمارے وطن کے اس حصے پر قبضہ کیا تھا۔ چنگیز اور ہلاکو کی تہذیب دشمنی کے بعد ظلم وستم میں پرتگیزی نو آبادکاروں ہی کا نمبر آتا ہے۔ ان ناترس لوگوں نے 1518ء میں پسنی اور گوادر کے خوب صورت اور امیر شہر جلا ڈالے تھے۔ ان بیرونی قبضہ گیروں کی راہ میں بلوچوں نے مزاحمت کے پہاڑ کھڑے کر دیے۔ اس مزاحمت اور اس کے ہیرو ہمّل کے بارے میں بلوچی کلاسیکل شاعری میں مواد کا ایک انبار موجود ہے۔ اِس شان دار انسان ہمّل کے قلعے اور کنوئیں ابھی تک ''گزدان بل'' میں موجود ہیں۔ اس نے پسماندہ ٹیکنالوجی اور فرسودہ اسلحہ کے باوجود کھلے سمندر میں جا کر بلوچستان کے دشمنوں کو للکارا۔ لڑتے ہوئے بالآخر اس کی پاک زندگی قربان ہوگئی۔ شہیدوں کی وجہ سے تو قوموں کی پہچان ہوتی ہے۔ وطن سے پیار، سرزمین سے عشق اور آزادی سے کمٹ منٹ.....ہمّل کے ہزار نام ہو سکتے ہیں۔ یہی اعلیٰ انسانی اقدار نہ رہیں تو انسان انسان ہی نہ رہے بس آلو اور شفتالو ہی رہ جائیں۔

''میرا دوست میدانِ جنگ سے واپس نہیں آیا، سر۔ میں باہر جا کر اُسے لینے کی اجازت چاہتا ہوں''۔

''اجازت نہیں ہے'' آفیسر نے کہا۔ ''میں تمہیں ایک ایسے شخص کے لیے جان خطرے میں ڈالنے نہیں دوں گا جو شاید مر چکا ہے''۔

سپاہی اس کے باوجود چلا گیا، ایک گھنٹہ بعد مہلک طور پر زخمی حالت میں لوٹ آیا۔ اپنے دوست کی لاش اٹھائے۔

آفیسر طیش میں تھا، ''میں نے تمہیں کہا تھا کہ وہ مر چکا۔ اب میں تم دونوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہوں۔ مجھے بتاؤ ایک لاش کو اندر لانے کی اتنی بڑی قیمت جائز تھی؟''۔

آخری سانس لیتے ہوئے شخص نے جواب دیا، ''ہاں سر، بالکل۔ جب میں اُس تک پہنچا تو وہ ابھی تک زندہ تھا اور اس نے کہا، ''جیک، مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گئے''۔ اور میرا بلوچستان ضرورت کے وقت ایک نہیں، ہزار جیک دیکھتا رہا ہے۔

گوادر کو پرتگالی ''گوادل'' کے نام سے جانتے تھے اور اس کا ذکر مینوئل ڈی فاریا ساؤزا کی کتاب History of the Portuguese doings in the East میں ملتا ہے۔ باتیل پہاڑ کن کن ویریوں کی آنکھیں پھوڑ چکا ہوگا!

سترھویں صدی میں بلیدی یہاں کے فیوڈل حکمران فیوڈل ہوگئے جن سے پھر گچکیوں نے علاقہ لے لیا۔ انہوں نے 1735ء میں نادرشاہ کے جنرل تقی خان کی ریٹائرمنٹ کے بعد اس جگہ کا مستقل قبضہ لے لیا۔ قلات کے بڑے فیوڈل نصیر خان نوری نے اس علاقے کی آمدن میں حصہ نہ ملنے پر یہاں بار بار حملے کیے۔ اور جب اس سے گچکی فیوڈلوں نے ریونیو کی آمدن سے آدھا دیتے رہنے کا معاہدہ کیا، تب جا کر جنگ بند ہوئی۔

1860ء کی دہائی میں پارس کی طرف سے بلوچستان کے ساحلی علاقے میں دست اندازیاں جاری تھیں۔ 1869ء میں پیشین پر بمپور کے پارس والے گورنر ابراہیم خان نے قبضہ کیا اور انگریز حکومت نے خان قلات کی طرف سے مداخلت کر کے اس کی پیش رفت کو روک دیا۔ پھر، برطانیہ، قلات اور پارس کے نمائندوں کے ایک اجلاس کا فیصلہ ہوا اور سر، ایف گولڈسمتھ برطانوی کمشنر مقرر ہوا۔ مگر یہ مشن ایرانی بلوچستان کے بمپور تک 28 جنوری 1872ء سے پہلے نہ پہنچ سکا۔(8)

سنڈیمن نے 4-1883ء میں اس علاقے کا دورہ کر کے تمام تنازعات کا تصفیہ کر لیا۔ اس نے ایک طرف تو قلات کی اپنے رعایا کے ساتھ موجود جھگڑوں کا تصفیہ کیا اور دوسری طرف گوادر میں مسقط کی رعایا کے درمیان اختلافات مٹا ڈالے۔ یہاں 1876ء میں اُس وقت اختلافات پیدا ہوئے تھے جب گوادر کے والی نے رندوں کے کچھ فرار شدہ غلاموں کو حوالے کرنے سے انکار کر کے اُن کے

غصے کو اکسایا تھا، جو باقاعدہ جھگڑے کی شکل اختیار کر گیا۔ انڈو یورپین ٹیلیگراف لائن کاٹ دی گئی اور دوسرے اقدامات ہوئے۔ جولائی 1879ء میں مسقط سپاہ اور کچھ رند تاجروں کے درمیان ایک جنگ بھی ہوئی جس میں تین رند تاجر قتل ہوئے اور کچھ زخمی۔ 1880ء سے 1883ء تک مسئلہ خاموش رہا مگر 1883ء کے جنوری میں ٹیلے گراف ڈیپارٹمنٹ کی ایک پارٹی پر حملہ ہوا، جو یہاں کام کر رہا تھا۔(9)

ہم تاریخ سن رہے تھے.....کوہِ باتیل پر گاڑی دوڑاتے ہوئے حمید نے ایک جگہ گاڑی روک کر ہمارے اس تسلسل میں مارشل لا لگا دیا۔ اس کی ہدایات پر ہم پیدل ایک اترائی اترے۔ اور نیچے ایک بڑی وسیع ہموار چٹانی سطح پر کھڑے ہوگئے۔ ہم سے دو فٹ نیچے سمندر تھا۔ عمیق، شفاف نیلگوں سمندر.....عین پاؤں کے نیچے میلوں گہرا سمندر۔ واہ میرے رنگی بادشاہ۔ کتنی خوب صورتی، کتنا حسن!!۔ اس ہموار جگہ کو ''گرّاب'' کہتے ہیں۔ وہیں سمندر کے بیچ میں سے سر اٹھائی ہوئی ایک چٹان پہ ہمیں ایک سانپ کی میت نظر آئی جسے ہر طرف سے کیکڑے کھا رہے تھے۔ اس قدر شان والا سانپ جو ہندوستان میں دیوتا بنا بیٹھا ہے، میرے بلوچستان میں کتنا قابلِ نفرت اور حقیر بنا تھا۔ علی بلوچ بتاتا ہے؛ ''یہ سانپ بہ یک وقت خشکی کے بھی ہوتے ہیں اور سمندر میں بھی بلا تکلّف تیراکی کرنے، شکار کھیلنے، یا پھر محض چہل قدمی کرنے آزادانہ آجا سکتے ہیں''۔

''گرّاب'' کے آس پاس ہمیں چرسیوں کی خلوت گاہیں بھی نظر آئیں اور شرابیوں کے جام وسبو کی ''باقیات'' بھی۔ ہمارے بس میں ہوتا تو ہم دنیا بھر کے سارے شرابیوں کو ہانک کر گوادر لے جاتے اور ''گراب'' پہ بٹھا کر شراب پینے کا حکم دیتے۔ جہاں خاموشی مکمّل سکوت بن جاتی ہے۔ فرحت بخش ہوا نشہ کو دو آتشہ کرتی ہے۔ خوب صورت نیلگوں سمندر اور Sea- Gull نامی خوب صورت بڑے سفید پرندوں کی تنہا یا با جماعت اٹھکیلیاں اس قدر دل فریب نظارہ تخلیق کرتی ہیں کہ شرطیہ طور پر ایک ہی جام سات آسمان پار پہنچا دیتا ہے۔ پریوں کا دیس ہے بلوچستان!!

ہم اس جادوئی فضا سے واپس شہر کو آتے ہیں تو علی بلوچ اصرار کرتا ہے کہ ہم گوادر پارک

دیکھتے ہوئے چلیں اور جب وہ اپنے مخصوص لہجے میں زور دے کر، گوادر کا ''اکلوتا پارک'' کہتا ہے تو ہم تھکاوٹ کے باوجود تجسّس میں ''ہاں'' کہتے ہیں۔ علی بلوچ بلوچستان کی پسماندگی کے مقدمے کا سب سے بڑا وکیل ہے۔ یہ شخص اکیسویں صدی کو بلوچستان سے ملا ڈالنے والا سفیر ہے۔ زندہ باد علی بلوچ آف گوادر۔

یہ بلوچ ساحل کا ''اکلوتا'' پارک ہے جو عین ساحل پر کروڑوں روپے کی لاگت سے بنایا گیا۔ یہ چھوٹا سا کیاری نما قطع چار حصوں میں منقسم ہے۔ اس میں سیمنٹ کے بنچ بھی رکھے ہیں۔ بلوچستان میں کسی سرکاری پارک میں گھاس کی موجودگی ناممکنات میں سے ہے۔ پارک میں خواتین و حضرات! باقاعدہ ریت کے ٹیلے ہیں: مصنوعی نہیں قدرتی۔ ریت کے ان نرم ڈھیروں پر کتے استراحت فرماتے ہیں؛ درجنوں کتے......کالے، موٹے، سست الوجود، خارش زدہ۔ ان ڈھیروں میں دسیوں کھڈے انہی کتوں کی آرام گاہیں ہیں۔ انسانی جمالیات کے ساتھ یہ گھناؤنا مذاق ہماری بیورو کریسی ہی کرسکتی ہے۔ جسے بے شمار نیپاؤں، اکیڈمیوں میں نزاکتوں لطافتوں کی ٹریننگیں دی جاتی ہیں۔ پارک کی چار دیواری کب کی مہر گڑھ بن چکی ہے۔ جسے سبزہ سے، گل سے، مہک سے پیار نہیں، وہ کیا انسان ہوگا؟۔

ارے بلوچستان پسماندہ نہیں، اس کی بیورو کریسی پسماندہ ہے!!

حوالہ جات

1۔ Tarn, W.W " the Greeks in bactria and india" - Cambridge University press, 1951, P.94.

2۔ Costal enroironmental management, plan for pakistan- United nations ,New york,1996 , page No.1

3- بلوچ، محمد امین Inside ormara۔ صفحہ -6

4۔ بارہویں صدی کی ''افضال کرمانی'' جس کا حوالہ دیا: بلوچ، ایم ایس نے اپنی کتاب ''اے لٹریری ہسٹری آف بلوچیز'' 1977۔ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ صفحہ 52 میں۔

5۔ "Gwader Master Plan" Govt Of Balochistan, Nov-2002, Page No. 2-3

6۔ پول، سر ہنری The book of Marcopolo, the venetain concerning the kingdoms and Marvels of tha east London: John murry 1903: p.401

7۔ صابر بدل خان، (Costal makran" Urasian Studies 1/2 -2002)، P No.245

8۔ بلوچ، محمد امین Inside Ormara، 1999، کراچی صفحہ 12

9۔ قاضی سلیمان۔ ''نودن......'' ماہنامہ سنگت۔ صفحہ 54

21

بلوچ ساحل وسمندر

صبح سویرے اٹھے اور PIA کے دفتر میں کراچی کی پرواز کے لیے نشستیں ''پکی'' کرنے کی اقبال بلوچ کی ڈھیر ساری یقین دہانیاں وصول کرنے کے بعد ہم ماہی گیری کی صنعت کے بارے میں اپنا علم بڑھانے روانہ ہوئے۔(پاکستان اورنشست کی پکّائی! جہاں سیٹ پکا کرنے کے لیے مسلم لیگی، پھر کنونشن لیگی، پھر پگاڑا لیگی، قاسم لیگی، چھٹہ لیگی، ن لیگی اور پھر ق لیگی بننا پڑتا ہے۔اور اُس وقت تک سیٹ پکی ہو جانے میں اپنی شخصیت کچی ہو کر رہ جاتی ہے)۔

بلوچستان کا ساحل 750 کلومیٹر طویل ہے۔یوں پاکستان کے کل ساحل کا 80 فیصد حصہ بلوچستان میں ہے۔بلوچستان کا یہ ساحل مشرق میں کراچی سے لے کر مغرب میں ایران تک پھیلا ہوا ہے۔اس طویل ساحل پہ موجود بندرگاہوں میں گڈانی، ڈام، سومیانی، پسنی، ہنگول، کلمت، گوادر، سر اور جیونی شامل ہیں۔پسنی فش ہاربر مکمّل ہوگئی ہے اور گوادر بندرگاہ زیرِتعمیر ہے۔بلوچستان کے ساحل پر ماہی گیری کی کل 32 چھوٹی بڑی بستیاں آباد ہیں۔

ماضی میں گڈانی ساحل پر ایک پورٹ رہا، جہاں سے بین الاقوامی تجارت ہوتی تھی۔1972 میں یہاں شپ بریکنگ یارڈ تعمیر ہوئی اور شپ بریکنگ کے عروج کے زمانے میں یہاں 50 ہزار مزدور کام کرتے تھے۔یہ مزدور غیر منظّم تھے۔انہیں رہائش کی کوئی سہولت نہیں دی گئی، صحت کی سہولیات، پنشن وغیرہ کچھ بھی تحفّظ حاصل نہ تھا۔ان کے اوقات کار اور حالات کار انتہائی

ظالمانہ تھے۔ان کا سارا کام جسمانی تھا اور انہیں کوئی بھی سائنسی اور تکنیکی سہولت میسر نہ تھی۔

ماہی گیری کی صنعت

ماہی گیری صدیوں سے بلوچوں کے لیے روزی کا اہم ذریعہ رہی ہے۔ساحلی آبادیاں سمندری ماہی گیری کے پیشے پر گزارہ کرنے کے علاوہ کوئی اور ذرائع نہیں رکھتیں۔

دو چار فقرے ماہی گیروں کی ایک آدھ بغاوتوں پہ:

ماہی گیروں کی تحریکیں اور بغاوتیں صدیوں سے جاری ہیں۔ایک بڑی اور ریکارڈ شدہ بغاوت 8 ستمبر 1590ء میں ہوئی تھی۔اس زمانے میں امیر ملوک' قلات کا حکمران تھا۔اور مکران میں درک زئی نوہانی بلوچوں کی حکومت تھی۔امیر مظفّر شاہ حاکم مکران تھا۔اُس نے ماہی گیروں پر ٹیکس بڑھا یا دیا۔ماہی گیروں نے زبردست مزاحمت کی۔امیر مظفّر نے قلات سے مدد طلب کی۔چنانچہ امیر ملوک بہ نفس نفیس اپنے طبقے کی مدد کے لیے چھ ہزار لشکر کے ساتھ تربت کی طرف روانہ ہوا۔مکران پہنچ کر اُس نے امیر مظفّر کا لشکر بھی ساتھ لیا اور پسنی کی طرف روانہ ہوا۔پیدارک کے مقام پر ماہی گیروں کے لشکر سے آمنا سامنا ہوا۔شدید لڑائی میں ماہی گیروں کو شکست ہوگئی۔اس لڑائی میں خان قلات' امیر ملوک بھی مارا گیا جسے سوراب لا کر دفنایا گیا۔

ہمیں اندازہ ہی نہ تھا کہ انسان کے ہاتھوں بدقسمت بنائے گئے بلوچ کے بھاگ دراصل بہت بلند ہیں۔یہ بات ہمیں اس کے بانصیب سمندر کے خوب صورت جزیروں، بلند و بالا پہاڑوں، قسم قسم کی مچھلیوں، نوع بہ نوع سیپیوں اور بے شمار نباتاتی وحیوانی جانداروں، نظاروں، مناظر اور آثار قدیمہ کے حوالے سے معلوم ہوگئی۔یہاں پہاڑوں چٹانوں کی کتنی قسمیں ہیں! یہاں معدنی دولت، جغرافیائی ماحولیاتی کیفیات کتنی ہیں! یہاں کھجوروں، اونٹوں اور مچھلیوں کی کتنی زیادہ قسمیں ہیں!۔

ماہی معیشت کی حالت اب یہ ہے کہ پورے پاکستان سے پکڑی جانے والی مچھلی کا ایک چوتھائی حصہ صرف ایک ضلع، گوادر سے حاصل ہوتا ہے۔صوبے کے ساحل کی 80 فیصد آبادی ماہی

گیری کے سیکٹر سے وابستہ ہے جو3015 ماہی گیری کی کشتیاں چلاتے ہیں اور تراسی ہزار میٹرک ٹن مچھلی سالانہ پیدا کرتے ہیں ،جس کی مالیت280 ملین روپے ہے۔1987ء میں ماہی گیری کی صنعت پر انحصار کرنے والی آبادی 162,000 سے زیادہ تھی۔ صرف گوادر میں فل ٹائم مچھیرے1986ء میں12,963 تھے اور1995ء میں بڑھ کر16,380 ہوگئے۔1997ء میں بلوچستان سے مچھلی کی برآمد ایک لاکھ بارہ ہزار میٹرک ٹن تھی اور اس سے800 ملین روپوں کی آمدنی حاصل ہوتی تھی۔ پارٹ ٹائم مچھیروں کی تعداد کل آبادی کا6.2 فیصد تھا۔ جب کہ ان لوگوں کے اعداد وشمار دستیاب نہیں ہیں جو ماہی گیری سے وابستہ دوسری سرگرمیوں سے متعلّق ہیں مثلاً کشتیاں بنانا، جال مرمت کرنا، مچھلی بیچنا، برف بنانا اور ماہی کو خشک کرنا۔ (پھر بھی کہتے ہیں کہ بلوچستان ایک غیر طبقاتی سماج ہے، یا یہاں طبقات واضح نہیں ہیں)۔

یہاں 350 سے زیادہ اقسام کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں ۔ سمندری میملز میں ڈولفن، Porposises، Cetaceans اور وھیل مچھلی پائی جاتی ہے۔

لابسٹر (جسے بلوچی میں کیکٹ کہتے ہیں)، (سامن)، Trout Perch (مشکو، و بام)، Sowan, Dotar Mangla، Bass Muska، Groakers، نشہ، پام فریٹ، Herring (بلوچی: کر)، سارڈین (بلوچی: مربا) ، Tuna (بلوچی: دون)، True Mackered (بلوچی: سوا)، ڈورا ڈو، مارلنگ، کیٹ فش، رے، سیکٹ، شارک، Dreas Vin Breams (بلوچی: کمپو) راک فش (بلوچی: گر)، شرمپ اور کریب اور چھوٹے chuki۔

اندازہ ہے کہ seaweeds, cephalopods, , clams, mussels اور sea urchins بہت ہی امکان والی کمرشل قسمیں ہیں۔

پام فریٹ مہنگی مچھلی ہوتی ہے اور اس کی قیمت400 روپے فی کلو تک جاتی ہے۔

سمندری کچھوے بھی ساحلوں پر بچے پیدا کرنے آجاتے ہیں۔ بلوچ ساحلوں پر سبز اور Oilve Riddie قسم کے کچھوے پائے جاتے ہیں۔اس سلسلے میں جیونی، گنز اور اسٹولا جزیرہ

اہم ہیں۔(بلوچستان میں دو جزیرے ہیں: اسٹولا جزیرہ اور چرنا جزیرہ)۔

مچھلی پکڑنے کا زمانہ ستمبر سے مئی تک ہوتا ہے۔ ماہی گیر ایک ہفتہ سے تین ہفتہ تک سمندر میں حتیٰ کہ ایران، یو اے ای اور ہندوستان تک چلے جاتے ہیں۔ ماہی گیر مئی سے ستمبر تک مچھلیاں نہیں پکڑتے۔اس زمانے میں جنوب مغربی مون سون سمندروں کو وحشی بنا دیتا ہے۔

پاگاس (شارک)

ہم خشکی کے رہنے والوں کے لیے جب بھی شارک اور وہیل مچھلی کا نام آتا ہے تو ہم ٹی وی پہ دیکھے اور کتابوں میں پڑھے ہوئے دیو ہیکل اور آدم خور سمندری بلاؤں کا سوچتے ہیں۔مگر بلوچ سمندر میں اس بڑی مہلک شارک کا سمال سائز پایا جاتا ہے جو محض دس بیس سیر کا ہوتا ہے۔ اسے ہمارے محنت کے ولی پکڑتے ہیں، صاف کرتے ہیں اور تازہ یا پھر خشک کر کے سری لنکا برآمد کرتے ہیں۔ یہاں کی چھوٹی شارکوں کے نام ہیں: بمپل، سوراز پی، بگوئی، سیاہ گوش، کالی زید، جبروٹی، بارکالی، گورک، کانٹو، جومبو، گسو، چتی، وغیرہ وغیرہ۔

بڑے پاگاس تین قسم کے ہیں:

1-عام پاگاس: کینتر شد، نرمنگر، نرمانی، وروک، آم، موزی، لون، گورین، دندنی، دمبئی، کپ، جگری آم، کاناتی، ڈوکان، کندیل، وغیرہ۔

2- کانٹی پاگاس: بتر، ہلوندی، کاتیال وغیرہ۔

3-ارک دار پاگاس: بزداری، کیل، شمشیری، سدو، وغیرہ۔

کھانے کی مچھلیاں

کھانے کی بڑی مچھلی کی قسمیں یہ ہیں

گور، گشران، سنگلور، کرّ، سولی، سارم، سونام، گیدر، کڑہ، تو لگ، گور، اہور، گور چک، کلگن، گزی گواز، الس، کشگی، کندو، وغیرہ۔

کھانے کی درمیانی مچھلیوں کے نام یہ ہیں

سہرو، گدیر، سفیت، تگلم، سیاہیں تگلم، گوانز، مشکو، سولی چک، سیاہو، نامبو، چیلانکر، بڈی، پنڈاسی، پشنت، تاکاں، بولا، جاراڑ، پتر، کاکاون، سہردپ، سہر پیگ، چیل، دولنٹ، کلانچو، چانچو، کنلو، چاہ، ٹنٹیل، الولو، آدہے کلاہ، کلونٹو، ماہ پری، ٹانٹار، ٹونٹ، لونڈ، چناور، وغیرہ۔

کھانے کی چھوٹی مچھلی کی قسمیں:

لوجر (sardines)، مربہ، پلو، مینگ، تاگاں، گواریز، مرو، سواسک، ککڑ، بوتی، بڈنی، اشور، پالیڈی، دنگولی وغیرہ۔

مچھلی کی کچھ اور قسمیں یہ ہیں:

سکیٹ، رے، ٹونا، سائمن، ٹراؤٹ، باس، کراکر، پرچ، ہیرنگ، سارڈین، کارنج، گولاٹ، راکو اور پٹن وغیرہ۔ (پٹن کی اپنی مزید قسمیں ہیں مثلاً دولنٹ، ہتھوڑا، ابرہ، بہرن، لیڈ، وغیرہ۔

(لگتا ہے بلوچی سیکھنے گوادر جانا ہوگا!!)

مدگ

آپ اس وقت بلوچستان پڑھ رہے ہیں اور اس حوالے سے یہ بات ضرور نوٹ کرلیں کہ جب بھی آپ دنیا میں کہیں بھی کسی بڑے ہوٹل میں کھانا کھا رہے ہوں تو جب مینو پہ Prawns لکھا پائیں تو سمجھ لیں کہ یہ آپ کے لیے کسی بلوچ محنت کش نے پکڑے تھے.....ایرانی بلوچستان سے لے کر پاکستانی بلوچستان میں اسے ''مدگ'' کہتے ہیں۔

یہ ہماری عام جانی پہچانی مچھلیوں سے جدا ہیں۔ان کے جسم اور ٹانگوں پر خاص قسم کی جلد ہوتی ہے۔ان میں نہ ہڈی ہوتی ہے نہ کانٹے۔سارا جسم گوشت ہی گوشت ہے اور یہ گوشت پروٹین سے بھرا ہوتا ہے۔اسی لیے بیرونی ممالک خصوصاً جاپان اور امریکہ میں اس کی مانگ بہت زیادہ ہے۔

''مدگ''، پسنی، گوادر اور کلمت میں بہت ہوتی ہے۔

مدگ کی کئی اقسام ہیں:

جیارو، پٹاپٹی، کڈی مات، ٹائیگر، شرمپ، لسو، کلری اور کڈی۔شرمپ پاکستان میں اہمیت کے لحاظ سے سرفہرست ہے۔یہ عموماً کم گہرے پانیوں (20-30 میٹر) میں ہوتی ہے۔ہمارا سمندر تو سمجھیں شرمپ سے بھرا ہوا ہے۔

ہم جو کنڈی اور ڈور کی مدد سے اپنے ماوند کے پاس بہتے دریا ''چاکرکور'' میں مچھلیاں پکڑتے رہے ہیں، اس نئی دنیا کی دریافت کے کولمبس بن گئے۔گو کہ بوڑھے اور ناتواں لوگ یہاں سمندر کے کنارے بھی ڈور اور کنڈی والی ماہی گیری کرتے ہیں، جسے یہ لوگ ''چیروان'' کہتے ہیں۔مگر یہ تو بس نانِ شبینہ کے حصول والا شکار ہے (ناتواں کے طویل سجدوں کی مانند)۔اصلِ صنعت کے علم کے لیے آیئے میرے ساتھ۔

کشتی سازی کی صنعت

بخشی ہوٹل سے نکل کر شہر کی طرف جائیں تو ساحل پر ایک ''اوپن ایر فیکٹری'' نظر آئے گی، جہاں ماہی گیری کی کشتیاں بنتی اور مرمت ہوتی ہیں..... یکدار بھی، لانچ بھی اور ''ہوڑو'' بھی۔ہمارا خیال تھا کہ ماہی گیری کی ہر کشتی کو بلوچی میں یکدار ''یا'' ''بوجیگ'' کہتے ہوں گے۔مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ادھر بوجیگ کا مطلب الگ ہے، یکدار کا الگ، ماہی کش باتیل، ہوڑی اور باتیل سے الگ معنی رکھتے ہیں۔کشتی سازی کی اصلی لکڑی (دیار وغیرہ) بیرونِ ملک سے بھی آتی ہے اور کراچی سے بھی۔مگر بلوچستان کے ساحل کے اپنے کیکر سے بھی یہاں کشتیاں بنتی ہیں۔

یہاں جا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ کوئی کشتی ابھی محض ڈھانچے کے مرحلے میں ہے، کہیں آپ کو نئی زیرِتعمیر لانچ کی تختیاں نظر آئیں گی، کہیں بڑھئی کا کام تکمیل تک نظر آرہا ہے اور کہیں کوئی مکمّل کردہ لانچ رنگ وروغن کے آخری مراحل میں نظر آئے گی۔

ٹھکا ٹھک، دھپا دھپ.....محنت کش کی مقدس محنت کا صوتی اظہار۔ سیٹیاں، گپ شپ، غل غپاڑہ۔ کوئی گاتے ہوئے کام کر رہا ہے، کسی نے اونچی آواز میں ٹیپ ریکارڈر آن کر رکھا ہے۔ کوئی کھانس رہا ہے۔ کوئی اپنے چھوٹو کو ڈانٹ پلا رہا ہے.....زندگی بہر رنگ زندہ ہے یہاں۔ ان محنت کشوں کے ساتھ مل کر انسان تصنّع، ملاوٹ اور بناوٹ کی منحوس دنیا سے باہر آجاتا ہے۔ اور بے تکلّفی، دوستی اور بھائی چارے کی مقدس حکمرانی میں داخل ہو جاتا ہے۔ پان، چائے اور بوتل کی پیشکش اس بلوچ محنت کش کی گویا شناخت ہے۔ ان کے ساتھ گپ شپ میں بہت لطف آتا ہے۔ کیمرے کے سامنے تو یوں تن کر، پوز بنا کر کھڑا ہوتا ہے جیسے پانی پت کی جنگ میں دشمن کی تلوار کے سامنے تیار کھڑا ہو۔ اتنے غیر مصنوعی، اتنے فطری لوگ.....فوٹو کھچوانے کے بعد ہی اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ پانچہ چڑھائی شلوار کو سیدھا کرنا تو بھول گیا تھا!!۔

کشتیوں کی اقسام

بوجیگ

یہ تقریباً سو فٹ لمبا، 50 فٹ چوڑا اور 12 فٹ گہرا ہوتا تھا۔ بوجیگ سمندری تجارت کا تاریخی وسیلہ رہا ہے۔ بوجیگ بلوچ ساحلوں سے انڈیا، عرب ممالک اور افریقی ساحلوں کے درمیان درآمد و برآمد کا بہت ہی اہم ذریعہ رہا ہے۔ یہ 100 ٹن تک وزن لے جانے کے قابل تھا یعنی 100 کلوگرام والی 1500 سے 2000 بوری گندم۔ خالص لکڑی کی بنی ہوئی اس پہلوان کشتی میں انجن نہیں ہوتا تھا۔

یہ بوجیگ بہت طویل سفر طے کیا کرتے تھے جو تین سے چھ ماہ تک کے عرصے کے ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی تو اپنے گھر لوٹے بغیر ایک بندرگاہ سے دوسری بندرگاہ تک مال لانے لے جانے میں پورا سال لگا لیتے تھے۔

ساحلِ بلوچ، تاریخی طور پر تجارت کی شاہراہ رہا ہے۔ ماضی بعید میں بھی یہاں سے

بڑے پیمانے پر درآمد برآمد ہوتی تھی۔ خشکی کی طرف بھی اور سمندر میں بھی۔ ساحل سے بلوچستان کے اندرونی علاقوں (نیز دیگر پڑوسی علاقوں) میں بارٹر والی تجارت ہوا کرتی تھی، یعنی مال کے بدلے مال کی تجارت۔ جس میں ساحل انہیں مچھلی (خصوصاً مربہ اور کول گیر) مہیا کرتا تھا۔ اور خشکی والے بلوچ علاقوں سے خشک کھجور (لد، اُش کیچ اور ہارگ) اور تازہ کھجور (موزاتی، سورمچ اور آسمی) آتا تھا۔ کھجور اور آٹے سے بنی ہوئی مٹھائی (پنڈی) آتی تھی۔ گندم اور اصلی گھی آتے تھے۔

بوجیگ ہندوستان کے مالا بار، بمبے، کوچن، کالی کٹ، پور بندر، صورت اور جام نگر تک نمک لگی مچھلی (خصوصاً پلاّ، سولی، کیر، گور) پہنچاتا تھا اور وہاں سے درآمد کے بطور کھوپرا، بیڑی کے پتے، ریڈی میڈ گارمنٹس، کھوپرے کا تیل، گندم، گھی، چاول، اور مٹی کا بنا ہوا توا (دانگی) لائے جاتے تھے۔

بوجیگ زنجیبار (تنزانیہ) تک بلوچستان کی چٹائی، رسے رسیاں، کھجوریں، اور دیگر اشیا لے جاتے تھے۔ جب کہ وہاں سے ہر قسم کا بانس اور کشتیاں بنانے والی عمارتی لکڑی ڈھو کر لاتے تھے۔

عراق میں بصرہ کو بلوچستان سے چٹائیاں، رسے رسیاں اور خوردنی اشیا برآمد ہوتی تھیں اور بوجیگ کے ذریعے وہاں سے زاہدی اور کوسار نامی تازہ کھجوریں درآمد ہوتی تھیں۔

سب سے بڑی تجارت سری لنکا (سیلون) سے ہوتی تھی۔ بوجیگ کے ذریعے یہاں سے تو اچھی اور خیر والی چیزیں (نمک لگی مچھلی) جاتی تھیں۔ مگر اُدھر سے بہت فضول چیزیں آتی تھیں جو اب تو بلوچ کی قومی دشمن بن چکی ہیں۔ سپاری اور پان کا پتا وہیں سے ہمارے گلے پڑ گئے ہیں۔ تاملوں اور سنہالیوں کی موجودہ لڑائی میں جو فریق بھی پان سپاری پر پابندی لگانے کا اعلان کرے گا، ہماری مدد اُسی کے ساتھ ہوگی۔ (لیکن ہماری تو اللہ سے دعا ہے کہ انسانوں کے درمیان جنگ و نفرت ختم ہو اور سب کو عقلِ سلیم اور دلیل و استدلال سے باہمی مذاکرات سے مسائل کو حل کرنے کی توفیق ہو کہ ''لعنت بہ جنگا''۔ مگر ہم کیا کر سکتے ہیں؛ جنگوں میں ہی بہت سے لوگوں کا سیٹ (فائدہ) ہوتا ہے۔ ان کی دال روٹی، اور چاہ و چلم چلتا ہے۔ چھوٹے پیمانے پر بھی اور بڑے پیمانے پہ بھی۔ اس لیے اگر امن کمیٹیاں مختلف ذرائع سے امن کی تلاش میں سرگرداں رہتی ہیں تو جنگ باز بھی بہت سے اصلی یا

مصنوعی حالات پیدا کر کے جنگیں کرواتے رہتے ہیں)۔

یکدار

یہ پانچ سے لے کر گیارہ میٹر طویل ہوتا ہے۔ یہ کشتی جہاز کے پیندے کی بیچ کی ایک لمبی لکڑی سے بنتی ہے۔ یکدار اب کم ہوتے جا رہے ہیں۔ ہولیگ (چپو) والے یکدار تو بالکل ختم ہو چکے ہیں۔ دوسرے یکدار پر بھی اب موٹر (انجن) فٹ کیے جا رہے ہیں۔ یہاں زیادہ تر یاماہا موٹریں کشتیوں پر لگائی جاتی ہیں۔

رنچون

یہ لمبائی میں یکدار جتنی ہوتی ہے۔ فرق صرف لکڑی کا ہوتا ہے۔ یہ چھوٹی لمبائی والی لکڑی کے تختوں سے بنتی ہے جنہیں لوہے کی میخوں سے جوڑا جاتا ہے۔

Gill-knetter

میڈیم سائز کی کشتی ہوتی ہے جس کے پیندے کی لکڑی کی لمبائی نو سے چودہ میٹر تک ہوتی ہے۔

لانچ

اس کے پیندے کی لکڑی چودہ سے بیس میٹر لمبی ہوتی ہے۔ Gill-Knetter اور لانچ میں بڑی انجنیں لگائی جاتی ہیں۔

بُج

پلاسٹک پیکنگ والے ڈبوں کو جوڑ کر کشتی نما چیز بنا لیتے ہیں۔ جس پر سوار ہو کر ماہی گیر اپنی کشتی سے خشکی تک آ جا سکتے ہیں۔ کشتی تو ساحل سے پندرہ بیس گز اندر سمندر میں لنگر انداز ہوتی ہے۔

ترشٹ، یا، کائیک

یہ تیز رفتار موٹرائزڈ کشتی ہوتی ہے جو کہ فائبر گلاس سے بنتی ہے۔ یہ ماہی گیری میں کام نہیں آتی۔ سپورٹس کار کی طرح شوقیہ اور مستی میں امیر لوگ یا ادارے استعمال کرتے ہیں۔ سمندری سپورٹس کار۔

ایک پیرا گراف شپ بریکنگ کے بارے میں:

بلوچ ساحل پہ اور کوئی صنعت موجود نہیں۔ ایک دانہ شپ بریکنگ ہوا کرتی تھی گڈانی میں، جس کا رقبہ 1400 ہیکٹر تھا۔ اپنے جوبن کے وقت (86-1982) اس صنعت میں 35 ہزار آدمی کام کرتے تھے اور دیگر پانچ لاکھ کی آبادی بالواسطہ طور پر اس شپ بریکنگ انڈسٹری پہ انحصار کرتی تھی۔ اس سے 612 ملین روپے کسٹم ڈیوٹی کے ملتے تھے، 35 ملین روپے انکم ٹیکس کے اور 22 ملین امپورٹ لائسنس فیس کے بطور حاصل ہوتے ہیں۔ مزید برآں یہ صنعت بلوچستان ڈولپمنٹ اتھارٹی اور لوکل ڈسٹرکٹ کونسل کو 20 ملین روپیہ دیتی تھی۔ مگر پھر یہ انڈسٹری بھی غیر بلوچستانیوں کو خوب موٹا بنا کر گلا گھٹنے کی موت سے مر گئی۔ بدبختو! سونے کے انڈے دینے والی صنعت کو اکھاڑ پچھاڑ کر تم کیا چین سے بیٹھ سکو گے۔ ایک ہنستا بستا شہر اجاڑ کر اس پورے علاقے کو ''سرکن و پرکن وہُپ کن و ہچ''..... میں بدل دیا گیا۔

کشتی سازی کی صنعت کے بارے میں عرض ہے کہ:

یہاں کے دست کار اپنے کام میں بہت ماہر ہوتے ہیں۔ انہیں مقامی لوگوں کے علاوہ ایران سے بھی کشتی بنانے کے آرڈر ملتے ہیں۔ یہ لوگ ہر طرح کی چھوٹی بڑی کشتی اور لانچ بنا سکتے ہیں۔ یہاں تک کہ 35 میٹر تک کی لمبائی والی دیوہیکل کشتی تک بھی۔ چوں کہ یہاں بجلی نہیں تھی، اس لیے سارا کام ہاتھ سے ہوتا تھا۔ جس میں محنت اور وقت دونوں بہت زیادہ لگتے تھے۔

پندرہ میٹر لمبائی کی لانچ تقریباً آٹھ ماہ میں بنتی ہے۔ بڑا استاد روزانہ چار سو روپے لیتا ہے۔ باقی دست کار ڈھائی تین سو روپے لیتے ہیں۔ لانچ پر کل لاگت تقریباً 25 سے 35 لاکھ روپے آتی ہے۔ صرف لکڑی پر دس لاکھ روپے لگتے ہیں۔ پانچ سلنڈر کا انجن آٹھ لاکھ کا پڑتا ہے۔ ایسی بڑی کشتی بنانے کے لیے باوقار اور قیمتی لکڑی ساگوان ہوتی ہے، جسے بلوچی میں (ساگ) کہتے ہیں۔ اسی طرح Biau نامی لکڑی بھی درآمد ہوتی ہے۔ یہ قیمتی لکڑی کالی کٹ، برما اور انڈونیشیا سے منگوائی جاتی ہے۔ ساگوان کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ بہت پائیدار ہوتی ہے اور ایک بار تیار ہو جائے تو

بہت عرصہ تک نہ یہ ٹیڑھی ہوتی ہے، نہ اس میں دراڑیں پڑتی ہیں اور نہ یہ گل سڑ جاتی ہے۔ بہت نرم لکڑی ہے اس لیے اسے تراشنے میں بہت مشقّت نہیں کرنی پڑتی۔ بہت لچک دار اور طاقت ور لکڑی ہوتی ہے۔(آرا مشین لگنے کے بعد اب کشتی سازی میں یہاں کی لکڑی بھی استعمال ہوتی ہے)۔

ایسی بڑی کشتی بنانے کے لیے ایک بڑے استاد (دستک کار) کی ضرورت پڑتی ہے۔ آٹھ سے دس دوسرے دست کار اور پانچ سے سات شاگردوں کی ضرورت ہوتی ہے، یعنی ایک کشتی بنانے کے لیے ایک پورا لشکر چاہیے ہوتا ہے۔ اور یہاں اس اوپن ائیر فیکٹری میں تو بہ یک وقت دس پندرہ لانچوں پر کام ہو رہا ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک میلہ لگا رہتا ہے۔ صرف پسنی میں 70 سے 80 ''استاد'' کشتی سازی میں مصروف ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق پسنی میں ہر سال 50 فٹ لمبائی کی بارہ لانچیں اور 20-30 فٹ لمبائی کی اسّی لانچیں بنتی ہیں۔

لکڑی کے کام کے بعد اس کی بیرونی سطح پر Cod Liver آئل (کاڈ مچھلی کا تیل) لگائی جاتی ہے تا کہ یہ واٹر پروف بن جائے۔ پہلے یہ لوگ شارک مچھلی کے جگر سے نکالے گئے تیل کو کشتی پر لگاتے تھے۔

ایک تعمیر شدہ کشتی کی اوسط عمر بیس برس ہوتی ہے۔

ان کی اندرونی آرائش بلوچ ذوق کی مکمّل نمائندہ ہوتی ہے۔ یہاں مغربی بلوچستان کے آخری سرے پر اگر کشتیوں کی رنگین گل کاری اور آرائش قابلِ دید ہوتی ہے تو بلوچستان کا مشرقی سرا یعنی ڈیرہ غازی خان ٹرکوں کی آرائش کا مشہور اڈہ ہے..... بلوچ، ایک آرٹسٹ قوم ہے۔

فشریز ڈیپارٹمنٹ میں اس وقت کل 7938 ماہی گیری کی کشتیاں رجسٹرڈ ہیں۔ یہاں چار مختلف قسم کی کشتیاں رجسٹر ہوتی ہیں: یکدار چھوٹی کشتی ہوتی ہے، جس کی لمبائی 5 سے 11 میٹر تک ہوتی ہے۔ رنچن (Ranchan) بھی یکدار جتنے سائز کی ہوتی ہے۔ Gill-Knitters درمیانہ سائز کی کشتیاں ہوتی ہیں اُن کے تلے (Keel) کی لمبائی نو سے چودہ میٹر ہوتی ہے۔ لانچ 12 سے 20 میٹر تلے لمبائی کی کشتیاں ہوتی ہیں۔ آج کل یکدار اور رنچن کم ہوتی جا رہی ہیں اور ماہی گیری بڑی

کشتیوں اور لانچوں سے ہوتی ہے جن میں انجن لگا ہوتا ہے اور جنہیں ''مشینی کشتیاں'' کہا جاتا ہے۔ inboard انجن لگی ہوئی کشتیوں کی تعداد اٹھارہ سو اکتیس ہے، جب کہ outboard انجنوں کی تعداد پانچ ہزار ایک سو چوالیس ہے۔ محض چند ہی کشتیوں پر قطب نما اور وائرلیس ٹرانسمیشن سسٹم لگا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہر سال کئی کشتیاں کھلے سمندر میں گم ہو جاتی ہیں۔

بڑی لانچ بنانے کا خرچہ تیس لاکھ روپے کے قریب ہے۔ کشتی بنانے کی لکڑی برما اور انڈونیشیا سے درآمد کی جاتی ہے۔ لکڑی کے کام کے بعد کشتی کو واٹر پروف بنانے کے لیے کاڈ لور آئل پینٹ کیا جاتا ہے۔ ایک کشتی کی زندگی تقریباً بیس برس ہوتی ہے۔

جیٹی

جیٹی، دو بڑی دنیاؤں کو ملانے والا پلیٹ فارم ہوتا ہے؛ دو مختلف ماحولیاتی ثقافتی اور معاشی دنیاوں کو ملانے والا پلیٹ فارم۔ ہفتوں تک سمندر میں در بدر رہنے کے بعد دو تین دن کے لیے جیٹی، ماہی گیر اور اس کی کشتی کو خشکی پر انسانی حیات کے کاروان میں شمولیت دلانے والی دلآویز جگہ ہوتی ہے۔ مگر دوسری طرف یہی وہ منحوس جگہ ہے جہاں انسانی معاشرہ کی سب سے بڑی برائی بھی شروع ہوتی ہے کہ یہیں پہ اس کی محنت کا ناترس استحصال ہوتا ہے۔ سرمایہ داری نظام کے ڈریکولا مچھیرے کی پیداوار کو سستے داموں ہتھیا کر اپنی چیزیں اس پر مہنگی فروخت کر دیتے ہیں۔ اور بھی ادائیں ہیں، ''قومی جمہوری انقلاب'' والی اس ''نیشنل بورژوازی'' کی جن کے ذریعے بلوچ ماہی گیر کے گھر کا چولہا سرد، اس کے کپڑے تار تار، اس کا بیٹا بے روزگار ہیروئنی، اور اس کی کمیونٹی کی کلچرل سطح پست رکھنے کے سامان ہوتے ہیں۔

شہر گوادر کے جنوب مشرق کی جانب ''دیمی زر'' میں خشکی کی طرف سے، گہرے کھلے سمندر کے اندر 65 میٹر چوڑا اور چار سو میٹر لمبا ایک مضبوط پلیٹ فارم تعمیر کیا گیا ہے، جسے جیٹی کہتے ہیں۔ اس پلیٹ فارم کے تینوں اطراف چوں کہ کھلا سمندر ہے، اس لیے تینوں اطراف سے کشتیاں آ کر کھڑی

ہوسکتی ہیں۔ گوادر کی جیٹی ہزار ہزار ٹن کے تین جہازوں، ایک سو ساٹھ Gill- Knitters اور چار سو چھوٹی کشتیوں کو لنگر انداز ہونے کی سہولتیں دے سکتی ہے۔ یہ جہاز اور کشتیاں اپنی پکڑی ہوئی مچھلی اس پلیٹ فارم پر اتارتی ہیں۔ یہیں پر تین ہزار مربع میٹر کا ایک ہال بنا ہوا ہے۔ وہاں اس مچھلی کو وزن کرنے کی سہولت موجود ہے۔ اس ہال میں دلال موجود ہوتے ہیں جو مچھلی خریدنے کی بولیاں دیتے ہیں اور ماہی گیر اپنی مچھلی فروخت کرتے ہیں۔ ماہی گیر شکار کی اپنی ضرورت کی چیزیں بھی یہاں سے حاصل کرتے ہیں۔ اسی پلیٹ فارم پر ایک ہزار مربع میٹر کا ایک شیڈ بھی ہے، جس میں مچھلی سٹور ہوتی ہے۔ اس مصنوعی پلیٹ فارم کے اوپر ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹرک، جیپیں اور کاریں دوڑتی رہتی ہیں مگر میلوں گہرے سمندر پر بنا ہوا یہ مضبوط پلیٹ فارم نہ گرتا ہے نہ جھول کھاتا ہے .....سرکار کی مرضی ہو تو گہرے سمندر کے اوپر بغیر ستون کے جیٹی بنا لیتا ہے۔ اور اگر مرضی نہ ہو تو بیچی دریا پر ایک پل تک نہیں بن سکتا۔ سائنس کو ہمیشہ انسان دوست لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

پسنی میں بھی ایشین ڈویلپمنٹ بنک کی طرف سے ایک فش ہاربر بنایا گیا ہے۔ یہ فش ہاربر اور فش ہینڈلنگ سنٹر 1989ء کے وسط میں مکمّل ہوگیا۔ اس کا رقبہ 16 ہیکٹرز ہے۔ اس پر ایک کارگو جیٹی ہے، تین برتھنگ جیٹی ہیں جن میں سے ہر ایک 100 میٹر لمبی ہے۔ ساٹھ میٹر لمبی یک ڈھلوانی جیٹی اور سو میٹر لمبی ایک لوڈا تارنے والی گھاٹ ہے۔ اس میں نیلامی کا ہال ہے اور سٹور کرنے والے سرد خانے کے چار کمرے ہیں۔

ماہی گیری میں کام کی تقسیم

اس استحصال کی تفصیل میں ہم ذرا دیر بعد جائیں گے۔ آیئے ذرا ماہی گیر کے لٹنے اور استحصال ہوجانے والے اولین مقام یعنی اس کی کشتی پر چلیں:

یہ ماہی گیری کی ایک لانچ ہے۔ میں اور میرا 'راہنما' علی بلوچ جیٹی کے ساتھ بندھی اس لانچ میں پھلانگ آتے ہیں.....ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ لانچ ماہی گیری کی بڑی کشتی ہوتی ہے جو بہت

مہنگی بنتی ہے۔ اور اس کا مالک بڑا سرمایہ دار ہوتا ہے۔ یہاں ایسے سرمایہ دار بھی ہیں جن کی پندرہ پندرہ، بیس بیس لانچیں ہیں (بلوچستان میں طبقات نہیں ہیں!!!!)۔

میں اور میرا علی جس لانچ پہ گئے، وہ افغان نامی شخص کی ملکیت تھا۔ اس پر تیرہ افراد کا عملہ ہے (ہر لانچ پر ماہی گیروں کی تعداد لانچ کی سائز پر منحصر ہوتی ہے)۔ بڑی لانچوں پہ بیس سے پچیس افراد بھی کام کرتے ہیں۔ جب کہ ماہی گیر کی عام کشتی پر چھ سے آٹھ افراد کام کرتے ہیں۔

مچھلی کے شکار کی مجموعی شکل ''سنگار'' کہلاتی ہے۔

لانچ پہ کام کرنے والے افراد کی تقسیم اس طرح ہے:

1-ناھدا (کپتان)

یہ تجربہ کار شخص ماہی گیری کے پورے آپریشن کا انچارج ہوتا ہے۔ یہ بڑا دریا نورد شخص، ماہی گیری کے مشن کی منصوبہ بندی کرتا ہے، اس کی نگرانی کرتا ہے اور کشتی، اوزار، اور عملے کا حتمی ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ موسم کے بارے میں اندازہ کرسکتا ہے اور طوفان وغیرہ جیسی مشکل صورت حال میں راہنمائی کرتا ہے۔ اُسے طوفان کی بہت پہچان ہوتی ہے۔ بہت حوصلہ مند یہ ناھدا طوفان میں لانچ کا سکّان (سٹیرنگ) خود سنبھالتا ہے۔ ناھدا ماہی گیری کے فن میں طاق اور پختہ ہوتا ہے۔

2-سارنگ (سرہنگ)

اسسٹنٹ کپتان ہوتا ہے۔ آگے آگے ہوتا ہے اور جال پھنکوا دیتا ہے۔ بہ وقتِ ضرورت وہ ناھدا کا کام بھی سنبھالتا ہے۔

3-ڈرائیور

لانچ چلاتا ہے۔

4-بانڈاری

یہ کشتی میں موجود محنت کشوں کے اِس کنبے کا مسلسل 25-20 دن تک باورچی ہوتا ہے۔

5-خلاصی

اسے ''جاں شو'' بھی کہتے ہیں اور ''ملاح'' کا لفظ بھی اس کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لانچ میں کم از کم آٹھ نو خلاصی ہوتے ہیں۔ سمندر میں ماہی گیری کی ساری مشقّت یہی لوگ کرتے ہیں۔ یہ جال پھینکتے ہیں، نکالتے ہیں، شکار کردہ مچھلی کو جال سے نکالتے ہیں۔ اس مچھلی کو نمک لگاتے ہیں، برف توڑتے ہیں اور مچھلی کو لانچ کے نچلے خانوں میں سٹور کرتے ہیں۔

'جاں شو' بہت مشقّت کرتے ہیں۔ جال ہر وقت مرمت مانگتا ہے، اس لیے کہ اس میں پھنسی ہوئی منہ زور مچھلیاں اپنی آزادی کی جدوجہد میں اسے پھاڑتی رہتی ہیں۔ پلاسٹک کے سرخ، سفید خوب صورت فٹ بال آپ کو اس کے جال پہ جگہ جگہ نظر آئیں گے۔ یہ بال سطح آب پر تیرتے رہتے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ وسیع سمندر میں جال ہے کہاں۔

خلاصی بلوچ ساحلوں کی آبادی کا 50 فیصد حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ یہ لوگ شام چار بجے جال پھینکتے ہیں اور رات کے تین بجے نکالتے ہیں۔ پھر اپنا شکار جال سے نکال کر نمک و برف لگا کر سٹور والے تہہ خانوں میں رکھتے ہیں۔ وہ جنگ و جدل کا شکار ہو جانے والے اس جال کی مرمت کرتے ہیں اور شام چار بجے پھر جال سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ روز کا یہی معمول رہتا ہے:

؎ ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات!

ماہی گیر کے لیے بلوچی زبان میں عمومی لفظ ''میڈ'' (Sea man) استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مچھلی پکڑنے والا۔ اسی لفظ سے یہاں گوادر میں ایک محلّہ آباد ہے جسے ''میداءنی، پاڑہ'' کہتے ہیں، یعنی ماہی گیروں کی بستی۔ یہاں کے مقامی باشندوں کے دیگر محلوں کے نام ہیں؛ کمان وارڈ، کولگری وارڈ، ملا بند وارڈ، شادو بند وارڈ، کوبن وارڈ، بلوچ وارڈ، ملا کریم بخش وارڈ، شیخ عمر وارڈ، اور، گزروان وارڈ، وغیرہ۔

ہمارے ان بلوچ محنت کشوں کے پاس ماہی گیری کی کوئی جدید سہولت نہیں ہے۔ ہمارے یہ گونڈل عملاً بے تیغ ہیں۔ یہ لوگ سمندر کے نبض شناس ہوتے ہیں۔ محض ستاروں کی مدد سے اپنا

پیداواری عمل بجالاتے ہیں حتیٰ کہ یہ افریقہ کے ساحلوں تک آتے جاتے ہیں..... یہی ہیں ہمارے ماہر فلکیات، ہمارے علمائے نجوم..... انہیں اپنے سمندروں سے اس قدر واقفیت ہے کہ محض تجربے کی بنا پر ان کو معلوم ہوتا ہے کہ سمندر کا کون سا علاقہ گہرا ہے، زیرِ زمین کہاں چٹانیں چُھپی ہوئی ہیں جہاں ان کی کشتی ٹکرا کر ٹوٹ سکتی ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کیچڑ اور دلدل والا علاقہ کون سا ہے۔ اور وہ زیرِ آب مچھلیوں کی قسم اور متوقع شکار کی تعداد کا ٹھیک اندازہ کر کے جال ڈال دیتے ہیں۔ (کتنا اچھا ہو، اگر انہی ماہی گیروں میں سے ایک پاکستان کا وزیر ماہی گیری ہو، ایک وزیر تجارت، ایک بحریہ کا سربراہ، اور ایک بلوچستان کا وزیر اعلیٰ)۔

جو ماہی گیر دوپہر کے بعد سے عصر کے وقت تک سمندر جاتے ہیں، اس وقت کا نام ''شب ریچ'' ہے۔ کانٹے ڈور کی مدد سے مچھلی پکڑنے کے کام کا نام ''چیران'' ہے۔ دستی جالوں کی مدد سے چھوٹی مچھلیوں کے شکار کا نام ''گند'' ہے۔ اسی طرح ''چیر آپ''، ''بندیگ''، ''جل''، ''برام'' اور ''کیگٹنا'' شکار کے مختلف طریقوں کے نام ہیں۔ مدگ پکڑنے کا موسم سرما ہے، تاہم گرمیوں میں بھی اس کا شکار ہوتا ہے۔

لانچ ایک ٹرپ میں تین سے چار ہزار مچھلیاں پکڑتی ہے۔ واپسی پہ جب یہ مچھلی جیٹی پر بولی کے ذریعے بکتی ہے تو حاصل شدہ رقم میں سے سفر کے سارے اخراجات نکالے جاتے ہیں۔ ان اخراجات میں ٹیکس، کمیشن، رشوت، جرمانہ، خوراک، مرمت اور ایندھن وغیرہ شامل ہیں۔ بقیہ جو رقم بچ جاتی ہے، وہ آدھی آدھی بانٹ دی جاتی ہے۔ آدھا تو سیدھا مالک لے جاتا ہے، بنا کسی محنت کے، بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے۔ محض اس لیے کہ اس کے پاس حلال حرام کا پیسہ تھا جس سے اس نے آلاتِ پیداوار (لانچ، جال انجن، و نیچ) خرید رکھے تھے۔

بقیہ آدھے حصے میں چار حصے ناخدا کے، ڈیڑھ حصہ سارنگ (سرہنگ) کا، ایک ایک حصہ ہر خلاصی کا اور ایک حصہ ڈرائیور کا ہو جاتا ہے۔

اختیارات کی بات کریں تو مالک سب کا مختار ہے۔ وہ ساری اسمبلی، پوری کابینہ یا کسی بھی

فرد کو برطرف کرسکتا ہے۔

ناہدا کو مالک ہی نکال سکتا ہے۔ سارنگ کو نکال دینے کا اختیار مالک کو بھی ہے اور ناہدا کو بھی۔ اور خلاصی کو سب نکال سکتے ہیں بغیر وجہ بتائے، بغیر چارج شیٹ کے، بغیر جواب طلبی اور انکوائری کے۔ جنگل میں تو چلتا ہی جنگل کا قانون ہے، شہر میں بھی جنگل کا قانون اور اب سمندر میں بھی جنگل کا قانون.....حضرتِ انسان، تجھے خدا عقل دے، حضرتِ بلوچ تجھے خدا سمجھائے۔

گوکہ عورتیں گوادر میں تو کھلے سمندر میں نہیں جاتیں مگر بحیرۂ بلوچ کی دیگر بندرگاہوں میں بلوچ عورتیں کھلے سمندر میں باقاعدہ ماہی گیری کرتی ہیں۔ (بلوچ میں صنفِ نازک کا بھونڈا تصور اب تک موجود نہیں ہے)۔

سمندر سے لانچ بیس پچیس دن بعد ساحل پہ واپس آتی ہے۔ دو چار دن مرمت، ایندھن، خوراک پانی لینے میں لگ جاتے ہیں اور یہی دو چار دن ماہی گیروں کی سوشل لائف کے ہوتے ہیں۔ ابھی بال بچوں سے ملنے بھی نہیں پاتے کہ پھر سمندر، پھر ماہی گیری، پھر مزدوری، مشقّت۔ زمینی دنیا میں انسانوں کی بستی میں محض چار دن؟۔ کسی کی فاتحہ، کسی کی شادی، تیمارداری..... کیا کچھ ہوسکتا ہے چار دنوں میں ؟۔ نہ آپ تصور کرسکتے ہیں اور نہ میں بیان کرپانے کا اہل ہوں۔

ہمارے ماہی گیروں کا بدترین استحصال سرمایہ دار کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔ ہمارے یہ خلاصی جو ناہدا کے بھی مقروض ہوتے ہیں اور مالک کے بھی، کشتی پر غلاموں کی طرح وابستہ رہتے ہیں۔ ایک کا قرضہ ادا کرنے اور وہاں سے جان چھڑانے کے لیے دوسرے کی کشتی پر خود کو بیچنا پڑتا ہے۔

''میڈ'' تو نچلے درجے کا شہری تصور ہوتا رہا ہے۔ آپ تو یقین نہیں کریں گے مگر سچ یہ ہے کہ میڈ اسی صف میں شامل کیے جاتے ہیں۔ میڈ جو روزی رساں ہیں، مشرق کے مخصوص ملاح ہیں، بے پرواہ اور لاابالے ہیں، مضبوط توانا، تڑنگے، اتھلیٹ جیسے ہٹے کٹے ہیں۔ ایسے اشراف المخلوق کو نچلی ذات کا سمجھا جاتا ہے جو سمندر میں بہت دیر تک رہنے کی قوت برداشت رکھتے ہیں، کسی بھی انسانی

نسل سے زیادہ۔ ان کے ہاتھ پتھر جیسے سخت اور بلوچستان جیسے کھردرے ہوتے ہیں۔

مکران میں جن دوسرے لوگوں کو کم ذات سمجھا جاتا رہا، ان میں درازدہ، لوڑی، اور غلاموں کی اولاد شامل ہیں، (بقول گزٹیر، مکران صفحہ نمبر 106)۔ دنیا کے ہر طبقاتی سماج کی طرح، بلوچ سماج میں بھی یہ بدذات، کمی، کمینے، اور نچلی ذاتیں کوئی نہ کوئی محنت مشقّت والا کام کرتے ہیں.....میڈ، ماہی گیری کا پاک اور حلال محنت کرتے ہیں۔ درزادہ بے زمین کسان، مزارع اور کھیت مزدور ہیں۔ لوڑی دست کار ہیں۔ اور غلاموں کی اولاد زرعی مزدوری کرتے ہیں یا گھروں میں کام کرتے ہیں۔

یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ دنیا بھر میں محنت کش لوگوں کو ہی کم ذات گردانا گیا ہے۔ مفت خور طبقات میں کبھی بھی کم ذات پیدا نہیں ہوتے۔

دوسری نچلی ذاتوں میں کسان ہیں جنہیں درزادہ یا نکیب کہتے ہیں۔ یہ لوگ ساحلی علاقے میں بھی رہتے ہیں اور اندرون بھی۔

پھر موسیقار ہیں، جنہیں لوڑی کہتے ہیں۔ یہ لوگ خانہ بدوش لوگ ہیں، پورے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ زمین پہ مستقل آباد ہیں، انہیں سرمستانڑیں (سرمست کی اولاد) اور زنگی شاہی کہا جاتا ہے۔ سارے لوڑی یا لوری یا تو ہینڈی کرافٹس میں مشغول ہیں (قالین، لوہار، سنار، موسیقار اور گلوکار، بڑھئی (دار تراش) لوہار (آسن کار)، سنار (زرگر)، ڈھول بجانے والے (دوھلی)، تاریخی کلاسیکی شاعری یاد رکھنے اور سنانے والا (پہلوان)۔

کل وقتی گھریلو کارکن جنہیں غلام کہا جاتا ہے۔ کھوجے بھی نچلی ذاتوں میں شمار ہوتے تھے۔ یہ ہول سیل سوداگر زیادہ تر ماہی کی تجارت کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ چٹائی، کپاس، پشم، خوراک وغیرہ کی درآمد برآمد کرتے ہیں۔ آغا خان کے ماننے والے ہیں۔ ان کا مذہبی پیشوا ''مُکھی'' کہلاتا ہے۔

ہندو بھی دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ یہاں وہ مسلمان کو [redacted] کہنے کا نخرہ نہیں کرسکتے۔ وہ غلام عورتوں سے شادی بھی کرلیتے تھے۔

بلوچستان میں ان نچلی ذاتوں کے ساتھ سماجی ناانصافیوں کا حال گزیٹیئر نے یوں تحریر کیا ہے:

۔یہ کسی عام بلوچ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں سکتے۔
۔حقیر سے حقیر بلوچ کی موجودگی میں بھی یہ حال حوال دے یا لے نہیں سکتے۔
۔عام بلوچوں کی لڑکی بیاہ نہیں سکتے۔
۔ان کا خون بہا، یا تو سرے سے ہوتا ہی نہیں، یا بہت ہی معمولی ہوا کرتا تھا۔

ہم بلوچ بہت زیادہ تیز رفتاری کے ساتھ غلط فہمیوں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ ہماری ایک غلط فہمی یہ ہے کہ مکران میں سرداری نظام ختم ہو چکا ہے اور لوگ اس سے اگلے معاشی سماجی نظام میں داخل ہو چکے ہیں، اس لیے وہ ہماری سیاسی راہنمائی کریں گے (سب سے پہلے یہ غلط فہمی خود مجھے ہوئی تھی)۔ ایسا نہیں ہے۔ ایک تو ماضی بڑا خوف ناک رہا ہے، وہاں کا۔ مکران میں ایک اور بدترین قسم کی برہمنی اور شودری موجود رہی۔ برہمن کا مکران میں بلوچی نام گچکی تھا۔ میں کہیں یہ پڑھ کر حیران ہوا کہ جب گچکی رشتہ داریاں کرتے تھے تو دلہن کو جو چیزیں دیتے تھے ان کی لسٹ یہ تھی: زمین اور پانی کے دو ہنگام کھجور کے درختوں کے ساتھ، پھر سونا۔ پھر اللہ آپ کا بھلا کرے، ''بندگ'' یعنی غلام جن میں شامل ہیں چھ دانے مرد اور چھ عدد عورتیں.....

.....اب وہ مشرقی اور وسطی بلوچستان سے سردار درآمد کر کے اپنا لیڈر بناتے ہیں۔

فیوڈل طبقاتی سماج پہ کیا فخر، کیا افتخار!

30

گوادر بندرگاہ

ماہی گیری کے علاوہ بھی ہمارے سمندر کا استعمال ہوتا رہا ہے۔ گوادر کے باشندے تو کبھی تبدیل نہ ہو سکے، البتہ ملکیت پاکستان کی 6 ستمبر 1958ء کو ہو گئی جب اس نے تین ملین پاؤنڈ اومان کو ادا کر دیے۔ گوادر کا ایک حصہ نیوی کے استعمال میں ہے۔ جیوانی تو سب کو معلوم ہے کہ دوسری عالمی جنگ میں ایک اہم ہوائی بحری چھاؤنی ہوا کرتا تھا۔

2002ء میں چین کے ساتھ ایک معاہدہ ہوا۔ پھر گوادر بندرگاہ کے پہلے فیز کا کام مکمّل ہونے کے بعد 20 مارچ 2007ء کو اس منصوبے کا افتتاح ہوا۔ چین کے فنی و مالی تعاون سے 16 ارب روپے کی لاگت سے تیار ہونے والی یہ بندرگاہ ایک معاہدے کے تحت پورٹ آف سنگاپور اتھارٹی کے حوالے کی گئی۔ اس کی گہرائی 14.5 میٹر اور چینل کی لمبائی 5 کلو میٹر ہے۔ جب کہ کثیر المقاصد 210 میٹر چوڑی تین برتھیں بھی تعمیر کی گئی ہیں۔ یہاں بڑے سے بڑا جہاز بھی لنگر انداز ہو سکتا ہے۔

پھر کوئٹہ اور اسلام آباد کے ''مافوق البشر'' دماغوں نے ایک اور ''جامع'' منصوبہ بنا ڈالا۔ گوادر میں ڈیپ سی پورٹ تعمیر کرنے کا۔ جو اُن کے بقول کراچی اور پورٹ قاسم کے بعد سب سے بڑی بندرگاہ ہو گی۔ ان کے اعلان کے مطابق یہ بندرگاہ وہ شاہ کار ہو گی جو کہ سری لنکا، بنگلہ دیش، اومان، متحدہ امارات، سعودی عربیہ، قطر، عراق اور ایران کے ساتھ تجارتی ٹریفک میں اہم کردار ادا

کرے گی۔ وہ اسے افغانستان سمیت خشکی میں گھری ہوئی بیچاری وسطی ایشیائی ریاستوں یعنی ازبکستان، تاجکستان، کرغیزستان، قازکستان، اور ترکمانستان تک اپنی تجارت، نظریات اور اثر رسوخ کی رسائی کا بھی ایک اہم ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ افسران، گوادر ڈیپ سی پورٹ پر کارگو کی عالمی معیار والی سہولتیں عطا کریں گے۔ اس پورٹ کے ساتھ انڈسٹریل زون اور ایکسپورٹ پراسیسنگ زون کے قیام، آئل سٹوریج اور ریفائننگ کی سہولتیں بھی ''اتریں'' گی جس سے بلوچستان کے سمندر اور ساحل پر ترقی کے دروازے کھل جائیں گے۔ گوادر ڈیپ سی پورٹ کے اس عرشی منصوبے کے تحت چار کثیر المقاصد برتھ اور پورٹ کی بنیادی ضرورتیں مہیا ہوں گی۔ حاکموں کی کس کس نیت پر شک نہ کیا جائے؟۔ بدبخت ''انشااللہ'' تک نہیں کہتے۔

مگر ایک سلسلہ اور بھی ہے۔ افغانستان، ترکمانستان اور پاکستان نے دولت آباد سے براستہ افغانستان گوادر تک 1500 میٹر طویل گیس پائپ لائن دوارب ڈالر سے تعمیر کرنے کا معاہدہ کر لیا ہے۔ (پھر بغیر وضو کے منصوبہ بنایا!!)۔

پھر 2003ء اور اس کے بعد گوادر ہی کا میگا پروجیکٹ بورژوا دانش وروں کی بحث کا موضوع بن گیا ہے۔ امیر امان اللہ خان سے لے کر ملا عمر تک اگر پشتون قوم کے لیے داڑھی مصیبت بن چکی ہے (اول الذکر نے داڑھی کاٹنے یعنی شیو کرنے کا حکم دے رکھا تھا۔ جب کہ طالبان والوں نے سو سال بعد داڑھی مکمّل طور پر چھوڑنے کا حکم دے رکھا تھا) تو گوادر ہم بلوچوں کے لیے ایک مصیبت بن چکا ہے۔ اس کو جوں کا توں بھی نہیں رکھا جا سکتا ہے مگر اس کی ترقی بھی دوسروں کے تونڈوں کا سامان کرے گی۔ پنجابی سامراجیت آئے نہ آئے نظر تو آتی ہی ہے۔ ایکڑوں مضامین اس کی تعمیر کے حق میں اور اس کی مخالفت میں لکھے گئے مگر ان میں دلیل، اعداد و شمار، نفع نقصان کسی بات کا تذکرہ نہیں۔ مقبولیت و پاپولسٹ بننا اہلِ قلم کے لیے ایڈز سے بھی بڑا ڈیتھ وارنٹ ہوتا ہے۔ بلکہ ایک دوست نے تو یہاں تک کہا کہ ان سیکڑوں مضامین لکھنے والوں میں 90 فیصد نے گوادر دیکھا تک نہیں۔

0.25 بلین ڈالر کی لاگت سے گہرے سمندر کا یہ میگا پورٹ پاک چین مشترکہ تعاون سے

بن رہا ہے۔ ''چائنا ہاربر انجینئرنگ کمپنی'' اسے تعمیر کر رہی ہے۔ کمپنی نے اپنا کام مارچ 2002ء کو شروع کیا تھا اور زور و شور سے کام جاری ہے۔ اس کمپنی کا دعویٰ ہے کہ 2004ء تک اس پروجیکٹ کو مکمّل کر دے گی۔ اس کی تعمیر کی ٹھیکہ دار کمپنی ''چائنا ہاربر انجینئرنگ کمپنی'' نے اپنا کام مارچ 2002ء کو شروع کیا تھا۔ چین والوں کا خیال ہے کہ ان کا ملک اس بندرگاہ سے مستفید ہونے والوں میں سب سے پہلے نمبر پر ہے اس لیے کہ چین اپنی مغربی بندرگاہوں سے مال گوادر بھیجا کرے گا۔ وجہ یہ ہے کہ اس کی مشرقی بندرگاہوں سے راستہ بہت لمبا پڑتا ہے۔

اس ڈیپ سی پورٹ کی تکمیل کے لے تین مرحلے بنائے گئے ہیں۔ پہلا مرحلہ چینی کمپنی کے بقول 2004ء میں مکمّل ہو جائے گا، جس میں تین کثیر المقاصد برتھوں کی تعمیر شامل ہے جن کی کل لمبائی 600 کلومیٹر ہوگی۔ (یعنی ہر ایک 200 میٹر کی)۔ اس کی تکمیل سے سرزمین بلوچستان کی گوادر بندرگاہ پر 50 ہزار DWT والے بحری جہازوں کی آمد و رفت ممکن ہو سکے گی۔

دوسرے مرحلے میں دو کنٹینر برتھ، Bulk کارگو ٹرمینل، Roll on /Roll off ٹرمینل، دو آئل Pires کی تعمیر شامل ہے۔(1)

ظاہر ہے اس میں بہت بڑے پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے پاور سپلائی، واٹر سپلائی، آگ بجھانے کی بڑی مشینری، ماحولیاتی تحفّظ کا پروجیکٹ، ٹیلی کمیونی کیشن، کمپیوٹرائزڈ مراکز کی موجودگی، تیل گیس اور پیٹرو کیمیکل ترقی، پراسسنگ زون، صنعتی علاقوں، رہائشی علاقوں کی موجودگی اولین شرط ہے۔ (سرمایہ داری نظام اور ماحول کا دیکھ بھال؟۔ چین اور ماحولیاتی ماحول کا خیال؟ لاحول ولاقوت!)۔

ماہی گیری کا جال

ماہی گیری کے گیئر میں جال، نائلون کی رسیاں، Floats اور Winch ہوتے ہیں۔ جال مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ زیادہ تر جو جال استعمال ہوتے ہیں، ان کی لمبائی 17 میٹر، چوڑائی تین میٹر اور وزن 40 کلوگرام ہوتا ہے۔ Floats ہر دو میٹر کی لمبائی پر فٹ کیے جاتے ہیں۔ عموماً جال اور

Float کوریا، جاپان اور تائیوان سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ مگر کچھ کراچی میں بھی بنائے جاتے ہیں۔ جال کی قیمت وزن پر ہوتی ہے اور یہ 200 سے لے کر 650 روپے فی کلوگرام تک بکتا ہے۔ Floats، 30 سے 45 روپے فی ٹکڑا کے حساب سے ملتا ہے اور نائلون کی رسی 125 روپے فی کلوگرام۔ پرانے جال کی مرمت پر 150 روپے یومیہ مزدوری دی جاتی ہے اور اس کی مکمّل مرمت میں چھ دن لگتے ہیں۔ جال کی مرمت کا کام عورتیں گھروں میں بھی کرتی ہیں۔

اس فیکٹری کے ساتھ ہی جال بُننے والے ڈیرہ لگائے ہوئے ہیں۔ یہاں زیادہ تر ستر ہ میٹر لمبے اور تین میٹر چوڑے جال استعمال ہوتے ہیں۔ جن کا وزن 40 کلوگرام ہوتا ہے۔ لیکن جالوں کی لمبائی چھ سو میٹر تک بھی ہوسکتی ہے۔ Floats (لکڑی یا دوسرے ہلکے مواد کا ٹکڑا جو جال کو تیرتے رہنے میں مدد دیتے ہیں) ہر دو میٹر پر لگائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر جال اور Floats کوریا، جاپان اور تائیوان سے درآمد کیے جاتے ہیں۔ کچھ کراچی میں بھی بنتے ہیں۔ جال کی قیمت سائز پر نہیں بلکہ وزن کے حساب سے مقرر ہوتی ہے۔ یہ 200 روپے سے لے کر 650 روپے فی کلوگرام تک ہوتی ہے۔ Floats تیس سے 45 روپے فی دانہ ہوتا ہے اور نائیلون رسی 125 روپے فی کلوگرام ہوتا ہے (جال، نائیلون کی رسیاں، Floats اور ونچ (Winch) سب کو ملا کر فشنگ گیئر کہتے ہیں)۔

نائیلون کے جال چھوٹی کشتیوں میں استعمال ہوتے ہیں جب کہ بڑی لانچوں میں دھاگے کے جال استعمال ہوتے ہیں جو کہ زیادہ مضبوط اور دیرپا ہوتے ہیں۔ جال میں سوراخ کا سائز، مچھلی کی قسم پر منحصر ہوتا ہے۔ مقامی طور پر سائز ہاتھ کی انگلیوں سے ناپا جاتا ہے اور یہ دو سے پانچ انگلیوں تک ہوتا ہے۔ دھاگے والے جال (بلوچی میں ماہور) جھینگا کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جھینگا کو بلوچی میں ''مدگ'' اور انگریزی میں Prawn کہتے ہیں جو کہ بلوچستان کے ساحل میں بہت اچھا ملتا ہے۔ یہاں دو دو گراٹ (بالشت) لمبا مدگ (جھینگا) ہوتا ہے۔ ایک ماہور بیس سے لے کر چالیس ''کندو'' کا ہوتا ہے اور ایک کندو 160 ''گام'' کا ہوتا ہے۔

اب ایک نیا جال آیا ہے، پلاسٹک کا۔ اس میں سوراخ بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ یہ بہت

ظالم جال ہوتا ہے، جس سے ماہی کی پوری نسل تباہ ہوتی ہے۔

جوں جوں جال پرانا ہوتا جاتا ہے، اتنا زیادہ مرمت مانگتا ہے۔ مرمت والا مزدور 150 روپے روزانہ معاوضہ پر ملتا ہے۔ مرمت میں اوسطاً چھ دن لگتے ہیں۔ عورتیں گھروں میں مرمت کا کام کرتی ہیں۔ (اور بہت زیادہ کرتی ہیں، جس کا حساب بہرحال لگانا چاہیے)۔

گوادر کے دیمی زر کے تیاب (ساحل) پر جال بنانے میں استعمال ہونے والے دھاگے کا ایک چرخہ موجود ہے۔ اس کا استاد، رمضان ہے.....خضاب لگایا ہوا، تروتازہ بوڑھا۔ جوانی کے قصے بڑے مزے لے لے کر (اور نمک مرچ لگا لگا کر) کر بیان کرتا ہے۔ انسان کی تاریخ میں سے اگر اُس کے جوانی کے قصے نکال دیے جائیں تو باقی کیا رہ جائے گا۔ وہاڑی کا پینٹھا کدو!!

یہ اپنی طرز کا واحد چرخہ ہے۔ آج کی مشینی دھاگہ سازی نے ہماری یہ قدیم مقامی صنعت تباہ کردی۔ اس بہت بڑے چرخے پر تین افراد کا کام کرتے ہیں۔ یہ تینوں افراد دن میں تقریباً 100 روپے تک کما لیتے ہیں۔ خام مال (مِلک) دوسروں کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ دھاگے کو وٹ دیتے ہیں، اسے موٹا اور مضبوط بناتے ہیں۔ یہ تین دھاگوں کو بل دے دے کر ایک دھاگہ بنا لیتے ہیں، ایک آلہ ہاتھ میں رکھ کر جسے ''مھرگ'' کہتے ہیں۔

کراچی کا سامراجی کردار

مچھلی کی اس فصل سے خود ہمیں مستفید ہونے کے مواقع بہت کم ہیں۔ ہماری مچھلی کا زیادہ حصہ کراچی میں موجود ماہی گیری کی صنعت لے جاتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں بلوچستان کے ساحل کے وسائل کو کراچی لوٹ لیتا ہے۔ پیسہ بھی کراچی کے پاس زیادہ ہے، سائنسی سہولیات اور ٹیکنالوجی بھی اسے نصیب ہے۔ ہماری روایتی کشتیاں اور اس پر مچھلی پکڑنے کے اوزار سب کے سب فرسودہ ہیں۔ بلوچستان بھر میں ایک بھی ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ایسا نہیں ہے، جہاں ماہی گیری کی تربیت دی جاسکے۔ ہماری پکڑی ہوئی تازہ مچھلی بھی کراچی بھیجی جاتی ہے۔ اور خشک ماہی سیلون، سنگاپور اور ہانگ

کا نگ چلی جاتی ہے۔ہم جس جال سے مچھلی پکڑتے ہیں اس کی کل عمر ڈیڑھ برس ہوتی ہے۔اس کی مرمت کے لیے دھاگہ تک کراچی سے لانا پڑتا ہے۔

گڈانی صدیوں تک بلوچستان کے ایک عمدہ ساحل کے بطور مشہور رہا ہے۔یہ ماہی گیری والا ایک گاؤں تھا جہاں ہزاروں ماہی گیر اپنی فرسودہ کشتیوں سے ماہی گیری کرتے رہے۔تاریخی دستاویزات کے مطابق ریاست لسبیلہ کے حکمران گڈانی کے ساحل سے سالانہ 2850 روپیہ بطور ریونیو لیتے تھے۔یہ سلسلہ برطانوی سامراج کے بلوچستان پر مکمّل قبضہ تک جاری رہا۔

ماہی گیری قومی آمدنی میں زبردست امکانات رکھنے والا شعبہ ہے۔ماہی برآمدی اشیا میں ایک اہم ترین کماڈٹی ہے اور خوب زرِمبادلہ دیتی ہے۔ضلع لسبیلہ میں 1996ء میں مچھلی کی پیداوار 15,771 میٹرک ٹن تھی،جس کی مالیت تقریباً 2 ارب روپے ہوتی تھی۔

13 دسمبر 1997ء کے روزنامہ 'ڈان' کے مطابق ماہی گیروں نے بلوچستان کے ساحلوں پر کراچی کے ٹرالروں اور لانچوں کے ذریعے کی جانے والی غیر قانونی ماہی گیری پر فوری پابندی لگانے کا مطالبہ کیا۔ماہی گیروں کے مطابق کراچی کے یہ مشینی ٹرالر اور ماہی گیری کے جہاز گہرائی میں جاتے ہیں۔اور وہاں ماہی گیری کے لیے وائر سے بنے ہوئے جال استعمال کرتے ہیں۔اس سے بلوچستان کے ماہی گیروں کی روزی اور گزارہ ختم ہوجاتا ہے۔

ماہی گیروں نے انکشاف کیا کہ بلوچستان کی صوبائی حکومت اس کاروبار میں مکمّل طور پر شریک ہے۔ان کے مطابق ٹرالروں کی مدد کرنے پر بلوچستان کے افسروں اور وزیروں کو فی لانچ تیس ہزار روپیہ ہر ماہ رشوت ملتی ہے۔اور غیر قانونی طور پر کام کرنے والے لانچوں کی تعداد چار سو ہے۔

خود کراچی میں سامراج کیا گیا گل کھلاتا ہے،آیئے دیکھیں:

کراچی میں مچھلی بندر کی تعمیر کے لیے 1955ء میں امریکہ نے 4 لاکھ 72 ہزار ڈالر کا ''عطیہ'' دیا۔اس بندر پر مچھلی اتارنے کے لیے ایک جدید جیٹی،ایک برف خانہ،مچھلی کو حفاظت سے سٹور کرنے کے لیے ایک سرد گودام اور ماہی گیروں کی کوآپریٹو سوسائٹی،مچھلیوں کی تحقیق گاہ اور

ریستوران کے لیے عمارتیں تعمیر کی گئیں۔جدید ٹرالر درآمد کیے گئے اور کچھ پرانی کشتیوں میں موٹریں لگا دی گئیں۔جدید قسم کے جال اور ان کو بننے کا سامنا باہر سے منگوایا گیا۔نجی سرمایہ داروں نے مچھلی بندر پر مچھلی اور جھینگے کو جمانے کے لیے فریزنگ پلانٹ اور ڈبوں میں پیک کرنے کے لیے کیننگ پلانٹ تعمیر کیے۔اس طرح سے کم وبیش مقامی بازار کی ضرورت پر منحصر چھوٹے پیمانے کی ماہی گیری کو بہت جلد بڑی،جدید اور برآمدی صنعت میں تبدیل کر دیا گیا۔حکومت پاکستان نے 1988ء سے ماہی گیری کا لائسنس کوریا کے ٹرالرز کو دے رکھا ہے۔صرف ایک ٹرالر 12x3 کلومیٹر کے علاقے کی ساری مچھلی کو پکڑ ڈالنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔اور آج 150 غیر ملکی ٹرالرز کو ہمارے پانیوں میں ماہی گیری کے لائسنس حاصل ہیں۔

اس تبدیلی نے چھوٹے غریب ماہی گیروں کو تباہ کر کے رکھ دیا،کیوں کہ وہ جدید ٹرالروں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔نئے ذرائع پیداوار (یعنی سرد خانوں اور ٹرالروں) کے مالک نہ صرف پچھلے مالکان ذرائع پیداوار سے زیادہ امیر اور اثر ورسوخ رکھنے والے تھے بلکہ وہ مختلف لسانی گروہوں سے تعلّق رکھتے تھے۔

روایتی طور پر کراچی اور ساحل بلوچستان کے مچھلی کے تاجر زیادہ تر اسماعیلی خوجہ اور بلوچ ہوا کرتے تھے۔اور ماہی گیر بلوچ،کچھی اور دوسرے سندھی ہوا کرتے تھے۔مچھلی بندر کے قیام کے بعد ماہی گیروں کی لسانی ترکیب میں تو کوئی فرق پیدا نہ ہوا البتہ ماہی گیری کے آلاتِ پیداوار میں سے بلوچ آؤٹ ہو گئے اور اب زیادہ تر پنجابی،گجراتی اور اردو بولنے والے مہاجروں نے ان پر قبضہ جما لیا۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے کہ بلوچستان میں ماہی گیری کے مراکز یعنی پسنی،گوادر،اور ماڑہ اور گڈانی کے ماہی گیروں کی پکڑی ہوئی مچھلی یا تو کراچی کے سرد خانوں کو بھجوا دی جاتی ہے یا پھر بیچ سمندر میں ایرانی تاجروں کو فروخت کر دی جاتی ہے۔ان دونوں اسباب کی وجہ سے ساحل بلوچستان پر جھینگا اور دیگر قیمتی مچھلی یا تو بالکل دستیاب نہیں یا پھر ان کی قیمتیں اتنی گراں ہو گئیں کہ عام آدمی کی پہنچ سے باہر ہیں۔

ماہی گیری میں طبقاتی تقسیم

بلوچستان میں ماہی گیری کی صنعت میں طبقاتی تقسیم اس طرح ہے:

1- غیر حاضر مالک (تاجر)

یہ کراچی میں آباد ہے جو ساحلِ مکران کی مچھلی کی تجارت پہ اجارہ دار ہے۔ یہ نہ صرف مچھلی ٹریڈ کو کنٹرول کرتا ہے بلکہ کشتی اور جال جیسے ذرائع پیداوار کا مالک بھی ہے۔ لمبی کشتیوں (40-60 فٹ) میں سے 45 فیصد انہی غیر حاضر سرمایہ داروں کی ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی کشتیاں جال سمیت یا جال کے بغیر ناہداؤں (کیپٹن) کو لیز پر دیتے ہیں۔ جب جال بھی مالک مہیا کرے تو ناہدا اور اس کے آدمی پکڑی ہوئی مچھلی کا تیسرا حصہ لیتے ہیں اور مالک دو تہائی لے جاتا ہے۔ اگر جال ناہدا کا اپنا ہو تو پکڑی ہوئی مچھلی میں ایک تہائی مالک، ایک تہائی ناہدا، ایک تہائی جال وغیرہ کا (جو کہ ناہدا کو ملتا ہے) اور باقی عملہ میں تقسیم ہوتا ہے۔

غیر حاضر سوداگر مچھلی کے ساتھ ساتھ علاقے میں اناج کی تجارت کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔

2- مقامی جنٹری

یہ اورماڑہ اور گوادر کے کھوجے ہیں مگر اس طبقے میں کچھ ''میڈ'' بھی شامل ہیں۔ کھوجے (اسمعیلیوں کا مقامی نام ہے) بلوچ سواحل کے ساتھ ساتھ آباد ہیں۔ تاجر پیشہ ہیں اور بڑی بڑی کشتیوں کے مالک رہے ہیں۔ یہ لوگ تعداد میں تو بہت کم رہے، مگر دولت منداور با اثر رہے۔ یہ دیگر مقامی قبائل سے خود کو الگ تھلگ رکھتے ہیں۔ مقامی طور پر یہ بہت طاقت ور طبقہ ہے اور آلاتِ پیداوار کا ایک اچھا خاصا حصہ ان کی ملکیت ہے۔ مگر انہیں یہ حیثیت غیر حاضر مالک کے ایجنٹ ہونے کی وجہ سے حاصل ہے۔ وہ یہ ایجنٹی مسلسل کرتے ہیں اور اس سے منافع کماتے ہیں۔ یہ طبقہ مندرجہ ذیل طریقے سے استحصال کرتا ہے۔

i۔ مالک کی حیثیت سے:۔ ماقی ماندہ بڑی کشتیاں اس طبقے کی ملکیت ہوتی ہیں۔ یہ لوگ

مچھیروں کو بٹائی کے مندرجہ بالا فارمولا کے تحت کشتیاں لیز کرتے ہیں۔

ii۔ نائب کی حیثیت سے:۔ وہ غیر حاضر کشتی مالکان کے مفادات کی نگرانی کرتے ہیں اور اس سے مسلسل معاوضہ لیتے رہتے ہیں۔

iii۔ کمیشن ایجنٹ کی حیثیت سے:۔ وہ غیر حاضر تاجروں اور کراچی فریزنگ پلانٹس کے لیے خریداروں کا کام کرتے ہیں۔ پکڑی ہوئی ساری مچھلی خریدتے ہیں۔ ان کا کمیشن (جسے 'کاردی' کہتے ہیں) قدر کا ساڑھے بارہ فیصد ہوتا ہے۔

iv۔ تاجر اور ٹھیکیدار کی حیثیت سے:۔ بنیادی ضرورت کی اشیا سپلائی کرنے والی مقامی دکانیں اسی طبقے کے افراد کی ہیں۔ علاوہ ازیں یہ لوگ چھوٹے ماہی گیروں کی ساری ماہی گیری کی ضرورتیں سپلائی کرتے ہیں اور حکومت سے مقامی سپلائی اور تعمیرات کے چھوٹے موٹے ٹھیکے لیتے ہیں۔

جنٹری اپنے بچے کراچی اور حیدر آباد کے تعلیمی اداروں میں بھیجتی ہے اور مقامی سیاست کو بھی کنٹرول کرتی ہے۔

3- چھوٹے ٹھیکیدار

اس طبقے میں کم قیمت والی مچھلی کے کاروباری شامل ہیں۔ ان کے پاس عموماً ایک چھوٹی کشتی (35-40 فٹ) ہوتی ہے۔ وہ اپنی کشتی جال کے بغیر لیز کرتے ہیں اور پکڑی ہوئی مچھلی کا آدھا حصہ لے جاتے ہیں۔

4- چھوٹے مالک ماہی گیر

عام لوگ ہیں۔ میڈ ہیں جو کہ ماہی گیری کو خاندانی کام کی حیثیت سے سنبھالتے ہیں۔ ان میں جو لوگ معاشی طور پر بہتر ہوتے ہیں، وہ درمیانے درجے کی کشتیوں (40-45 فٹ) کے مالک ہوتے ہیں۔ یہ لوگ گہرے سمندر میں بھی ماہی گیری کے لیے جاتے ہیں۔ مگر یہ لوگ ایجنٹوں کے ساتھ بھی بندھے ہوتے ہیں جو انہیں مچھلی کو محفوظ کرنے کے لیے نمک مہیا کرتے ہیں۔ جس کے عوض انہیں اسی ایجنٹ کی مرضی کی قیمت پر اپنی مچھلی فروخت کرنی پڑتی ہے۔

ان کی مچھلی زیادہ تر مقامی طور پر بک جاتی ہے اور اگر شرمپ ہو تو برآمد کے لیے ایجنٹ اسے خرید لیتا ہے۔ یہ لوگ عموماً غریب ہوتے ہیں۔ ان کی آمدنی ماہی گیری کے موسم کے بعد دیر تک نہیں چلتی۔ غربت، بوریت اور فرسٹریشن کے طویل دورانیہ میں وہ جوابازی، رنڈی بازی، بچہ بازی اور نشہ کرتے ہیں۔ انہیں قرض لینا پڑتا ہے۔ حتیٰ کہ اپنا جال اور کشتی رہن رکھنا پڑتے ہیں۔ اور ماہی گیری کے موسم میں اپنی مچھلی سستی فروخت کرنی پڑتی ہے۔۔ یہی دائرہ چلتا رہتا ہے۔

5-ماہی گیر (مزدور)

بلوچستان میں کل وقتی ماہی گیروں کی تعداد اڑتیس ہزار تین سو ستتر ہے۔ جب کہ جز وقتی مزدور تیرہ ہزار پانچ سو اٹھانوے ہیں۔ اسی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق کبھی کبھی کی ماہی گیری کرنے والے میدوں کی تعداد چھ ہزار ایک سو سے، یوں میدوں کی کل تعداد اٹھاون ہزار پچھتر ہے۔

ان میں وہ مزدور بھی شامل ہیں جنہیں سمندر میں ماہی پکڑنے جانا ہوتا ہے، اور وہ بھی ہیں جنہیں ساحل پر کام کرنا پڑتا ہے۔ ایسے مزدور بھی اس زمرے میں شامل ہیں جنہیں دونوں کام کرنا ہوتے ہیں۔

ایک کشتی کے عملے میں ایک ناہدا (کیپٹن) ہوتا ہے اور کئی جاں شو (مزدور) ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد کشتی کی سائز کے مطابق ہوتی ہے۔

ناہدا ماہی گیری کے سارے عمل کا انچارج ہوتا ہے۔ وہ ماہی گیری کے مشن کی منصوبہ بندی کرتا ہے، اس کی نگرانی کرتا ہے اور کشتی، اوزار اور عملے کا حتمی ذمہ دار ہوتا ہے۔ اگر کشتی اس کی اپنی ہو تو وہ مالک بن جاتا ہے۔ اس کے پاس لیز پر لی ہوئی کشتی بھی ہو سکتی ہے۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ کشتی پرائی ہو اور جال اس کا اپنا ہو۔ اس طرح اس کی حیثیت متنوع ہوتی ہے۔

عموماً ایسا ہوتا ہے کہ اس نے کشتی اور جال لیز پر لیے ہوتے ہیں اور وہ مزدوروں کو کرائے پر بھرتی کرتا ہے۔ اس طرح وہ اجارے پر کرایہ دار کاشت کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ مالک کے ساتھ پکڑی گئی مچھلی کا اسی طرح حصہ دار ہوتا ہے جس طرح کہ اجارہ دار کاشت کار لینڈ لارڈ کے ساتھ ہوتا

ہے۔ ناہدا پکڑی کی گئی مچھلی میں مچھیروں کے حصے کا 60 فیصد لے لیتا ہے جو ٹوٹل پکڑی گئی نصف مچھلی کا نصف یا تہائی ہوتا ہے۔

ایک کشتی پر دو یا تین جاں شو ہوتے ہیں۔ وہ جال پھینکتے ہیں اور کھینچتے ہیں، مچھلی کو نمک لگاتے ہیں، کھانا پکاتے ہیں اور کشتی کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ ان کا حصہ فی کس 4 فیصد ہوتا ہے۔

اگر غور سے دیکھیں تو جاں شو کا دوہرا استحصال ہوتا ہے۔ ناہدا تو ڈائریکٹ اس کا استحصال کرتا ہے اور مالک بالواسطہ طور پر۔ جاں شو ناہدا کے بھی مقروض ہوتے ہیں، مالک کے بھی اور ایجنٹ کے بھی۔ یہ کشتی پر غلاموں کی طرح وابستہ ہوتے ہیں۔ سیزن نہیں ہوتا تو ان کی سماجی معاشی حالت پستی کی گہرائی تک گر جاتی ہے۔ نشہ، اور دیگر ساری برائیاں ان میں جڑ کر لیتی ہیں۔

جب کشتی ساحل پر آتی ہے تو ایک اور طرح کے مچھیرے یعنی فش یارڈ مزدور، کام سنبھالتے ہیں۔ وہ مچھلی اتارتے ہیں، صاف کرتے ہیں، چیرتے ہیں، نمک لگاتے ہیں، سٹور کرتے ہیں، خشک کرتے ہیں اور تول کر پیک کرتے ہیں۔ انہیں یومیہ اجرت دی جاتی ہے۔

6۔حمال (مزدور، قلی)

یہ لوگ گردن گردن پانی میں کشتی سے خوراک اور دوسری چیزیں اپنے سروں پر اٹھا کر اتارتے ہیں۔ حمال جمادار کی نگرانی میں کام کرتے ہیں اور تاجر سے بوری کے حساب سے معاوضہ لیتے ہیں۔ جمادار بڑا کمیشن رکھ کر حمال (پورٹر) کو حقیر سی رقم دے دیتا ہے۔

ماہی گیروں کی صحت کے مسائل

ماہی گیروں کو مچھلی کی سڑاند میں رہ کر کام کرنا پڑتا ہے۔ کام کی جگہ پہ بدبو بہت ہوتی ہے۔ جس سے سانس لینے میں دشواری ہوتی ہے۔ اس بدبودار فضا میں رہتے ہوئے اسے الٹیاں بہت آتی ہیں۔ ماہی گیری میں استعمال ہونے والی امونیا گیس سے مزدور کی صحت متاثر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ماسک، دستانے اور فل سائز جوتے نہ ہونے کی وجہ سے مزدور مچھلیوں اور جھینگوں کی صفائی

کرتے ہیں تو کانٹے لگنے سے ہاتھ اور انگلیاں زخمی ہو جاتی ہیں اور مستقل کام کرتے رہنے کی وجہ سے زخم کو ٹھیک ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ علاوہ ازیں مزدور کے ہاتھ مستقل طور پر ٹھنڈے پانی میں رہتے ہیں، اس لیے زخم بھرتا نہیں اور ناخن بھی خراب ہوتے ہیں۔

سر درد، کمر کا درد اور جوڑوں کا درد بھی ماہی گیروں کے مستقل ساتھی ہیں۔ غربت کی وجہ سے ذہنی ونفسیاتی بیماریاں عام ہیں اور بلوچستان کے ماہی گیر کو شراب اور ہیروئن کا منظّم طور پر عادی بنا دیا گیا ہے، جس سے جنم لینے والی سماجی خرابیاں بے شمار ہیں۔

شام ڈھلے مکران بھر کے کرتوت بدل جاتے ہیں۔ لوگ اپنا سارا غصہ، ساری فرسٹریشن، سارے غم اور سارے تفکّرات تلخ مشروب میں ڈبو دیتے ہیں۔ ہم کمپیوٹر سمگل نہیں کرتے، الیکٹرومیڈیکل آلات کی گریزی نہیں کرتے، فارمولے اور ٹیکنالوجی درآمد نہیں کرتے، لاتے ہیں تو بس شراب لاتے ہیں۔ لہٰذا لانے والے لاتے ہیں اور پینے والے پیتے ہیں۔ ہر دو فریق کنجوسی نہیں کرتے۔ یہاں نہ ''حسبِ توقع'' کا لفظ معنی رکھتا ہے نہ ''حسبِ طاقت'' اور نہ ہی ''حسبِ اِستطاعت''۔ کارِ ''خیر'' میں کیا حد، کیا سرحد!!۔ سب حافؔظ و خیامؔ و اقبالؔ کا مسنون راستے اپناتے ہیں۔ (اسی لیے تو پنکج اُداس خان کی غزلیں مشہور ہیں، جہاں گویا سمتیں دو ہی بنائی ہیں بنانے والے نے: یا میکدہ یا پھر 'اُس' کا گھر۔) میرے میزبانوں کے اندازے کے مطابق 70 فیصد بالغ (عقلاً نہیں) مرد شراب پیتے ہیں۔ البتہ پیتے انگریزی شراب ہیں۔ ٹنکچر، شنکچر اور کیکر کا ٹھرا کوئی نہیں پیتا۔ اور چھ پرسنٹی ''شراب'' بھی نہیں چلتی یہاں۔ 45 فیصد اور اس کے اوپر کی بات کرو۔ سستا، خالص اور خوب صورت لیبل۔ بوتل کی خوب صورت ساخت ہی دیکھ کر نشہ ہو جاتا ہے۔ کم بخت انگریز بناتے ہیں ہم نادیدوں کو بے کار کرنے کے لیے۔ بوتل، ڈھکنا اور لیبل کی خوب صورتی دیکھ کر شراب کیا بوتل کھا جانے کو من للچائے!۔ اور یہاں مکران کے اندر محفل میں جو شخص کہے ''میں نہیں پیتا''، تو حاضرین وناظرین حیرت کے انگشت دہن میں ڈالے اُسے تعصّب میں گھورتے ہیں۔ جیسے کسی پنجابی نے صوبائی خود مختاری کے حق میں بات کی ہو!۔

ماہی گیر چرس نوشی کا شغل بھی بھی کرتے ہیں۔ وہ چرس کے بڑے بڑے ٹکڑے جیب میں

ڈال کر ماہی گیری کرنے کھلے سمندر میں جاتے ہیں اور وہاں۔ شکار بہت صبر آزما مشقّت ہوتا ہے اور اِن لوگوں کا خیال ہے کہ چرس بہت صابر (یاSober!!) بنا ڈالتا ہے آدمی کو۔ چرس چرسیوں کے بقول کام کے لیے قوتِ برداشت کو بڑھا دیتا ہے۔ ٹرانسپورٹ سے وابستہ محنت کشوں (ٹرک ڈرائیورز) کا ایک بڑا حصہ چرس استعمال کرتا ہے اور اس کے فائدے گنواتے گنواتے وہ ذہنی صلاحیتوں کے دریچے کھلوانے کی چابی کی حیثیت سے اس کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ فزکس میں ایک نوبل انعام پانے والے عظیم سائنس دان نے مادہ کے بارے میں اپنا نیا تصور پیش ہی اُس وقت کیا جب وہ چار برس تک ہپیوں کے ساتھ رہا تھا، انہی کے ''شغل اشغال'' اختیار کیے تھے اور وہیں اس کا دماغ تندرست وتوانا ہوا اور وہیں اس پہ نئے تفکّر کا الہام ہوا اور اس نے نوبل والا انعام چھین لیا تھا۔

شراب اور چرس کے علاوہ پان کا استعمال بھی بڑے پیمانے پر ہوتا ہے۔ مرد جوانوں میں سے 80 فیصد لوگ پان کھاتے ہیں۔ غالب گمان یہ ہے کہ یہ مرض کراچی سے یہاں آیا اور اب بھی اس کا سارا مال واسباب وہیں سے آتا ہے۔ تمبا کو ملا ہوا پان تین روپے کا آتا ہے۔ گھٹکا نامی پان تین روپے میں چھوٹا، اور پانچ روپے میں بڑا آتا ہے۔ اس میں سوپاری، چونا، کتھا اور تمباکو شامل کیا جاتا ہے۔ ہر شخص روزانہ اوسطاً چار سے پانچ پان کھا لیتا ہے (بلکہ IDSP کے ایک سروے نے مجھے ہلا کر رکھ دیا، جس کے مطابق سومیانی میں ایک شخص روزانہ اوسطاً 50 پان کھاتا ہے۔ پناہ رب العزت!)۔

اور اگر گھر میں چار پانچ افراد اس کے عادی ہوں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بلوچ، غریب نہ ہو تو کیا ہو؟۔ بلوچ معیشت کو تو پہلے ہی ''بال چڑ'' کا مرض لگا ہوا ہے۔

یہاں 20 فیصد مسمات بھی پان کھاتی ہیں۔ اکثر عورتیں چلم پیتی ہیں۔ بوڑھی عورتوں میں نسوار خواری کا رواج بھی خال خال موجود ہے۔

محکمہ صحت

محکمہ صحت کا حال معلوم کرنا چاہا اور DHO کے دفتر چلے گئے۔ یہ ڈاکٹر نذیر بلوچ ہے،

مہمان نواز، فہمیدہ اور جہاں دیدہ شخص۔اس کی والدہ اسمعیلی فرقے سے تعلّق رکھنے والی بلوچ ہے۔
ارے یہ ایک اور فرقہ ہوا۔ بلوچ سنی ہیں، بریلوی ہیں، دیوبندی ہیں، شیعہ ہیں، ذکری ہیں، ہندو ہیں، مسیحی ہیں.....اوراب اسمعیلی بھی ہیں۔منجی کتھے ڈھانواں!! گوادر میں کھوجے مستقل رہائشی ہیں جو کچھی سے یہاں منتقل ہوئے تھے۔اتنی متنوع اور ورائٹی والی قوم ہے بلوچ، کہ اس میں تو کسی بھی طرح کی فرقہ واریت ممکن ہی نہیں!۔

اب تو بہت سے اسمعیلی مائیگریٹ کر گئے۔مگر ایک زمانہ تھا کہ یہاں بہت بڑی تعداد میں اسمعیلی رہتے تھے۔اُن کا خوب صورت کمیونٹی سنٹر''جماعت خانہ'' موجود ہے۔یہ تو اُن کے اولین لازمی لوازمات میں سے ہے۔اٹھارویں صدی سے اِن کی یہاں آبادی کا تذکرہ ملتا ہے۔یہ لوگ ایک طرف عربوں سے تجارت کرتے تھے تو دوسری طرف ہندوستان مال بھیجتے منگواتے تھے۔ چاول، Sesame Seed، آئل، کپاس، کھالیں، مچھلی، Cane اور لکڑی۔۔مٹھائی اور کپڑا تو ہندو کے ہاتھ میں تھا۔

آج بھی وہاں موجود اسمعیلی خشک مچھلی برآمد کرتے ہیں۔

بلوچ ساحل کے اس حصے میں گوادر ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال کے علاوہ تین رورل ہیلتھ سینٹر ہیں، بی ایچ یوز سترہ، سول ڈسپنسریز بارہ ہیں۔تین ایم سی ایچ سنٹر اور سات ای پی آئی سنٹر ہیں۔ ایک عدد ملیریا کنٹرول پروگرام کا سنٹر ہے اور ایک ڈینٹل یونٹ بھی۔بقیہ بلوچستان کی بیماریوں کے علاوہ یہاں کی خاص بیماری لپروسی ہے۔جس کے لیے تین لپروسی سینٹرز ہیں۔گوادر سنٹر میں 291 رجسٹرڈ کیس تھے۔جو سب کے سب شفایاب ہو چکے ہیں، پسنی میں 144 رجسٹرڈ کیسز ہیں جو سب شفا پا چکے ہیں اور ماڑہ میں 92 رجسٹرڈ مریضوں میں سے صرف تین ابھی تک زیرِ علاج ہیں، باقی سب ٹھیک ہو چکے ہیں۔اب سینٹر کے لوگ انہی شفایاب مریضوں سے مل کر ان کی دوبارہ بحالی کا کام کر رہے ہیں۔یہ کام ایک جرمن خاتون رُتھ فاؤ نے شروع کیا تھا۔

ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال کاغذوں میں 34 بستروں کا ہسپتال ہے مگر دراصل یہاں محض

دس بستر قابلِ استعمال ہیں۔(کاغذوں میں 34 اور حقیقت میں دس بستروں کا ہسپتال!!)۔سارے بلوچستان کے سارے سرکاری اعداد و شمار اسی طرح سمجھے جانے چاہئیں۔فیمیل ونگ میں کوئی کام نہیں ہو رہا۔(ویسے بھی بلوچوں کا خیال ہے کہ ان کے فیمیل ونگ پہ کوئی کام نہیں ہوتا، بس میل ہی کام کرتے ہیں)۔

جی ہاں، یہاں ڈسٹرکٹ ہیڈکوارٹر ہسپتال میں کوئی لیڈی میڈیکل آفیسر نہیں ہے۔یعنی بلوچ ساحل پہ ایک بھی لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے۔لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے، زنانہ ہسپتال نہیں ہے، حاملہ عورت کا بلڈ پریشر دیکھنے کے لیے بھی کوئی نہیں۔ہسپتال چلو تو بولتے ہیں گھر جاؤ وہاں آ کر دیکھتے ہیں، فیس کا''فاقہ'' جو ہے انہیں۔

ایک لیڈی ہیلتھ وزیٹر موجود ہے جو فی پیدائش 3000 ہزار روپے لیتی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی سہولت نہیں ہے۔

آپ حیران مت ہو جائیں، بلوچ پارلیمانی لیڈرشپ اس قدر کرپٹ اور بینک کرپٹ ہے کہ بلوچ ساحل پہ (جو پاکستانی ساحل کا 80 فیصد ہے) ایمبولینس نہیں، سرجن نہیں، آپریشن تھیٹر نہیں، گائنا کالوجسٹ نہیں، پتھالوجسٹ نہیں۔یا حسین!!

یہاں کی دوائی سیکڑوں میل دور دوائی خورد برد کرنے والے سب سے بڑے اڈے یعنی''ایم ایس ڈی'' کوئٹہ میں پڑی ہوتی ہے۔جہاں سے ٹرک کے ایک پھیرے کا کرایہ تیس ہزار روپے ہے (آلما آتا کانفرنس کی ایسی کی تیسی جس میں کہا گیا تھا کہ سن 2000ء تک علاج معالجہ کی ساری سہولتیں مریض کے دروازے پر مفت موجود ہوں گی۔اس کانفرنس پہ دستخط کرنے والا پاکستانی کبھی گوادر گیا ہی نہ ہوگا)۔اسی لیے تو بلوچستان مرکز سے نفرت کرتا ہے۔وہ وہیں اسلام آباد سے اپنے عزیزوں دوستوں کو الما آتا جیسی کانفرنسوں میں بھیجتے ہیں، جنہیں پاکستان کا کچھ علم نہیں ہوتا۔جو صرف اور صرف پی آر پہ زندہ ہیں۔

پورے بلوچ ساحل میں ایک بھی آکسیجن سلنڈر نہیں ہے۔ماہی گیروں کے لیے نہ تو ایمبولینس کشتی ہے، نہ اور کوئی طبی سہولت۔

ضلع میں موجود ڈسپنسریاں تو خیر سے کام ہی نہیں کر رہی ہیں۔اس لیے کہ ان کے لیے نہ بجٹ ہے اور نہ ہی افرادی قوت۔ اِدھر ایمبولینسوں کا فلیٹ نوگاڑیوں پر مشتمل ہے مگر یہ سب بے کار پڑی ہیں۔کسی کا انجن نہیں ہے۔کسی کی باڈی کو یرقان ہو گیا ہے، کسی کے وھیل تباہ ہیں.....لہٰذا ساری ایمبولینس گاڑیاں پتھروں پر کھڑی ہیں۔(بلوچستان بھر کا انجن پتھروں پر رکھا ہوا ہے۔ ہمارا مقدر، ہمارا مستقبل، ہماری حرکت، ہماری برکت ساکت و جامد، شکستہ وریختہ اور ناکارہ بنا کر پتھروں پر کھڑی کر دی گئی ہیں)۔

اس طرح، اے لوگو! مکران کے پورے ساحل پہ اور پاکستان کے ساحل کے 80 فیصد علاقے میں ایک بھی ایمبولینس گاڑی نہیں ہے۔اکیسویں صدی؟۔قوم پرستوں، اسلام پرستوں، این جی او پرستوں.....الغرض ہر زر پرست سرکار کی باقیات کی واحد نشانی یہ ہے کہ اس کی آبادی کے مریضوں کی ایمبولینس گاڑیاں پتھروں پر کھڑی ہیں۔

آپ قارئین کو زیادہ بور کرنا مناسب نہیں ہے۔ویسے بھی بے حسی اپنی اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ کوئی فوری فائدہ کا امکان نہیں۔عوام کا غصہ ابھی اتنا بڑھا نہیں کہ ہماری تحریر کردہ اس حالت پہ کوئی خدا ترس شہری، عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا یا سیکرٹری ہیلتھ اپنی آرام دہ کرسی چھوڑ کر وہاں جانے کی تکلیف کرے گا، کوئی گورنر ہنگامی بنیادوں پر وہاں رحم برسائے گا، یا کوئی عوامی جلسہ جلوس نکلے گا۔ابھی وقت لگے گا دیگ کے پکنے میں.....اس لیے کہ ابھی اس کو پکانے کے انتظام کار ہی منظّم نہیں ہیں۔لہٰذا آیئے گپ شپ کرتے ہیں۔

ماہی گیری کی آمدن

بلوچستان میں اِس وقت ماہی گیری کے قصبوں اور گاؤں کی تعداد چالیس ہے۔ان میں سے آٹھ سٹیشن بڑے ہیں جہاں سے برآمد کرنے یا، اندرونِ ملک سپلائی کے لیے مچھلی شفٹ کی جاتی ہے۔گوادر، پسنی اور گڈانی پر مشتمل تین فش ہاربر ہیں بلوچستان میں۔چار جیٹی جیوانی، پیشکان، سور بند،

اور ڈامب میں زیرِتعمیر ہیں۔پرائیویٹ سیکٹر میں 29 فش پراسیسنگ یونٹ اور 30 برف کے پلانٹ موجود ہیں۔مین کوسٹل ہائی وے اور آر سی ڈی شاہراہ کے ساتھ جیوانی، گنز، پیشکان، گوادر، کپر، پسنی، اور ماڑہ، ھڈ، کُنڈ ملیر، ڈامب، سومیانی اور گڈانی کو ملا دیا گیا ہے۔

ہمارا جھینگا اور مچھلی زیادہ تر جاپان اور امریکہ کو برآمد ہوتا ہے۔جھینگا تقریباً سب کا سب ہی برف میں جما کر باہر بھیجا جاتا ہے۔ جماتے وقت جھینگے کا سر اور چھلکا نکال دینے کی وجہ سے وزن آدھے سے بھی کم رہ جاتا ہے۔1955ء سے لے کر 1961ء تک حکومت نے 57 لاکھ 62 ہزار پاؤنڈ ایسے جمے ہوئے جھینگے برآمد کیے لیکن اس کی اوسط قیمت پونے تین روپے فی پونڈ ملی جب کہ کراچی کے اپنے بازار میں سر اور چھلکے سمیت تازہ جھینگے کی قیمت چار، ساڑھے روپے پونڈ تھی۔اگر اس میں فیکٹری کا خرچ اور مزدوروں کی اجرت شامل کر دی جائے تو ہم بہ خوبی اندازہ کر سکتے ہیں کہ جھینگے کی برآمد میں ہمیں کتنا نقصان ہوا۔لیکن سرد خانوں یا مچھلی کے کارخانوں کے مالک ظاہر ہے کہ نقصان والا دھندہ تو نہیں کریں گے۔

1963ء میں کراچی میں تیرہ فریزنگ اور کیننگ پلانٹ تھے لیکن خام مال کی کمی کی وجہ سے وہ اپنی پیداواری گنجائش کی آدھی پیداوار بھی بمشکل کر سکتے تھے۔اسکے باوجود حکومت نے گیارہ مزید کارخانے لگانے کیلئے لائسنس جاری کر دیئے۔1988ء تک فریزنگ پلانٹس کی تعداد بڑھ کر اٹھارہ ہوگئی اور کیننگ پلانٹ کی تعداد چار ہوگئی۔ان کارخانوں کو مچھلی اور جھینگا پہنچانے کے لیے جس بے دردی سے ہماری مچھلی ماری جا رہی ہے اس سے بلوچستان کے سمندری ذرائع کو نا قابلِ تلافی نقصان ہوا۔فیکٹری مالکان اتنے لالچی ہیں کہ اکثر مرتبہ مالکان کئی کئی روز تک جھینگا نہیں اٹھاتے اور ماہی گیر بھوک اور افلاس سے مجبور ہو کر سستے داموں پر مال دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں (لعنت ہے سرمایہ داری نظام پر!!)۔

مچھلی کی مارکیٹنگ تین طریقوں سے ہوتی ہے:

1- کراچی یا بیرونی ممالک سے کچھ تاجر تو کھلے سمندر میں مچھلی خریدتے ہیں۔اس طرح

وہ اِن بے چاروں سے سستا بھی خرید لیتے ہیں، ساحل تک سفر بھی طے کرنا نہیں پڑتا اور پورٹ چارجز سے بھی بچ جاتے ہیں۔

2- دوسرا طریقہ یہ ہے کہ مچھلی، گوادر اور پسنی فش ہاربر پر بیچی جاتی ہے، جہاں سے تاجر اُسے کراچی بھیج دیتے ہیں۔

3- تیسرا طریقہ یہ ہے کہ بے کار مچھلی یا تھکا ہارا غربت کا مارا ماہی گیر اپنی مچھلی مقامی منڈی میں بیچ دیتا ہے۔

مچھلی کو محفوظ رکھنے کے لیے اب خشک کرنے اور نمک لگانے کا رواج کم ہوتا جارہا ہے۔ برف کے کارخانے لگ رہے ہیں۔ گوادر ضلع میں پندرہ برس قبل سولہ برف کی فیکٹریاں تھیں۔ جن میں سے چھ گوادر میں، ایک سور بندر میں، دو جیونی میں، چار پسنی میں اور تین اور ماڑہ میں تھیں۔

جیسے کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ کیننگ کراچی میں کی جاتی ہے۔ کاش کہ ہم مکران میں انٹر نیشنل معیار کی کیننگ انڈسٹری قائم کرسکتے۔

اسی طرح ہم پولٹری کی خوراک کے لیے بھی صنعت لگا سکتے ہیں۔ مگر کارخانوں سے تو مشرقی اور وسطی بلوچستان میں قبائلی نظام کو خطرہ ہے اور مکران بے چارہ تو مشرقی اور وسطی بلوچستان کے سرداروں کی خدمت گاری کرتا رہا ہے۔

بلوچستان کی نہروں، جھیلوں، ڈیموں اور مچھلی کے سرکاری تالابوں میں 2011ء میں تین ہزار میٹرک ٹن مچھلی پکڑی گئی جب کہ اسی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بلوچ ساحل پر 2011ء میں ایک لاکھ پینتیس ہزار میٹرک ٹن مچھلی پکڑی گئی۔ جس کی مالیت 12,698,290,428 روپے تھی۔

کلری اور جیارو بھی بیرون ممالک کو بھیجی جاتی ہیں۔ انہیں برف میں جما کر ہوائی جہاز کے ذریعے باہر بھیجا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نعمت بلوچستان کو حاصل نہیں ہے۔ یہ چیزیں دور کراچی میں بیٹھے سرمایہ داروں کے کنٹرول میں ہیں جن کے بڑے بڑے بنگلے ہیں رہنے کے لیے، اجلی اجلی کار موٹریں ہیں سواری کے لیے، 200 چینل رکھنے والے ٹی وی سیٹ اور کلب ہیں تفریح کے لیے، موبائلیں فضائی

بھی، اور سٹیلائٹ مواصلات کے لیے سات سمندر پار ممالک میں سیر کے لیے۔ وہ مچھلی خریدتے اگر ایک روپے میں ہیں تو بیچتے سات روپے میں ہیں۔ ہم تو بس بے اوزار ہی رکھے گئے جانور ہیں، ان کے منافع کے لیے کام کرتے ہیں۔ سائنس، منافع، سہولت اور ترقی بلوچ پر حرام کردی گئی ہے۔

ان سرمایہ داروں کے بلوچستانی ہرکارے (بیوروکریٹ) عقل و سوچ سے مبرا کردیے گئے ہیں۔ گونگے، بہرے، جی حضوریے..... ماہی گیری سمندر میں ہوتی ہے اور افسران کوئٹہ میں سازش کے اڈے یعنی سول سیکریٹریٹ میں اپنے بچوں کی روزی حرام کرنے بیٹھتے ہیں اور آلودگی بھری جلیبیاں کھاتے ہیں۔ محکمہ فشریز میں کئی سیکرٹری ایسے بھی لگے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں سمندر دیکھا تک نہیں، انہیں بلوچی کا ایک لفظ بھی نہیں آتا۔ جنہوں نے سمندر کی وسعتوں میں کبھی زھیروک کی خوش الحانیاں چکھی نہیں۔ وزیر ایسے لگے ماہی گیری کے، جنہوں نے زندگی میں مچھلی کا شکار تک نہ کیا، جن کے علاقوں میں مچھلی کا کھانا تک حرام تصور ہوتا ہے..... بہت کچھ بدلنا ہوگا، بلوچستان! تیرا بہت کچھ بدلنا ہوگا۔

نئی ''ڈیپ سی فشنگ پالیسی'' کے تحت بلوچستان کی صوبائی حکومت ساحلی لائن سے 35 ناٹیکل میل تک علاقائی پانیوں میں، ماہی گیری کے وسائل کو ڈھونڈنے، فائدہ اٹھانے، کنٹرول کرنے اور انتظام کرنے کی ذمہ دار ہے۔ ژوب سے، مری بگٹی سے، پٹ فیڈر سے لیے گئے وزیر کو پتہ ہی نہیں ہوتا کہ ناٹیکل میل ہوتی کیا بلا ہے۔ ہم کیا ترقی کریں گے، کیا برآمد کریں گے!!۔

بلوچستان کے ساحلی پانیوں میں مچھلی پکڑ کر بلوچ ساحل پر اتارنے والی مچھلی کی مقدار 119,000 ٹن سالانہ ہے۔ جب کہ مزید 60,000 ٹن پکڑی تو جاتی ہے بلوچستان میں، مگر اتاری جاتی ہے کراچی میں۔ دونوں کو ملا کر تقریباً 2 ارب روپے سالانہ کی مچھلی بلوچ سمندر میں پکڑی جاتی ہے (ہم پھر بھی غریب صوبہ کہلائے جاتے ہیں اور مرکز خدا ترسی میں ہمارے صوبائی بجٹ کا خسارہ عطا کرتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ وسیع صوبائی خودمختاری مالی حقوق کی دستیابی کے علاوہ ہماری عزتِ نفس، ہماری خودداری کے لیے بھی اشد ضروری ہے)۔

سچی بات یہ ہے کہ سمندری ماحولیات کو بگاڑے بغیر ہم تین لاکھ ٹن ماہی پکڑ سکتے ہیں۔ابھی ہم 180,000 ٹن ماہی پکڑ سکنے کے قابل ہیں۔یعنی ہم ابھی تک سالانہ ایک لاکھ بیس ہزار ٹن مزید ماہی پکڑ سکتے ہیں۔جس کے لیے ہمیں مزید بارہ سو کشتیوں کی ضرورت ہوگی۔مگر یہ بات حتمی ہے کہ وفاقی حکومت ہر طرح سے ہمیں تباہ و برباد کرنے میں لگی ہوئی ہے۔بجائے ہمیں سہولتیں دینے، مدد کرنے کے اس نے 1988ء سے کوریائی ٹرالرز کو ماہی گیری کی اجازت کے لائسنس جاری فرمائے ہیں۔ایک ٹرالر 3x12 کلومیٹر رقبے کی ساری مچھلی کا صفایا کر سکتی ہے، جب کہ ایک نہیں، دو نہیں، 150 غیر ملکی ٹرالروں کو لائسنس جاری کر دیے گئے۔ہمارا مستقبل بھوک، ہمارا حال بھوک۔ ہماری تقدیر رہن رکھی جا رہی ہے۔

بلوچ کی ماہی گیری اور اس کا پورا عمل ابھی بہت فرسودہ اور ابتدائی ہے۔پکڑی ہوئی مچھلی کا ایک بڑا حصہ سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے۔35 فشنگ گاؤں میں سے صرف دو (گوادر، پسنی) میں فش ہاربر ہیں۔باقیوں میں اندھیر ہی اندھیر ہے۔فزیکل انفرانسٹرکچر اور ساحل پر سہولیات کی غیر موجودگی میں مچھلی ابھی تک بے حجاب اور ننگی زمین پہ ہینڈل کی جاتی ہے۔جہاں ہر قسم کی گندگی پڑی ہوتی ہے اور خراب ہائی جین جلد ہی مچھلی کی کوالٹی خراب کر دیتی ہے۔اس فوری سڑاند کے نتیجے میں ماہی کا 70 فیصد ضائع ہو جاتا ہے۔بڑی سائز کا شرمپ اور لابسٹر دو ایسی اجناس ہیں جنہیں پکڑ کے کے فوراً بعد برف میں رکھا جاتا ہے۔چھوٹی سائز کے شرمپ (کڈی) کو بھی بید کی ٹوکریوں میں برف میں رکھا جاتا ہے۔کچھ ماہی گیری کی کشتیوں میں Insulated (پولی سٹرین) کے ڈبے ہوتے ہیں جن میں ''جیرا'' گریڈ کے شرمپ کو رکھا جاتا ہے۔

فش ہاربر پہنچ کر پکڑی ہوئی مچھلی اتاری جاتی ہے اور ''جیرا'' کے علاوہ ساری مچھلی کو نیلامی کے ہال میں فرش پر پٹخ دیا جاتا ہے۔ڈھیر لگ جاتے ہیں اتارنے اور نیلام کرنے کے دوران۔طویل دورانیہ (10 سے 30 دن) کے ٹرپ میں پکڑی مچھلی کو جہاز کے تختے پر ہی صاف کیا جاتا ہے۔یہ طریقے بہت ہی ضیاع والے ہیں۔قیمتی ماہی کے لیے برف کے سٹوریج کا بندوبست کیا جاتا ہے۔

جب کہ بقیہ ماہی مثلاً پاگاس، ڈول فش، کیٹ فش، سپینش سیل فش، کوئین فش، میکرلرز، مارلنز، اور ٹریولیز کی آنتیں نکالی جاتی ہیں، انہیں چیر پھاڑ کر ان کو نمک لگایا جاتا ہے۔(ماہی کو خشک کرنا ہمارے ساحل کی ایک بڑی سرگرمی اور ذریعہ معاش ہے) اور تختہ جہاز پر ان کا انبار لگایا جاتا ہے، ماہی کی Curing (نمکی لگا کر خشک کر کے محفوظ بنانا) بہت گندی حالت میں کی جاتی ہے۔یہ طریقے بہت فرسودہ ہیں، جن کا ترک کرنا بہت ضروری ہے۔وقت کا تقاضا ہے کہ فریز کرنے اور پراسیسنگ کی صنعتیں لگائی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ اور قیمتی پیداوار حاصل ہو اور اس سیکٹر میں ترقی ہو۔1970ء میں پسنی میں سرکار کی طرف سے ایک آئس فیکٹری لگائی گئی، 1976ء میں پہلے پرائیویٹ آئس فیکٹری نے پیداوار شروع کی۔اب ضلع گوادر میں کل 16 آئس فیکٹریاں ہیں جن میں چھ گوادر میں، ایک سربندر میں، دو جیوانی میں، چار پسنی میں، اور تین اور ماڑہ میں ہیں۔مچھلی کی ترقی یافتہ پراسیسنگ یعنی ڈبوں میں بند کرنا وغیرہ بلوچستان میں کہیں نہیں ہوتی۔

اگر ٹرپ دو سے زیادہ دنوں کا ہو تو عموماً پکڑی ہوئی مچھلی کا زیادہ حصہ سڑی ہوئی شکل میں اتارا جاتا ہے جس کی تقدیر پولٹری کی خوراک بننا ہوتا ہے۔انہیں کھلی جگہ پر خشک کیا جاتا ہے۔فارمی مرغی کے لیے پولٹری فارم کے مالکان جو خوراک خریدتے ہیں، ان میں بہت قیمتی مچھلی بھی شامل ہوتی ہے۔

فش ہاربروں اور مچھلی اتارنے کی جگہوں پر غیر [redacted] حالات کی وجہ سے یورپی ممالک نے مچھلی اور شرمپ کی درآمد بند کر دی۔یورپی یونین نے 1997ء میں صفائی نہ ہونے اور [redacted] کے حالات کی خرابی کی بنا پر ہماری سمندری درآمدات پر اپنے ہاں پابندی لگا دی۔

بلوچ ساحل پر جون سے ستمبر کے اوائل تک ماہی گیری نہیں ہوتی کہ مون سون کا موسم ہوتا ہے اور سمندر مکمّل وجد میں آجاتا ہے۔بپھرے پانی کے جوش میں بے چارہ انسان اور اس کا ساز اور سامان سمندر کے لامتناہی پیٹ میں نگل لیے جاتے ہیں، چنانچہ چھٹی۔

ماہی گیری ایک بڑی صنعت کے طور پر ابھر رہی ہے اور مزید پھیل رہی ہے مگر اس کا اصل فائدہ ماہی گیر عوام کو نہیں ملتا۔مڈل مین فائدے لوٹتا ہے۔یہ مڈل مین بہت ذلیل حالات پیدا کرتا

ہے۔اس نے ساحلی معیشت کو مکمّل طور پر کنٹرول کر رکھا ہے۔ یہاں اس نے Serfdom (زرعی غلامی) کا نظام قائم کر رکھا ہے۔ ماہی گیر اور حتیٰ کہ کشتیوں کے مالک بھی غریب سے غریب تر ہوتے جاتے ہیں اور مڈل مین یا سیٹھوں سے قرض لیتے ہیں۔ یہ لوگ مزید محنت کرتے ہیں محض قرض اتارنے کی خاطر۔ مگر قرض ہے کہ بڑھتا رہتا ہے، ضروریات ہیں کہ مہنگی ہوتی جاتی ہیں۔ یہ ادھار دینے والے دلال یا سیٹھ کلمت، شمال بندر اور سومیانی حتیٰ کہ پورے ساحل پر اپنا کاروبار کرتے ہیں۔ یہ سود والا قرض ہوتا ہے اور جب تک قرض ادا نہیں ہوتا، مقروض پابند ہوتا ہے کہ اپنی مچھلی اسی قرض خواہ کو مارکیٹ ریٹ سے بہت کم قیمت پر فروخت کرے۔ اگر ماہی گیر کا دماغ زیادہ ''خراب'' ہو تو وہ کسی اور سیٹھ یا دلال سے قرض لے کر پچھلے قرض خواہ کا قرض چکا دیتا ہے۔ تب وہ نئے قرض خواہ کو اپنی مچھلی بیچنے پر مجبور ہوتا ہے۔ یعنی اگر وہ چاہے تو مالک بدل سکتا ہے مگر آزاد نہیں ہو سکتا، اپنی تقدیر بدل نہیں سکتا۔ چنانچہ جیٹی میں یہ دلال معمولی قیمت پر ماہی گیر کی مچھلی ہتھیا لیتا ہے۔

نیلام والا دلال فروخت پر 4 سے 5 فیصد کمیشن لیتا ہے۔ تازہ ماہی کے خریدار یا تو مقامی مڈل مین ہوتے ہیں یا پھر کراچی والے۔ نیلامی کے دوران بھی برف استعمال نہیں ہوتی۔ پکڑی ہوئی مچھلی ساحل پر رکھی جاتی ہے جہاں سورج کی شعاعیں اور گرد و غبار اس کا حشر کر دیتے ہیں۔ نیلام کے بعد ماہی کو یا تو نمک لگا کر خشک کر دیا جاتا ہے یا فروخت کے خشکی والے علاقوں کی طرف اونٹوں، گدھوں یا پک اپ پر روانہ کیا جاتا ہے۔ (کراچی، کیچ، پنجگور اور آواران) ہر جگہ کوسٹ گارڈ والے تنگ کرتے ہیں، رشوت لیتے ہیں اور مچھلی چھینتے ہیں۔

بلوچستان کی مچھلی کا دس فیصد مقامی طور پر بیچا جاتا ہے جہاں سے مقامی آبادی کا وہ حصہ اپنی ضرورت کی مچھلی خریدتا ہے جو خود ماہی گیری میں شامل نہیں ہے۔ ساحلی بلوچ بڑا ماہی خور ہے، تازہ مچھلی کھاتا ہے۔ سال بارہ مہینے وہ مچھلی ہی کھاتا رہا ہے، عاشق ہے اس پر۔ کبھی کبھار جب مچھلی نہیں ملتی تو دال سبزی کھاتا ہے منہ بسور کر، بڑی کوفت سے۔

مچھلی پورے مکران ڈویژن کو جاتی ہے۔ بقیہ مکران ایک زمانے میں مال کے بدلے مال

کے تحت مچھلی لیتا تھا، کھجور لو، مچھلی دو۔ مگر اب تو کرنسی کا، روکڑا کا راج ہے۔

پکڑی ہوئی مچھلی کا 25 سے 35 فیصد پاکستان کے دیگر علاقوں میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ مچھلی تازہ بھی ہوتی ہے اور خشک قسم کی بھی۔

کراچی یا بیرونی ممالک سے کچھ بزنس مین کھلے سمندر میں مچھلی خریدتے ہیں۔ اس طرح وہ پورٹ اخراجات سے بچ جاتے ہیں۔

بیرونِ ملک مچھلی کی مارکیٹنگ بلوچ نہیں کر سکتے، اس لیے کہ نظریہ پاکستان اور اسلام کو بہت خطرہ پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا خواہ تازہ مچھلی ہو یا خشک (یعنی سوریں) شکل میں، لازم ہے کہ یہ کراچی جائے اور وہاں سے دوسرے ممالک مثلاً سری لنکا، چین، کوریا، جاپان، سنگاپور، برطانیہ اور امریکہ کو۔ سری لنکا ہماری مچھلی خریدنے والا سب سے بڑا ملک ہے، مگر وہ قیمت بہت کم دیتا ہے۔ (وہاں بکتا ہی کتنا ہوگا کہ ہماری مچھلی کا 43 فیصد حصہ گل سڑ کر مرغیوں کی خوراک بن جاتا ہے)۔

ماہی گیروں کے ہاں سیٹھوں اور دلالوں کے استحصال سے نجات کے لیے کبھی کبھار تنظیمیں بنتی رہتی ہیں مگر یہ کوششیں ناکام ہو جاتی ہیں۔ اس لیے کہ لیڈر شپ قابلِ اعتماد نہیں ہوتی۔ نیز سیٹھوں اور دلالوں کے ایجنٹوں کی طرف سے بھی سازشیں ہوتی رہتی ہیں کہ ایسی تنظیم کاری نہ ہونے پائے۔

سیاسی پارٹیاں تو ''اور'' کاموں سے فارغ نہیں ہیں، وہ ٹریڈ یونین کیا بنائیں گی؟! پاکستان کی ٹریڈ یونین تحریک بھی ''لیڈر زدہ'' حالت سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اور اس طرح بلوچستان کی دو اہم صنعتیں (معدنیات اور ماہی گیری) بغیر ٹریڈ یونین کے ہیں۔ قیامت کے دن ہم سب کو لائن پر کھڑا ہونا ہوگا جوابدہی کے لیے ہے۔ جوابدہی بھی نہیں سزا پانے کے لیے۔ ہماری زبانوں سے بڑے بڑے بچھو لٹکے ہوں گے۔

ماہی گیری کے لیے انفراسٹرکچر اور ساحل پر سہولتوں کی کمی نے ہماری ماہی گیری کی صنعت کو اپاہج بن رکا ہے۔ تربیت گاہوں کی کمی نے اسے مزید نقصان پہنچایا ہے۔ میرین انجن اور ماہی گیری کے آلات کی کمی نے ایک طرف تو پیداوار کو بری طرح متاثر کیا ہے تو دوسری طرف ماہی گیری کو قدامت

پرستی، رجعت پسندی، اوہام پرستی، اور پیری فقیری، تعصّبات کا شکار اور پیر پرست بناڈالتا ہے۔

بلوچ ماہی گیری کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ مارکیٹ کا نہ ہونا ہے۔ ہمارے اتنے بڑے ساحل کی بجائے کراچی کو ہم پہ مسلّط کیا گیا ہے جو گوادر سے ایک ہزار کلومیٹر دور ہے۔ جب کہ سڑک ہے ہی نہیں۔ سڑک بنانے سے تو آپ جانتے ہیں کہ بلوچستان کی آزادی کو بہت خطرہ ہے۔ اس ایک ہزار کلومیٹر کے کچے فاصلے کو فرسودہ ٹرک کتنے دن میں طے کرتے ہوں گے اور اس دوران کتنی مچھلیاں ضائع ہوتی ہوں گی، اس کا اندازہ تو ماہی گیر ہی لگا سکتا ہے۔ ایسی سڑک کے نہ ہونے سے ہماری آبادی کو دو طریقے سے نقصان ہوتا ہے: ایک تو یہاں خوردنی سمیت استعمال کی چیزوں کی قیمتیں کراچی سے دگنی ہیں۔ دوسرا یہ سیٹھ لوگ مچھلی کراچی سے آدھی قیمت پر لے جاتے ہیں۔ لہٰذا ساحلی شہروں کے اپنے درمیان پکی سڑکیں بنائی جائیں اور کراچی کی مارکیٹ کو منسوخ کر کے گوادر اور پسنی سے ڈائریکٹ مچھلی برآمد کرنے دی جائے۔ اس سے ملک پر کوئی کوئی آسمان نہیں گرے گا۔ گوادر سے خلیجی علاقے محض تین گھنٹے دور ہیں جو ماہی کی برآمد کے لیے زبردست مارکیٹ ہیں۔

اور ماڑہ، گڈانی، سور، پیشوکان، چاندی، جیوانی اور ہنگول میں جیٹی کی سہولیات سخت ضروری ہیں۔ بلوچ ساحل پر ایک فشریز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ کا قیام بہت ضروری ہے۔ انتہائی فرسودہ اور بہت پسماندہ بینکنگ کے نام پر نیشنل بینک، حبیب بینک، یونائیٹڈ بینک، الائیڈ اور مسلم کمرشل بینک کی موجودہ شاخوں کی از سرِ نو تنظیم کرنی پڑے گی۔ ADBP ماہی گیروں کے ساتھ جو کھیل تماشے کرتی آئی ہے، اُسے الٹ دینا ہوگا۔ سمال بزنس کارپوریشن کی تمام تر اخلاقی اور انتظامی دیوالیہ پن کا علاج کرنا ہوگا۔ چوں کہ صنعتی ترقی نہیں ہے، اس لیے آب پاشی کے ذرائع کو ترقی نہیں دی گئی۔ صرف ماہی گیری کو ہی ساحلی علاقوں کے باشندوں کا ذریعہ معاش رہنے دیا گیا۔ یہاں سمال انڈسٹریز سٹیٹس بنائی جائیں۔ ماہی گیروں کی سماجی معاشی حالات میں عمومی بہتری لانا انتہائی اہم ہے۔ بے روزگاری، بے سکولی، بے ہسپتالی، اور بے بسی نے جس پیمانے پر نشہ اور دیگر اخلاقی بے راہ رویوں کو پھیلا دیا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ مچھلی کی ہینڈلنگ، ڈسٹری بیوشن اور مارکیٹنگ کے نظام میں بنیادی تبدیلیوں سے لے کر

ماہی گیروں کی تعلیم، صحت اور تفریحی مشاغل کی فراہمی تک کے پورے سلسلہ کو تبدیل کیا جائے۔

کچھ مطالبات

ماہی گیروں کے کوآپریٹوز بنائے جائیں۔

سمندری خوراک پیکنگ اور پولٹری کے خوراک (Fish Meal) پلانٹس لگائے جائیں۔

فش لینڈنگ جیٹی یا چھوٹے ہاربر جگہ جگہ بنائے جائیں۔

ماہی گیروں کی کشتی میں لائف جیکٹس ہونی چاہئیں۔ ان میں طویل فاصلے کا ریڈیو ریسور یا ٹرانس میٹر ضروری ہے جس کے ذریعے موسم کی اطلاعات اور متعلّقہ حکام کی طرف سے دوسری ہدایات موصول کی جائیں۔ اس سے سمندر میں امداد پہنچانے والی ایجنسیوں کو بلایا جا سکے گا۔

تمام لانچوں، ٹرالرز اور جہاز پر فائر فائٹنگ اور نقصان کو کنٹرول کرنے والے تمام آلات کا ہونا ضروری ہو۔ علاوہ ازیں سمندر میں پیش آنے والے ہر حادثے کے لیے تحقیقاتی کمیٹی کے تقرر کے بارے میں قوانین بنائے جائیں جو حادثوں کی روک تھام میں بھی کام آ سکیں۔

جس سرکاری محکمے کے ذمے کسی زندگی کو بچانے کی کارروائی کرنا ہو تو اس کے سربراہ کو ذمے دار ٹھہرایا جائے اور اس کے خلاف محکمہ جاتی یا قانونی کارروائی کو ضروری مانا جائے۔

مختلف ابلاغ کے ذریعوں کو پبلسٹی کی مہم چلانی چاہیے تاکہ عوام میں سمندر کے سفر کے لیے ضروری احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی ضرورت کا شعور پیدا ہو سکے۔ ماہی گیروں اور مال بردار یا مسافر برادر کشتیوں اور فشنگ ٹرالرز کے ملاحوں کی حفاظت کا شعور اور اپنی جان بچانے کے ضروری اقدامات کی اہمیت کا احساس ہونا چاہیے، انہیں مالکوں اور ٹریڈ یونینوں کو زور دینا چاہیے کہ وہ تمام کشتیوں میں جان بچانے والے اقدامات کے انتظامات مکمّل کریں ورنہ ان انتظامات کے بغیر وہ کشتیاں باہر نکالنے سے انکار کر دیں۔

کشتی کے ناخداؤں اور عملے کو جان بچانے والے اور آگ بجھانے والے آلات کو

درست رکھنے اور انہیں صحیح طور پر استعمال کرنے کی تربیت دینے کے لیے خصوصی تربیتی سکول کھولے جائیں تا کہ ان بہت سی قیمتی جانوں کی حفاظت کو یقینی بنایا جا سکے جو معلومات نہ ہونے یا توجہ نہ دینے سے ضائع ہو جاتی ہیں۔

فشریز ڈیپارٹمنٹ

ہم ساحل بلوچستان کی پسماندگی کے سب سے بڑے سبب یعنی فشریز ڈیپارٹمنٹ چلے گئے تا کہ استبدادی سرکار کے اس آخری سرے کو بھی دیکھ لیں جس نے اس قدر خوب صورت اور منافع بخش ساحل کو دنیا کے پسماندہ ترین ساحلوں کی صفوں میں جا دھکیلا۔

حسبِ توقع ہمیں بڑا کوئی افسر نہ ملا۔ کوئی ڈی سی کے حضور گیا ہوا تھا۔ کوئی سبزی خریدنے۔ نچلے اہلکار تو اس طرح ملے جیسے ہم ان سے چاغی کے ایٹم بم کا راز معلوم کرنا چاہتے ہوں۔ ماہی گیری سے متعلّق ساری معلومات فائلوں میں بند تھیں۔ فائلیں لوہے کی الماریوں میں اور لوہے کی الماریاں مقفّل تھیں اور ان کی چابیاں صاحب کے پاس تھیں، اور صاحب خود ڈی سی صاحب کے پاس۔ شیطانی چکر ہے ہمارا حاکم طبقہ۔

ہم نے صاحب کو فون پر آمد کی اطلاع دی اور ان کی تشریف آوری تک وہاں فوٹو گرافی کرتے رہے اور مختلف امور پر معلومات اکٹھّی کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ بالآخر ہمیں شرف باریابی نصیب ہوا۔

محکمہ فشریز کی ہیرارکی کچھ یوں ہے:

پہلا نام سیکرٹری کا دوسرا ڈائریکٹر کا۔ یہ دونوں یہاں سے سیکڑوں میل دور کوئٹہ میں پجیرو گاڑیوں، ائیر کنڈیشنڈ دفتروں میں فضول بیٹھتے ہیں۔ جہاں نہ مچھلی ہے، نہ سمندر ہے، نہ دریا ہے۔ ڈائریکٹر کی پوسٹ پسنی میں ہے۔ مگر ہمارے انگریز نو آبادکاروں کے یہ جانشین رہتے کوئٹہ ہی میں ہیں اور ایسے لوگ سیکرٹری گیری اور ڈائریکٹری کرتے رہے ہیں، جن کے آباؤ اجداد نے بھی مچھلی کی شکل نہ

دیکھی تھی۔ جن کا ماہی، ماہی گیر اور ماہی گیری سے دور کا تعلّق نہ تھا۔ میرا وطن دلچسپ ہے جہاں فلسطینیوں کے خون میں رنگا جنرل ضیا، امیر المومنین بنتا ہے، جہاں خشکی کا وڈیرہ ماہی گیری کا سیکرٹری بنتا ہے، اور پوٹھوار کے بارانی علاقے کا آدمی نیوی کا چیف بنتا ہے۔

ڈائریکٹر کے بعد دو عدد ڈپٹی ڈائرکٹرز ہوتے ہیں۔ ایک ڈپٹی ڈائریکٹر ایڈمن ہوتا ہے جو کہ ماہی گیروں کی بہبود کے لیے تو کچھ نہیں کرتا۔ البتہ وہ ماہی گیر کو 24 گھنٹہ تک جیل میں ڈال سکتا ہے۔ دوسرا ڈپٹی ڈائریکٹر ''میرین ڈپٹی ڈائریکٹر'' کہلاتا ہے۔ یہ تعداد میں دو ہوتے ہیں؛

1۔ اِن لینڈ

2۔ سمندر

ان ڈپٹی ڈائریکٹروں کے بعد پھر اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں۔

اسسٹنٹ ڈائریکٹر گوادر، اسسٹنٹ ڈائریکٹر حب، جیونی اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر پسنی۔

اسسٹنٹ ڈائریکٹر کے نیچے فشریز آفیسر ہوتے ہیں۔ اس کے نیچے انسپکٹر ہوتے ہیں جو کہ صبح مارکیٹ جاتے ہیں، اعداد و شمار کرتے ہیں کہ کتنا ٹن پیداوار ہوئی ہے، قیمت اور نرخ کیا رہے ہیں، سالانہ آمدنی کتنی ہوتی ہے.....(اعداد و شمار اور بلوچستان؟ ہونہہ!)

انسپکٹر کے نیچے اسسٹنٹ انسپکٹر ہوتا ہے۔

فشریز ڈیپارٹمنٹ والے نے اپنی خدمات یوں گنوائیں؛

''1۔ ہم لانچ سستے نرخوں پر قسط وار ماہی گیروں کو دیتے ہیں۔ نیز ''ماہور'' بھی سستی قیمت پر قسطوں پر دیتے ہیں۔ مگر ان کے اس دعوے کو ماہی گیر مسترد کرتے ہیں۔ ماہی گیروں کا مؤقف ہے کہ یہ چیزیں حق دار کو بالکل نہیں ملتیں بلکہ بااثر اوپری طبقہ میں بندر بانٹ کر دی جاتی ہیں۔ جب ہم نے آفیسروں سے استفسار کیا تو انہوں نے نظریں چرا لیں اور مونچھوں کے نیچے بڑی دھیمی شرم سار آواز میں وہی منحوس جواز پیش کرتے ہوئے ماہی گیروں کے مؤقف کی تصدیق کی کہ'' آپ کو تو معلوم ہے کہ پچھلا سارا دور سیاسی، کرپٹ حکومتوں کا رہا ہے، اس لیے وزیروں، ممبروں کے کہنے پر

سب کچھ تقسیم ہوا ہے''۔(کرپٹ سیاسی وزیر،اس کے کرپٹ افسر شاہی اوران کے پورے نظام کے دائرے کوتوڑنا ہی تو بلوچستانی انقلاب ہوگا)۔

''2۔ ہم فی پیکٹ پانچ روپے لے کر Curing (مچھلی خشک کرنے) کی سہولتیں دیتے ہیں۔40 کلوگرام کے 5 روپے فیس لے کر مچھلی خشک کرنے میں مدد دیتے ہیں۔یعنی ہم جگہ کا انتظام کرتے ہیں۔

''3۔ کوئی ماہی گیر گم ہو جائے تو ہم اس کی تلاش میں پیٹرولنگ کرتے ہیں۔ان بھائی صاحبوں کے پاس گم شدہ ماہی گیر کو تلاش کرنے کا ایک بھی اوزار نہیں ہے۔نہ کشتی، نہ وائرلیس، نہ ٹارچ، نہ ہیلی کاپٹر، حتیٰ کے ان کے دفتر میں ان کے لیے اپنے لائف سیونگ جیکٹ تک نہ تھی۔ چلے ہیں گم شدہ ماہی گیروں کو ڈھونڈنے!! بے تیغ بھی لڑتا ہے آفیسر۔مگر کبھی بھی بغیر تنخواہ کے نہیں لڑتا۔ ادھر تو غم یہ ہے کہ تنخواہ لے کر بھی کام نہیں کرتا۔گھوسٹ ملازم پتہ نہیں کس کو کہتے ہیں!

''4۔ سرکاری ورکشاپ میں انجن مرمت کرائے جاتے ہیں''۔

مگر اصل صورت حال یوں ہے کہ.....

فشریز ڈیپارٹمنٹ کی ورکشاپ تو موجود ہے مگر وہ انجن نہیں لاتے۔حالاں کہ اگر فش ہاربر پر سستے داموں یہ پرزہ جات دستیاب ہوں تو کراچی سے مہنگے داموں لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہاں کوئی میرین ٹیکنیکل کالج نہیں ہے۔ماہی گیروں کے لیے کوئی سوشل سیکورٹی سسٹم نہیں ہے، نہ ہی انشورنس سکیم ہے۔(فشریز ڈیپارٹمنٹ جتنا نکما محکمہ کوئی اور ہوگا؟)۔اس محکمہ نے جو کارکردگی ہمیں بتائی اس میں Curing Yard مہیا کرنے کا بار بار تذکرہ کیا۔مگر ہم نے جا کر تفصیل سے جائزہ لیا تو سادہ سادہ میدان ہے۔کوئی سہولت نہیں۔ایک بار انہوں نے 20 فیصد کے حساب سے سپیر پارٹس، انجن، اور آلات ماہی گیری سپلائی کر دیے۔'' آٹھ اور پندرہ پندرہ ہارس پاور کے یاماہا انجن ہم ماہی گیروں کو دیتے ہیں''۔مگر دوسری ہی گھڑی میں اصل بات یہ سامنے آئی کہ یہ سب کچھ بندر بانٹ ہوئی

اور ایسے ایسے لوگوں کو انجن دیے گئے جن کا ماہی گیری سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ماہی گیروں کو ابھی بھی جال وغیرہ کی ضرورت ہے۔یہ محکمہ مارکیٹنگ میں غریب ماہی گیروں کی کوئی مدد نہیں کرتا (محکمے تو خود ''ہم انسانوں'' کی مارکیٹنگ کرتے پھرتے ہیں)۔

گو کہ ٹرالر سے ماہی گیری کرنے پر پابندی ہے اور دنیا بھر میں ماہی گیروں کی بین الاقوامی جدوجہد کی بدولت غریب ملکوں کے ساحلوں پر ملٹی نیشنل ٹرالرز کا داخلہ بند کیا جا رہا ہے۔جن میں انڈیا، ویت نام، تھائی لینڈ، فلپائن اور دیگر ممالک شامل ہیں۔مگر ہمارے لالچی اندھے حاکم غیر ملکی ٹرالروں کو خود ہی دعوت دیتے ہیں۔یہ بڑے ظالم ٹرالر ہوتے ہیں جن میں مچھلی پکڑنے سے لے کر اس کی پیکنگ اور فریزنگ تک کی ساری سہولتیں موجود ہوتی ہیں۔غیر ملکی ٹرالرز مچھلی کی نسل کشی کرتے ہوئے دندناتے پھرتے ہیں۔وہ مستی اور خرمستی میں ہمارے چھوٹے ماہی گیروں کے جال کو پھاڑ لے جاتے ہیں۔آپ فشریز کے محکمہ کے لوگوں کو 25 یا 30 ہزار روپے رشوت دیں اور بے شک پورا بلوچستان خرید لیں۔ہمارے یہ وطن فروش افسر اس کا سودا کرنے پہ ہمہ وقت تیار ملیں گے۔

وائرنیٹ بھی ممنوع ہے مگر.....ڈالر دکھاؤ، سب کچھ قانونی بن جاتا ہے۔

زرعی بنک مچھیروں کے نام کوئی قرضہ سکیم مہیا نہیں کرتا بلکہ کئی واقعات اس طرح کے ہوتے ہیں کہ زرعی بینک والے مچھیروں کے شناختی کارڈ لے جاتے ہیں اور منیجر صاحب انہی مچھیروں کے نام کا قرض اپنے ہم پیالہ ساتھیوں کو دے دیتا ہے اور سال دو سال بعد غریب ماہی گیروں سے نہ لیے گئے قرض اور اس پر واجب سود مانگنے کا تقاضا ہوتا ہے۔تب ماہی گیر کو پتہ چلتا ہے کہ اس کے نام پر جعلی قرضہ لیا گیا ہے۔کچہری، عدالت، جھولی، آنسو.....مگر جیلیں۔

صحت کی سہولتیں دینا تو گویا فشریز ڈیپارٹمنٹ کا کام ہی نہیں ہے، نہ ہی آئندہ کے لیے ان کے پاس کوئی منصوبہ ہے۔کسی طرح کے وائرلیس سیٹ کی اجازت نہیں ہے۔کوئی اطلاعاتی یا امدادی نظام موجود نہیں ہے۔سمندر میں اگر مچھیرے پہ کوئی مصیبت آئے یا لانچ خراب ہو کر تین تین دن تک بیچ سمندر کھڑی رہے تو بس اللہ ہی مالک ہے، اکیسویں صدی کے فشریز آفیسر کو کوئی پرواہ نہیں

ہوتی۔ ہلاک شدگان کو کوئی معاوضہ نہیں ملتا۔ حادثات میں زخمی کی کوئی مالی کفالت نہیں ہوتی، کوئی بے روزگاری الاؤنس نہیں ملتا۔ منشیات کو کنٹرول اور نشہ میں غلطاں انسانوں کی بحالی کی کوئی سکیم موجود نہیں ہے۔ محکمہ، ماہی گیروں کے لیے کوئی سکول نہیں چلا رہا۔ تنظیم سازی میں یہ مچھروں کی کوئی مدد نہیں کرتا۔ بلوچستان کا فشریز ڈیپارٹمنٹ ماہی گیروں کے لیے کسی طرح کا کوئی ورکشاپ، سیمینار نہیں کراتا اور نہ ہی کسی طرح کی ٹریننگ کی سہولتیں دیتا ہے۔ فشرمین کے لیے کوئی کوآپریٹو سوسائٹی موجود نہیں ہے۔ دوسرے ملکوں یا پھر کراچی وغیرہ میں گرفتار مچھیروں کی کوئی شنوائی یا امداد کا تصور موجود نہیں ہے۔ کوسٹل گارڈ، کسٹم اور پولیس میں سیکڑوں میل دور کے لوگوں کو تو بھرتی کیا جاتا ہے۔ مگر ہمارے اپنے بچے بے روزگار، نشہ کرتے پھرتے ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا۔ مچھلی کا محکمہ مچھلی سٹور کرنے میں کوئی مدد نہیں کرتا۔ پیکنگ کی فیکٹریاں کراچی میں لگی ہوئی ہیں۔ 90 فیصد سے زیادہ ماہی گیری بلوچ کرتا ہے مگر پیک شدہ مچھلی کے ڈبوں پر ''سندھ'' لکھا ہوتا ہے۔ ہمارا محکمہ آفیسروں کا مزار ہے، مگر جہاں اگر بتیوں کا دھواں تک نہیں ہوتا۔

اس مزار پر پھٹکار کے بعد حضرت امیر الدین مچھلی پکڑنے کے شوق میں نوجوانوں کے ساتھ سمندر چلا گیا اور میں نے اپنے مشن کی بجا آوری کے لیے علی بلوچ کے ساتھ جیٹی کا رخ کیا۔ جہاں مچھیرے ہوتے ہیں، زندگی ہوتی ہے، زندگی کا شعور ہوتا ہے۔ مچھیرا جو بلوچ کا روزی رساں ہے۔ محنت کا سفیر ہے، تکریم واحترام کا اصل حق دار۔ دنیا نے ابھی تک ہمارے مفت خور، نااہل، کاہل، چور، کرپٹ اور بڑی توند والے فیوڈل کو دیکھا ہے، ہمارے وطن فروش بیوروکریٹ کو دیکھا ہے۔ مگر اس نے بلوچ جوہر کو ابھی تک نہیں دیکھا۔ ضرورت ہے کہ ہمارا اصلی چہرہ (محنت، حلال روٹی، سادگی، استقامت، بہادری، سچائی، ایمانداری، اور بھائی چارہ) یعنی ماہی گیر کو روشناس کر کے بلوچ کے بارے میں دنیا کی رائے کو بدلا جائے۔ دنیا کی رائے حتماً بدل جائی گی۔

45

سموراج کی حالت

جناب علی بلوچ نے چار بجے شام کو انسانی حقوق سے دلچسپی رکھنے والی خواتین سے میٹنگ کا اہتمام کیا تھا۔ بلوچ خواتین جو انسانی حقوق کا شعور بھی رکھتی ہیں، اور ان کے حصول کے لیے جدوجہد میں بھی شامل ہیں۔ ان عورتوں میں معمر خواتین بھی تھیں، درمیانی عمر والی بھی، اور میٹرک پاس بچیاں بھی۔ ساحلی بلوچ عورت کوئی ''صنف نازک'' اور ''ضعیفہ'' نہیں ہوتی، بلکہ پاکستان بھر میں سب سے بے باک، بہادر اور کھل کر بات کرنے والی عورت دیکھی ہے ہم نے، بلوچ ساحل پہ۔

بالخصوص نوجوان (بیاہی اور بن بیاہی دونوں) لڑکیاں بہت ہی پرعزم، بہادر اور مصمّم تھیں۔ ان کی آنکھوں میں موجود سرگرم اور متجسّس چمک واضح بتا رہی تھی کہ موجودہ دور سے غیر مطمئن اور ایک روشن مستقبل کی متلاشی ہیں۔ آیئے میٹنگ میں موجود عورتوں کے نام پڑھتے ہیں جس سے بلوچ ساحل کی عورت کی شخصیت کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ ہو سکے گا۔

آسیہ بانو، شبانہ گل، گلشن کریم بخش، شائستہ کریم، نسرین حمید، صاعقہ مولا بکش، ہما ظفر، حنا نظرت، جمیلہ محمد حیات، شمسا تون نظرت، نور جہاں محمد حیات، شکیلہ اصغر، عاجر جمیلہ، رضیہ، شہناز مراد (جے وی ٹیچر)۔ سلمہ طارق، روزتوں عثمان، سلمہ حیات، سمیرا حمید، کوثر شاہ داد، ملک داد محمد، یاسمین وحید، سارہ ھامد، زرینہ شئے علی، گلشن نور بخش (جے وی ٹیچر)، نجمہ نور بخش، حفیظہ عابد علی، یاسمین، صبا عبداللہ، زبیدہ محراب، عسیان عثمان، گنجا تون شاہ داد، نازل کریم بخش۔

ان 33 بلوچ عورتوں نے بڑے تحمل اور صبر سے مشرقی بلوچی میں میری گزارشات سنیں۔ صرف گوادر شہر میں 33 باشعور، منظّم اور جدوجہد کرتی عورتیں!!۔ فیصدی حساب لگائیں تو لاہور اور کراچی جیسے ترقی یافتہ مراکز میں بھی یہ شرح نہ ملے گی۔ بلوچ عورت جمہوری تحریک کی راہنمائی کی اہل ہے!!۔ ان خواتین نے بہت ہی سرگرمی سے اپنے مقامی مسائل کی نشان دہی کی۔ انہیں استحصالی معاشی نظام کے ساتھ خوب صورتی سے جوڑا اور ان کے حل بتائے۔ ان کی اپنی غیر مصنوعی اور میٹھی بلوچی اور اردو سے میں یہ گوہر اپنی نوٹ بک میں لکھ سکا تھا۔

* یہاں سوئی گیس نہیں ہے۔ جس کی سنگینی کا احساس بقول ان خواتین کے مردوں کو ہو ہی نہیں سکتا۔ آگ چولہے کا مسئلہ جو ہے۔
* ڈیم بھرا ہوا ہے مگر پھر بھی پینے کے پانی کی سپلائی بہت کم ہے۔
* ڈیزل نہیں ہے، سو بجلی نہیں ہے۔ ''بھئی ہم بجلی کا فیس بھرتا ہے، بجلی دیو''۔
* بجلی نہیں ہے، میری بچی کو مچھر کاٹتا ہے، وہ ملیریا ہو جاتی ہے اور میرے پاس دوائی کے پیسے نہیں ہیں۔
* گورنمنٹ گرلز جدید پرائمری سکول میں تعداد 200 ہے۔ ٹیچر صرف دو ہیں، کمرے صرف دو ہیں، پنکھا نہیں ہے، کتابیں نہیں دیتے۔
* گرلز ہائی سکول میں سائنس ٹیچر نہیں ہے، مستقبل کی کیسی نسل تیار ہوگی؟
* فقط ایک گرلز ہائی سکول ہے۔
* سکول کے لیے ٹرانسپورٹ نہیں ہے۔
* بے روزگاری ہے۔
* نالیاں گندی ہیں۔
* گلی کی صفائی نہیں ہے، جمادار نہیں ہے، کچرہ دان نہیں ہے، کہتے ہیں سمندر میں کوڑا نہیں پھینکو تو کہاں پھینکیں۔

* ووٹ لینے آتے ہیں تو ماسی بولتے جاتے ہیں، بھابھی، گہار۔ بعد میں گوادر میں ہوتے نہیں تو پہچانیں گے کیا؟

شام چھ بجے مردوں کے ساتھ ملاقات تھی۔ ہم وہاں کے لیے روانہ ہوئے، راستے میں علی بلوچ کی راہنمائی میں ہمیں چند باتیں مزید معلوم ہوئیں؛ یعنی بلوچستان کے دوسرے لوگوں کی طرح زندہ دل گواردی بڑے رنگین ہوتے ہیں۔ ان کے کپڑے رنگین، در و بام رنگین، یکدار و لائچ رنگین، مزاج رنگین، (بلوچوں کا تو معبود بھی رنگین، کہ بقول جوانسال بگٹی ''رنگی بادشاہ'')۔ بہت شوقین مزاج لوگ ہوتے ہیں ہم۔!

وبائی اردو کیسٹوں کی خطرناک صورت حال ہم نے یہاں گوادر میں دیکھی۔ جگجیت کی غزلیں ہر کیسٹ بردار گاڑی میں کُوکتی سنائی دیتی ہیں (اور بلوچ کی ساری گاڑیاں کیسٹ بردار ہی ہوتی ہیں)۔ بلوچی میں سبزل سامیگی بہت ہی مقبول ہے۔ موجودہ گلوکاروں میں نور خان بزنجو، نصیر بلوچ، عارف کی آوازیں پاپولر ہیں۔ نصیر اور نور خان کے 18,18 کیسٹ آئے ہیں۔ نورل بھی یہاں کافی مقبول ہے۔

دو ایرانی بلوچ گلوکار ائیں شمشک اور شراتون بھی اچھی خاصی سنی جاتی ہیں۔ بلا کی لوچ اور جدت ہے ان دونوں گلوکاراؤں کی آواز میں۔ ان کے کئی کئی والیوم میوزک کی دکانوں میں دستیاب ہیں۔

نرسر سے لوگ واقف نہیں۔

یہاں انسانی حقوق کی تنظیم کے پرچم تلے منظّم اجتماع میں لوگوں نے کہا:

* چوریاں عام ہیں۔ دکانوں پر ڈاکے پڑنے لگے ہیں، قتل کی وارداتیں بڑھتی جا رہی ہیں، کسی قاتل کو پکڑا نہ گیا۔
* پولیس والے چرسی ہیں، ہیروئنی ہیں۔

* محکموں میں ترقیاں نہیں ہوتیں۔ مقامی افراد کو روزگار دینے کی بجائے باہر کے لوگوں کو نوکری دی جاتی ہے۔
* گیس کمپنی میں 65 فیصد لوگ باہر سے لائے گئے ہیں۔
* بھرتی شدہ مقامی لوگوں کو بہت تنگ کیا جاتا ہے۔
* مقامی لوگوں کو گیس کمپنی تنخواہ کم دیتی ہے باہر والوں کی بہ نسبت۔
* گوادر سے پسنی تک پانی نہیں ہے۔ لوگ کئی کئی ہفتوں تک نہا نہیں سکتے۔ پینے کے لیے ترستے ہیں۔ پانی خریدتے ہیں، پانی پہ لڑتے ہیں۔ بندھ باندھ کر پانی جمع کیا جا سکتا ہے مگر سرکار نہیں کرتی۔
* انٹر کالج کو ڈگری کالج اپنے وزیر تعلیمی کے دور میں ڈاکٹر مالک نے بنایا تھا۔ اسے باضابطہ ڈگری بنایا جائے۔
* بے روزگاری عام ہے، نوکریاں دی جائیں۔
* سمندر بردی کا مسئلہ شدید ہے، سمندری کٹاؤ سے مکانات تباہ ہو رہے ہیں، حفاظتی پشتے بنائے جائیں۔
* گھنٹہ بلڈوزر ٹریکٹر نہیں ملتا۔
* زرعی بینک قرضے نہیں دیتا۔
* کلاس فورتھ کی ملازمت کے لیے بھی انٹرویو کوئٹہ میں ہوتے ہیں۔ بہت پیسہ خرچ ہوتا ہے، نہ بس ہے، نہ ٹرانسپورٹ اور نہ ملازمت ملتی ہے۔ انٹرویو یہیں گوادر میں ہونے چاہئیں۔
* زمینوں پر بااثر افراد نے قبضہ کر رکھا ہے، انہیں واگزار کیا جائے۔
* گوادر میں مقامی لوگوں کے لیے رہائشی جگہ نہیں ہے۔ مقامی افراد کو پلاٹ الاٹ کیے جائیں۔
* کوسٹ گارڈ بہت تنگ کرتی ہے۔

کچھ اضافی سفارشات تو مجھ حقیر پُرتقصیر نے بھی مرتب کیں:

* ساحلی مینجمنٹ کو قومی، صوبائی اور مقامی پالیسی سازی اور منصوبہ بندی میں مکمّل حصہ ہونا چاہیے۔
* آبادی کی صلاحیتیں اور مہارتیں بڑھائی جائیں تاکہ ہاربروں، لینڈنگ جیٹی اوں اور ساحلی حفاظتوں کے لیے سروے، منصوبہ بندی، تعمیر اور مرمت میں مناسب افرادی قوت اور ٹیکنالوجی کو ترقی دی جا سکے۔ اس مقصد کے لیے میرین انجینئرنگ میں کمرشل ماڈلز، سمولیشن وغیرہ جیسی ترقی یافتہ ٹیکنالوجی حاصل کی جائے اور یہاں استعمال کی حوصلہ افزائی کی جائے۔
* ساحلوں کی دیکھ بحال اور مرمت کے لیے تلچھٹ کے جمع ہونے اور جہاز رانی کے چیلنجوں کے بین الاقوامی ماہرین اور ایجنسیوں کے تعاون سے مطالعے کیے جائیں تاکہ سب سے بہترین ممکنہ اور مناسب دام کی ٹیکنالوجی حاصل کی جائے تاکہ چینل میں ایک جہاز رانی کے قابل گہرائی برقرار رکھی جا سکے۔
* پورے ساحل کے ساتھ ساتھ پکی سڑکیں ہونی چاہئیں۔ ان سے ماہی سے وابستہ صنعتوں میں سرمایہ کاری کے راستے کھل جائیں گے۔

****

مکران میں کسی سیاسی پارٹی کا کوئی عورت ونگ نہیں ہے (ان کے پاس تو کسان اور مزدور ونگ بھی نہیں ہیں!)۔ یہاں عورت کی معاشی آزادی کو ابھی تک سماجی آزادی میں بدلا نہیں گیا اور یوں یہاں پہ باقی بلوچستان کی طرح مرد کی بالا دستی والا سماج قائم ہے۔ عورتیں ماہی گیری کے علاوہ زراعت، لائیوسٹاک، قالین بافی، چمڑے اور پیش کا کام کرتی ہیں۔ یہاں خواتین دکان چلاتی ہیں۔ کچھ عورتیں لیڈی ہیلتھ ورکرز بنی ہیں اور کچھ سکول ماسٹری میں آ گئی ہیں۔

ساحلِ بلوچستان وہ واحد مقدس خطہ ہے جہاں یک زوجگی کا رواج ہے۔ یہاں نہ تو [redacted] ہے نہ [redacted]۔ یہاں بھی بلوچستان کے دوسرے علاقوں کی طرح (گو کہ ذرا مختلف

شکل میں)لب کا پیسہ ادا کر کے ہی شادی کی جا سکتی ہے ۔ رشتہ لڑکی کا باپ طے کرتا ہے ، ماں نہیں ۔ لب میں سونا (سھر)، زمین (میراث)، دلہن کے بیس جوڑے کپڑے (پرداچ) وصول کیے جاتے ہیں ۔مگر یہ زمین اور سونا ہر دوسرے بلوچوں کی طرح لڑکی کا باپ ہڑپ نہیں کرتا ، یہ لب (زمینی جائیداد اور زیورات) دلہن کی ذاتی ملکیت بن جاتا ہے ، جس کو استعمال کرنے کا ہر طرح سے اُسے حق ہوتا ہے ۔ عورت زندگی بھر صاحبِ جائیداد ہوتی ہے اور شوہر اُس پر منحصر ۔ اسی لیے دوسری شادی رچانے کے لیے اس کے پاس لب ہوتا ہی نہیں ۔ یہ شوہر اپنی بیوی پر بے جا تشدد وغیرہ بھی نہیں کر سکتا ۔ باالفاظ دیگر مکران کی عورت بلوچستان کی اپنی دوسری بہنوں کی بہ نسبت زیادہ مضبوط پوزیشن میں ہوتی ہے ۔ وہ وراثت میں بھی حصہ پاتی ہے ۔ یہاں خاوند کی حیثیت بیوی کے مقابلے میں ثانوی ہوتی ہے ۔ اس کے پاس جو کچھ تھا ، وہ اس نے لب میں اسے دے دیا ہے اور چنانچہ وہ اپنی بیوی کا ایک لحاظ سے دست نِگر ہوتا ہے ۔ اس پوزیشن میں اولاد پر ماں کا اثر ونفوذ زیادہ ہوتا ہے ۔

طلاق اگر عورت چاہے تو لب سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے ۔ طلاق کو عورت کے لیے برا نہیں سمجھا جا تا ۔ اگر خاوند اُسے طلاق دے تو لب کی جائیداد عورت کی ہو جاتی ہے ۔ بیوہ کو اس کے خاوند کے ترکے کا حصہ ملتا ہے ، لہٰذا مکران میں امیر بیوائیں بہت ہوتی ہیں ۔

48

عجوبے

گوادر ائیر پورٹ شہر سے بارہ کلومیٹر دور ہے ۔ ضلع گوادر میں کل چار ائیر پورٹ ہیں ۔ اور ماڑہ ، گوادر ، پسنی اور جیونی ۔ گوادر اور پسنی تو انٹرنیشنل ائیر پورٹ ہیں (انٹرنیشنل کے لفظ پہ نہ جائیے ، بلوچستان میں اس لفظ کی سٹی گم ہو جاتی ہے) جب کہ اوڑ مارہ اور جیوانی تو بس ، ویسے لوکل بسوں والے ائیر پورٹ ہیں ۔ گوادر ائیر پورٹ کا رابطہ کراچی ، تربت ، جیوانی اور مسقط سے ہوتا ہے ۔ یہ جہاز بھی زبردست جہاز ہیں جنہیں ''فوکر'' کہتے ہیں اور یہ ''جوکر'' جب بلوچستان کے کسی دور افتادہ ، بے وارث اور بے آواز پسماندہ کونے میں چلتے ہوں تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ بنے کس سن میں ہوں گے ؟ ، کہاں کہاں سے ناکارہ کر کے فروخت ہوئے ہوں گے ؟ ، اور تب ہم ''جہاز'' کے مالک ہوئے ہوں گے ۔

ہمارے گوادری دوست علی ، حمید اور عابد گاڑی سمیت علی الصبح حاضر ہو گئے ۔ ان تینوں کی آپسی سنگت اور ہمارے ساتھ ان کی یاری خدا کرے ہمیشہ سلامت رہے ۔ ہم ہنستے گاتے ، اچھی یادوں کے لین دین اور الوداعی غمگین مسکراہٹوں کے تبادلے میں ائیر پورٹ پہنچے ۔ صبح ابھی بہت سویر تھی ، اس لیے ویرانی بہت تھی ۔ گوادر کا انٹرنیشنل ائیر پورٹ کیا ہے ؛ جیسے بوڑھے کرغیز کی گنج زدہ [illegible]ڑھی جہاں پانی نہ پلانے کی وجہ سے کھجور کے ساڑھے آٹھ پیڑ ارد گرد کو چیچک زدگی کی تصویر بنا رہے ہیں ۔ ہماری نا اہلی ملاحظہ ہو کہ ہم نہ تو نئے درخت لگا سکے ہیں اور نہ ہی گوادر کے روایتی

درخت مثلاً کہور Profopis Spicicgera گز، Tamarix Galica وانچک Ispaghol، پیش Inannorhops Ritchieana اور چغز د کی حفاظت کر سکے ہیں۔

ائیر پورٹ پر دو عدد، اے ایس ایف یعنی ائیر پورٹ سیکورٹی فورس کے سپاہی کھڑے تھے۔ (بلوچستان روزِ ازل سے سیکیورٹی اور فورس کی دونوں انتہاؤں کے درمیان پنگ پانگ بنا ہوا ہے۔ اللہ اسے دونوں رجحانات سے نجات دلائے)۔ سپاہیوں میں سے ایک آصف نامی دبلا پتلا اور بہت ہی زیادہ ''گورے'' رنگ کا گوادری بلوچ ہے، جب کہ دوسرا ایک ہٹا کٹا پنجابی ہے۔ دونوں کے رویوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ بلوچ سپاہی کوشش کے باوجود اپنی گردن اکڑا نہیں پا رہا تھا، جب کہ پنجابی گو کہ غریب ہے، تنخواہ بہت کم ہے، اپنے وطن اپنے پیاروں سے بہت دور خوار خراب ہے، نچلے طبقے سے تعلّق رکھتا ہے مگر رویہ ظہیر الدین بابر والا ہے۔ اتنی بڑی مونچھیں رکھی ہوئی ہیں کہ لگتا ہے کہ مکران میں سمگلنگ کے لیے استعمال ہونے والے مہیب روسی موٹر سائیکل کے ہینڈل ہوں۔ اس بے نیازی سے بات کرتا ہے جیسے جنرل نیازی سے ہتھیار اسی نے ڈلوائے تھے۔ بلوچستان کی سرزمین اور اس کے باسیوں سے اتنی حقارت کرتا ہے کہ نسل پرستی کی سرحدوں کو چھونے والے لیڈر بھی پناہ مانگیں۔ مالک ہونے کا احساس اسے اس شدت سے ہے گویا ٹیکنالوجی، کمپیوٹر، فوکر، سمندر، ماہی، سڑک، بجلی، علم، تہذیب سب اسی کی عطا کردہ ہوں۔ بلاشبہ صوبائی خودمختاری تب ہی حقیقی ہوگی جب ASF، کوسٹل گارڈ اور نیوی کے عام پنجابی سپاہی ''بلوچستان دوست'' رویہ اپنائے گا اور پھر اپنے صوبے میں اپنی نوکری پا کر اپنے صوبے کے لوگوں کی خدمت کرے گا، اور اُس کی جگہ ہمارے اپنے بلوچ لیں گے۔ جنہیں مہذب استاد عوام دوستی کی تربیت دیں گے۔

ہم انہی مشاہدات اور ان پہ مبنی خواہشات میں مستغرق تھے اور کاذب صبح، سچی صبح میں بدلتی جا رہی ہے (اصلی سچی صبح ہونا تو ابھی باقی ہے!) کہ شہر کی طرف سے کچھ ٹویوٹا ڈبل ڈور پک اپ آنے لگے۔ یہاں یہ SSR وغیرہ جیسی بڑی اور بیش قیمت گاڑیاں بطور ٹیکسی استعمال ہوتی ہیں جب کہ باقی بلوچستان میں سرداروں، سردارزادوں اور ان کے باڈی گارڈوں کو ہی یہ سواری نصیب ہوتی ہے۔ مگر

یہ ہماری غلط فہمی ہے کہ مکران میں سرداری نظام نہیں (مجسّم و متشکل سرداروں کے وجود سے سرداری نظام کو وابستہ کرنے کی غلطی!) بس آپ کا دل، سردار پرست ہونا چاہیے، سردار بہت مل جائیں گے۔ مکران لے پالک سرداروں کے گود لینے میں ہمیشہ آگے آگے رہا ہے.....اور سردار کے معاملے میں مشرقی اور وسطی بلوچستان اپنی ضروریات سے زیادہ پیداوار کرتا ہے۔ مکران کی پوری سیاسی تاریخ مشرقی بلوچستان کے سرداروں کی قیادت ہی میں گزری۔ مکران اس نظام کے وجود، قیام اور بقا کے لیے ضروری نظریاتی و سیاسی جواز مہیا کرنے والے دانش وروں کی سرزمین ہے۔ مکران ماضی قریب کے اندر بلوچستان میں ماقبل فیوڈل نظام کی پرورش کا سب سے بڑا گہوارہ رہا ہے۔ مشرقی بلوچستان کے عوام جب اپنے سرداروں سے آزاد ہوں گے تو وہ بیک وقت مکران والوں کو بھی آزاد کرالیں گے۔

ہم پاکستان کی غیر یقینی صورت حال اور غیر یقینی مستقبل کی طرح اپنے سفر اور منزل کے بارے میں بھی غیر یقینی کیفیت میں ائیر پورٹ پر کھڑے رہے۔ تب بالآخر شہر کی طرف سے ایک کوسٹر آئی، جس میں دو آدمی بیٹھے تھے۔ یہ PIA کی کوسٹر تھی۔ ایک شخص نے اتر کر اپنی منکر نکیر جیسی صورت کے ساتھ جہاز کینسل ہونے کی بکواس خبر سنائی۔ ہم دونوں مسافروں کا حال پردیس کے اندر جوا ہار جانے والوں جیسا تھا۔ ہمیں جتنی بری باتیں یاد تھیں، (انگلش میں، اردو میں، بلوچی میں، پشتو، سندھی، حتیٰ کہ پنجابی میں بھی) وہ ہم نے بلوچستان پر داغے جانے والے عبدالقدیر کے غوری میزائل کی رفتار سے کہہ ڈالیں۔ جہاز کی کینسلی ہمارے نزدیک محض آج کی فوجی یا ججی حکومت ہی کی ناروائی نہ تھی بلکہ ہم تو صوبائی ہر سیاسی، غیر سیاسی، نیم سیاسی حکومت نیز وفاق کو ذمہ دار ٹھہرا رہے تھے۔ میں گزشتہ شب گوادر کی شعری مجلس کے ایک نوجوان شاعر (ڈاکٹر انوار جمال کے چھوٹے بھائی) کی مترنم آواز میں کہے گئے اشعار کو دھرانے لگا؛

انیس سو پنجاہ وھشتا
لہتیں المستا
مار داتہ پاکستانہ دستا

یادرہے کہ گوادر 8 ستمبر 1958ء کو مسقط سے پاکستان کے حوالے ہوکر مکران ضلع کی تحصیل بنا تھا۔اس سے پہلے یہاں انڈین کرنسی چلتی تھی۔تقریباً سارے تاجر ہندو تھے۔ پاکستان نے گوادر کو اپنے اندر ملا لیا تو سارے ہندوؤں کو بھگا دیا اومان یا ہندوستان۔ یہ سارے ہندو بلوچی بولنے والے بلوچ تھے۔

آب نوشی

ہمارے گوادر کے میزبان البتہ جہاز کی اس منسوخی پر بہت خوش تھے۔علی بلوچ کے منصوبوں سے بھرے زیرک دماغ کے شیڈول میں ہماری تفریح کے لیے دو تین پروگرام ابھی باقی تھے،جن میں سے ایک تھا، آکڑہ ڈیم کی سیر۔اس ڈیم کی تعمیر سے قبل بحیرہ بلوچ کے تمام ساحلی علاقوں کی طرح گوادر بھی آب نوشی کے سنگین مسئلے سے دوچار تھا۔ پہلے یہ لوگ بھی بلوچستان کے دوسرے علاقوں کی طرح بارش کے پانی کو بڑے بڑے تالابوں میں جمع کر کے سال بھر پینے کے لیے استعمال کرتے تھے۔1998ء میں آکڑہ کور پہ یہ بند تعمیر کیا گیا۔ جو کہ گوادر شہر سے 28 اور ائیر پورٹ سے 16 کلومیٹر شمال کی جانب واقع ہے۔سرکاری اعداد و شمار کے مطابق یہاں سے روزانہ 13 لاکھ گیلن پانی گوادر، پیشکان، جیونی اور آس پاس کے دس گاؤں اور دیہاتوں کو دیا جاتا ہے۔

آبنوشی کا ایک اور ذریعہ [redacted] ہے جو کہ گوادر سے 60 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور اسے سٹینڈ بائی کے بطور پر رکھا گیا ہے۔

اللہ نے ہمارے کوئٹہ اور اسلام آباد کے ''نزدیک بین'' حکمرانوں کو اس سعادت کا اہل ہی نہیں بنایا کہ وہ اولادِ آدم کی سہولت کے لیے سمندری پانی کو پینے کے قابل بنائیں۔ گوادر میں نیوی والوں کا ایک ایسا پلانٹ موجود ہے۔ وہاں سمندری پانی کو چھوٹے چھوٹے تختوں میں جمع کیا جاتا ہے، جنہیں وینائل پلاسٹک کے شفاف شیٹوں سے ڈھانپ دیا جاتا ہے۔سورج کی حرارت میں پانی بخارات بن جاتا ہے اور بخارات وینائل پلاسٹک کے شیشوں پر جمع ہوتا ہے جہاں سے چھوٹی نالیوں

کے ذریعے پانی زیرزمین تالاب میں جمع کیا جاتا ہے۔

چھوٹی چھوٹی ساحلی آبادی کو سمندر کا پانی میٹھا کرنے کے چھوٹے چھوٹے پلانٹ لگا کر، شمسی توانائی یا ہوا والی توانائی دے کر بہت ترقی کی جاسکتی ہے۔ساحل پر ویسے بھی شمسی توانائی کے امکانات بہت زیادہ ہیں۔ ہوا سے بجلی بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔مگر ان لوگوں سے کیا روشنی مانگنا جو صرف اندھیرے بانٹنے کے مشاق ہیں۔

دریائے چم

ائیر پورٹ سے واپسی پر حمید نے سڑک سے بائیں جانب گاڑی اتار دی، کچی سڑک کی جانب یہ جھکاؤ ہماری سمجھ میں نہ آیا جب کہ حمید جان پراسرار طور پر خاموش تھا۔سسپنس اس وقت ختم ہوا جب ہم کچھ دور ایک ٹیکری نما جگہ پر جا کر رکے۔اس ٹیکری پر جا کر دیکھا تو وہ ایک دلدل تھی، جسے گوادری لوگ ''دریائے چم'' (سمندر کی آنکھ) کہتے ہیں۔(ہم بلوچ لوگ اردو والا لفظ، سمندر دریا کے لفظ سے بدل دیتے ہیں، ہم شہر گاؤں کو کہتے ہیں اور بندر کو شہر اور قبیلہ کو قوم کہتے ہیں)۔ یہ چار پانچ فٹ بلندی پر پندرہ فٹ قطر کا دائرہ نما ابھار ہے۔کنارے خشک ہیں اور پھر اندر رفتہ رفتہ نمی ہوتی جاتی ہے اور یہ نمی بڑھتی جاتی ہے حتیٰ کہ مرکز کی طرف کیچڑ ہے۔مزید اندر دلدل اور پھر بالآخر مرکز میں پانی جیسا پتلا میلا اور گرد آلود مائع ہے جہاں سے تین چار سیکنڈ کے وقفوں سے ''گڑوپ'' کی آواز کے ساتھ ایک بڑا سا بلبلا بن کر پھٹ جاتا ہے۔اس آنکھ میں جو بھی چیز جائے، دلدل اسے اپنے اندر کھینچ لیتی ہے۔ہم سے بھی میزبانوں نے سگریٹ کے خالی پیکٹ وہاں اچھالنے کی فرمائش کی اور ہم نے دیکھا کہ کچھ ہی سیکنڈ میں وہ رنگین پیکٹ ہضم ہو چکا تھا۔چنانچہ اگر کوئی مویشی بھی پانی پینے یا کسی اور وجہ سے جائے تو اسے بھی دلدل کھا جاتی ہے۔اسی لیے دریائے چم کے چاروں طرف کانٹے دار جھاڑیاں رکھ دی گئی تھیں۔ایسی فلمیں میں نے بہت دیکھی ہیں۔آج اسے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور وہ بھی اپنے بلوچستان عظیم الشان میں۔یہاں کے بلوچوں کا خیال ہے کہ یہاں سے زیرزمین کوئی سرنگ کئی کلومیٹر دور موجود سمندر تک جاتی ہوگی۔

نمک سازی

''دریائے چم'' کوہِ مہدی کے پاس ہے۔کوہِ مہدی کا نام قبیلہ سنگور کی ایک شاخ مہدی زئی کے یہاں آباد ہو جانے سے پڑ گیا۔ یہ سفید مٹی کا بنا ہوا پہاڑ ہے، جس کی سفید بے ڈھنگی چوٹیاں ہیں۔کوہِ مہدی کے دامن میں دوسری اہم چیز ''نمک کا میدان'' ہے۔ یہ خاصی دلچسپی جگہ ہے۔لوگ یہاں سمندر کے قریب تقریباً پانچ فٹ گہرا گڑھا کھود لیتے ہیں جہاں سمندری پانی رس رس کر آتا ہے اور گڑھے بھر جاتے ہیں۔ پھر اس پانی کو نکال نکال کر قریب ہی بنائے گئے بالشت بھر بنائے گئے چوکور کھڈوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ جب سورج کی شعاعوں میں یہ پانی بخارات بن کر اڑ جاتا ہے تو باقی نمک رہ جاتا ہے جسے اکٹھا کر کے دو سو روپے فی بوری کے حساب سے بیچتے ہیں۔ ماہی گیر اس نمک کو مچھلی کو خراب ہونے سے بچانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ یہ ''زری وہاڈ'' کے نام سے پورے بلوچستان میں مشہور ہے۔ جہاں لوگ اسے حیوانات بالخصوص گھوڑوں کے علاج معالجے میں استعمال کرتے ہیں۔لیکن ساحل پہ ماہی گیر اسے اپنی مچھلی پہ لگاتے ہیں تاکہ خراب نہ ہو۔

نمک کے میدان کی طرف آتے ہوئے دور سے سفید اور مٹیالے نمک کی ڈھریاں الگ الگ نظر آنے لگتی ہیں۔ جو بالترتیب اعلیٰ اور کم اعلیٰ اقسام ہیں۔

******

ساحل سمندر میں وہ سمندری مظاہر اور خصوصیات موجود ہیں جو معدنیات اور تیل پیدا کرنے کے ذرائع بنا سکتے ہیں۔کرومیم، ٹائٹانیم، اور، روٹائل وغیرہ۔ بلوچستان کے ساحل پہ زنک، کاپر اور سلفائڈ بہت ہے۔ نیز اس کی تہوں کے اندر منگنیز اور کوبالٹ کے ذخائر وافر مقدار میں موجود ہیں۔

ائیر پورٹ پہنچنے کے بعد سے اب تک علی بلوچ تین دفعہ نسوار کھا چکا تھا، امیر الدین چار گولڈ لیف نوش کر چکا تھا، عابد اور حمید چار چار اور طارق تین گھنٹوں کو تڑ پا تڑ پا کر، سسکا سسکا کر مار چکے تھے۔گوادری لوگ پان اس شوق سے کھاتے ہیں جس شوق سے کھیتران بگٹی، مری، مزاری، عمرانڑیں اور جکھرانڑیں بلوچ آپس میں جنگ وقتل کرتے ہیں۔ آپ اندازہ کریں کہ کہیں دعوت ہو، پر تکلّف

دعوت، جہاں مرغن کھانا کھایا ہو، زبردست سویٹ ڈش کے مزے لیے ہوں اور اس کے بعد اچانک اس کی بے عزتی اس طرح کی جاتی ہو کہ وہ (تقریباً سب کے سب) جیب میں ہاتھ ڈالیں اور وہاں سے زنگ آلود پان نکال کر منہ میں ڈالیں، تو ہمارے دل پہ کیا تیر چلتے ہوں گے۔'' پانے دروں، پانے بروں.....'' اس پان بد بخت نے سارے گوادریوں کے منہ میں لقوہ کر دیا ہے، ان سب کے منہ ٹیڑھے ہیں، ان کا تلفّظ اس طرح بن چکا ہے جیسے ہر وقت اپنا تھوک باہر نکلنے سے روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ہر وقت منہ میں سرخ لعاب ہوتا ہے، دانت سرخ، زبان سرخ، ہونٹ سرخ، جیسے بھیڑیا ابھی ابھی چرواہا نہالان کے دنبے کو چیر پھاڑ کر آرہا ہو۔عورتوں اور مردوں کا حسن پان نے چاٹ رکھا ہے۔کراچی کے مہاجر ویسے بدنام ہیں۔ ورنہ بلوچ ایشیا کی سب سے بڑی پان خور قوم ہے۔ یہ بے فائدہ، بے رونق، بے مذہب اور بے تہذیب نشہ بلوچ کی بلوچیت والی شان کا ایک بڑا دشمن ہے، اسے ہر حال میں دیس نکالا چاہیے۔

ہم ''دریائے چم'' کا نظارہ کر رہے تھے، اس دلدل پر پتھر پھینک کر آہستہ آہستہ نگلے جانے کا عمل دیکھ رہے تھے کہ حمید نے پی آئی اے کی گاڑی ائیر پورٹ کی طرف جاتے دیکھی۔ ہم بھی فوراً اس کے پیچھے ہو لیے۔ائیر پورٹ پر جا کر پی آئی اے کے سیکنڈ ان کمانڈ جلیل نے بتایا کہ پی آئی اے کو تو کینسلی کا روزہ مرہ کا دورہ پڑ چکا ہے مگر ''سیف'' نام کا ایک نیا ادارہ اپنی ایک پرواز شام کو چلا رہا ہے کراچی کے لیے۔ ہم ایسے خوش ہوئے جیسے جرمنی میں کمیونسٹ پارٹی کے الیکشن جیتنے کی خبر ہو، جیسے ہماری نئی کتاب چھپنے کی اطلاع ہو، جیسے محبوبہ نے اچانک فون کر کے ملنے کا عندیہ دیا ہو۔حمید بلوچ کی گاڑی پر دوڑے دوڑے شہر گئے اور سیف والوں کے دفتر میں داخل ہوئے۔ وہاں برادرم ڈاکٹر حئی اور ڈاکٹر مالک کی بلوچستان نیشنل موومنٹ کا ایک دوست ملا جو کہ اس کمپنی کے مقامی دفتر میں شراکت دار ہے۔ایک بھیڑ میں کسی سیاسی کارکن سے ملاقات کا اپنا ہی مزہ، اپنا ہی لطف ہوتا ہے.....سیاست دنیا میں انسان کی مہذب ترین سرگرمی ہوتی ہے۔ سیاست عوام کا مقدس ترین استحقاق اور اولین فریضہ ہوتی ہے۔ سیاست، انسانیت کی عظیم ترین خدمت ہوتی ہے۔ سیاست کے بغیر ایک معاشرے کا تصور تک محال ہے۔

سیف کے دفتر میں اصل آدمی ایک اور شخص تھا۔ درمیانی عمر، بہت ہی زیادہ موٹا، ایک آنکھ سے نابینا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ہکلاتا بہت تھا، بات کرتا تو پورا جسم یوں جھٹکے کھاتا جیسے چیخوف کے وارڑ نمبر 6 کا ماہر نفسیات اپنے ایک مجنون مریض کو بجلی کے جھٹکے دے رہا ہو۔ سب سے بڑی خبر یہ ہے کہ اس شریف آدمی تک کو بھی روزہ تھا۔ سیاسی کارکن ہونے کے ناطے ہم برگزیدہ لوگ تصور ہو رہے تھے اور اس لیے ہمیں ترجیحی طور پر ٹکٹ مل گیا اور تین بجے شام جہاز کی اڑان کا وقت طے ہوا۔ ہم نے جلد جلد کہدا رمضان کو تلاش کیا۔

''کہدا'' کا لفظ یہاں سفید ریش (عمر میں نہیں، عہدے میں) کے بطور استعمال ہوتا ہے، وڈیرہ، ملک، معتبر اور میر، جیسا ٹائٹل۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ مکران کی جدید تاریخ اوپری طبقات کی تاریخ ہے، جن کے اثر و اقتدار اور ظلم و جبر نے انسانیت کو بہت عرصہ تک شرمندہ کیے رکھا۔ ان کا اقتدار لامحدود تھا۔ یہ لوگ انگریز سے قبل بھی بہت بڑے فیوڈل بیرن تھے۔ اس اقتدار کی ہائرارکی یوں ہوتی تھی: خان قلات.....پھر اس کے ماتحت نواب مکران.....نواب کے نیچے میر.....اور میر کے بعد کہدا۔ اس ہیرا کی میں گچکی، نوشیروانی، میرواڑی اور بزنجو قبیلہ شامل تھے۔ کہدا کے پاس ریونیو فری زمینیں ہوتی تھیں۔ میر کو تو پنچک بھی معاف تھا اور ''زرشاہ'' بھی۔ یہ مقتدر اگر عام آدمی کو قتل کر دیتے تو کوئی خون بہانہ ہوتا تھا۔ اور یہ کام وہ کرتے بھی بلا کسی روک ٹوک کے تھے اور بہت زیادہ کرتے تھے۔ وہ بغیر کسی وجہ کے قتل کر سکتے تھے، اور بے عزتی کر سکتے تھے۔ ان کے ماتحت آبادی بغیر کوئی وجہ سمجھے سوچے، بغیر اچھائی برائی کا تمیز کیے، ان کی آواز پر ہر لڑائی، ہر قربانی کے لیے جوق در جوق روانہ ہوتے تھے۔ اہلِ اقتدار کا طبقہ، کاوَدھا کے ذریعے انتظام کاری کرتا تھا۔ جو زمین رکھنے والی چھوٹی چھوٹی کمیونٹیز کے سربراہ تھے۔ یہ کہدا سب سے نچلے درجے کا مقتدرہ شخص ہوتا تھا۔ یہ سفید ریشی کیا کرتا تھا۔ یہ میر کو بیگاری دلاتا تھا۔ اس کے عوض اسے ''پنچک'' نامی ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا جاتا تھا۔ تقریباً دس کہدا پر ایک میر ہوا کرتا تھا۔ کہدا اپنی کمیونٹی میں آج بھی نسبتاً زیادہ اثر رکھتے ہیں۔ مگر کہدا گیری میں اب وہ کشش، اختیار، کبر اور اکڑ نہیں رہ گئی کہ دنیا بہت بدل چکی ہے.....کہ دنیا کو حتماً بدلنا تھا۔

52

'آئی آگ مانگنے، گھر کی مالکن بن بیٹھی!'

کہدا رمضان تو غریب ہونے کے علاوہ بھی بہت پیارا انسان ہے۔ وہ بزنجو صاحب کا سیاسی مرید ہے۔ بزنجو صاحب مکران بھر کا سیاسی پیشوا ہے۔ یہاں جس سیاسی بزرگ سے بھی ملو، وہ ایک ہی نشست میں، اپنی عام گپ شپ میں، بزنجو کے بے شمار اقتباسات، کتنے قصے اور کتنے اقوال سناڈالے گا۔ بلوچستان کے دور افتادہ اس گوشے کے گہرے سمندروں پہ جس شخص کو یاد کیا جاتا ہے، وہ غوث بخش ہے۔ (بابا، بلوچ سمندروں کا دیوتا ہے)۔

رمضان، بلوچستان کا غم کھاتا ہے، بلوچوں کے بارے میں سوچتا ہے۔ ماہی گیروں کی آواز ہے وہ۔ اپنے مخصوص اور خوب صورت انداز میں بات کرتا ہے۔ میں ساحلِ بلوچستان کی فہم و فراست کی عظیم وسعتوں میں سے بہت کم موتی چن سکا ہوں۔ آئیے آپ بھی کہدا رمضان کو سنیے:

''بی بی سی والا آیا تھا۔ اس نے ہم سے کہا، ''جہالت بری چیز ہوتی ہے۔ ظلم بہت بڑی نعمت ہے۔ تم لوگ بچوں کو کیوں نہیں پڑھاتے ہو؟''۔ میں نے کہا۔ ''اڑے، تم خود پورا نہی (نہیں) ہے، مکمّل نہی ہے۔ جاؤ دوبارہ پڑھو، بالکل اَن پڑھ ہو۔ آٹھ بچے ہیں میرے، مہنگائی ہے، سب بے روزگار ہیں، کشتی یہی ایک ہے میری، کہاں سے پڑھاؤں گا؟''۔

فلسفی رمضان نے بلوچی کی یہ ضرب المثل بھی ہمیں بتائی کہ ''غریب ظالم ہو تو اس کا گھر جلے گا۔ حاکم ظالم ہو تو اس کا ملک جل جائے گا''۔ (ملک کا جل جانا بھلا اور کس کو کہتے ہیں!!)۔ کہدا

رمضان سے ہم نے اس کی کشتی مانگی اور اس کے بیٹے نے ہمیں کشتی پر بٹھا کر دو گھنٹے تک سمندر کی سیر کرائی۔ میں نے جب اس نوجوان سے ہاتھ ملایا تو دیکھا کہ اس کا ہاتھ پتھر کی طرح سخت تھا، مجھے اپنے ہاتھ کی نرمی ناز کی پہ شرم آئی۔ نیلا گہرا سمندر، پانی یخ سرد، لہر (چول) کے چھنٹے ہونٹ پر پڑیں اور آپ زبان ہونٹ پر پھیریں تو اس کی نمکینی زبان کو جیسے کاٹ ڈالتی ہے۔

وہاں سمندر سے ساحل پہ ایک خوب صورت عمارت نظر آتی تھی۔ یہ تھا ڈی سی ریسٹ ہاؤس۔ (گوادر میں ڈپٹی کمشنر بیٹھتا ہے۔ گوادر جولائی 1977ء میں اس وقت ضلع بنا جب مکران کو ڈویژن کا درجہ دیا گیا۔ یہ دو سب ڈویژنوں پر مشتمل ہے: گوادر اور پسنی۔ گوادر کے سب ڈویژن میں تحصیل گوادر، تحصیل جیوانی، اور سب تحصیل سنٹ سر شامل ہیں جب کہ پسنی سب ڈویژن میں تحصیل پسنی، اور اور ماڑہ شامل ہیں)۔ ڈی سی ریسٹ ہاؤس کا مقامی نام ''چار پادگ'' (چار ٹانگوں والا) ہے۔ یہ واقعتاً چار ستونوں پر کھڑا ہے۔ یہ محل مسقط کے سلطان کے والی کا گھر ہوا کرتا تھا۔ خدا کا کرنا یوں ہوا کہ سید سلطان (احمد بن سید کا پانچواں بیٹا) اپنے بھائی سے جھگڑ پڑا اور اس سے شکست کھا کر بلوچستان بہ مقام زیک کولواہ میرواڑیوں کے قلعہ بند گاؤں بھاگ آیا۔ یہاں سے میر داد کریم میرواڑی اسے اپنے ساتھ مکران سے خاران لایا جہاں سے نوشیروانی قبیلہ کا سردار میر جہانگیر اس کے ساتھ ہو گیا۔ اور وہ قلات میں خان نصیر خان اول کے دربار میں حاضر ہوئے اور بھائی کے خلاف عسکری مدد مانگی۔ خان نے اومان کے تخت کے حصول کے لیے فوجی مدد دینے کی اس کی درخواست تو مسترد کر دی البتہ بلوچستان میں اس کی عارضی جلاوطنی کے عرصے کے لیے گوادر اور اس کی بندرگاہ اخراجات پورے کرنے کے لیے اسے عارضی طور پر دے دی۔ خان نے گوادر کے ریونیو میں سے قلات کا مقررہ حصہ اسے دے دیا تا کہ وہ اپنا گزارہ کرتا رہے۔ کہتے ہیں کہ ریونیو 7000 ہزار ڈالر کا وصول ہوتا تھا، جسے تین حصوں میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ 3000 ڈالر لچکی نواب اپنی جیب میں ڈالتا تھا، 3000 قلات کا حصہ مسقط کے والی کو ملتا تھا، اور بقیہ 1000 ڈالر جو کہ ریونیو جمع کرنے کے لیے خرچہ کے لیے تھا، وہ بھی مسقط کا یہی پناہ گزیں شہزادہ وصول کرتا تھا۔ وہی شہزادہ یہاں کے حکام کا تقرر کرتا

تھا۔ یہ حضرت بالآخر 13 برس بعد 1997ء میں مسقط کی سلطنت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ سابقہ پناہ گزیں اور حال کے اومان کے حکمران نے گوادر کو ایک Dependency (غیر آزاد علاقہ) بنا دیا۔ اس نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا، ایک فوجی گیریزن متعیّن کی اور سیف بن علی نامی ایک شخص کو یہاں کے لیے والی مقرر کیا۔ یہ ''چار پادگ'' اسی والی صاحب کا دولت خانہ ہوا کرتا تھا۔ مانگے کا دولت خانہ۔

یہ والی موالی بھی دلچسپ لوگ ہوتے ہیں۔ دوسرے ملک میں ایک پناہ گزین شہزادے کا والی کس قدر حقیر ہو سکتا ہے..... آیئے ظہور شاہ ہاشمی کی زبانی سنتے ہیں: ''والی سب سے بڑا اسمگلر ہے۔ علاقے کے لوگ اناج کے ایک ایک دانے کو ترستے ہیں، گھی علاقے میں نایاب ہے..... مگر یہ والی چوروں سے در پردہ میل جول رکھتا ہے، چوری چھپے غلہ، گھی اور شکر دوسرے ملکوں کو بھجواتا ہے۔ یہی چور اور سمگلر دن کے اجالے میں والی کے دربار میں متمکّن ہوتے ہیں، اس کے احباب و ندیم ہیں۔ علاقے میں جو کچھ ہو رہا ہے سچ جھوٹ سب والی تک پہنچاتے ہیں اور اپنی جگہ بناتے ہیں۔ والی ان کی باتیں سن کر یقین کر لیتا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو سرکار دربار میں عام لوگوں کی جھوٹی، سچی حمایت کرتے ہیں اور رشوت کھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ والی کی عیاشی کرنے کے لیے اس کے دلال بھی بنتے ہیں''۔ (1) (ویسے بائی دی وے، اب بھی کچھ خاص نہیں بدلا سوائے ناموں کے)۔

واضح رہے کہ یہ سید سلطان بن احمد بن سید 1804 میں مر گیا۔ مگر گوادر مسقط ہی کے ساتھ رہا۔ ان کے بیٹے کی حکمرانی کے دوران سر باز کے بلیدیوں کے سردار دوستین نے گوادر پر قبضہ کیا لیکن مسقط سے بھیجی گئی فوج نے گوادر کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس طرح صرف شہر و بندرگاہ ہی نہیں بلکہ پورا علاقہ مسقط کا تھا، اس میں گوادر ساحل کا مشرق اور مغرب، اور علاقے کی ریتلی پٹی شامل ہیں جہاں سے جبل مہدی، کوہِ درامب اور دیگر چھوٹے چھوٹے پہاڑ ابھرتے ہیں۔ ان پہاڑوں کے قابلِ کاشت دامن (بلوچی میں ''نگور'') بھی اسی کے تھے۔

انیسویں صدی کے اوائل تک اومان کا سلطان بحرین، گوادر و چاہ بہار کے سواحل، سکوترا کا

جزیرہ، کیور یا ماریا جزائر، زنجیبار، اور ''سب صحارائی'' افریقی سواحل پر بادشاہی کرتا تھا۔

اور یہ جو آپ کو افریقہ میں بلوچ نظر آتے ہیں، یہ بھی اسی زمانے کی بدبختی کی علامتیں ہیں۔ انہی اومانی سلطانوں اور ان کے والیوں نے چار سو سال قبل گھیر گھار کر انہیں افریقہ میں اپنی سلطت کی توسیع کے لیے وہاں ہانک دیا تھا۔ پہلے پہل تو ان کے ہاتھوں پرتگالی حملہ آوروں کو مروادیا، پھر مزروئی بغاوت کو کچلوا دیا، اور پھر علاقے میں اپنے محلات اور اہم مقامات کی حفاظت پر انہی بلوچوں کو مامور کر دیا۔ ایسے لوگوں کی تاریخ نہیں لکھی جاتی مگر پھر بھی ممباسا میں فورٹ جیزس کا ان کا محاصرہ اور وہاں سے پرتگالیوں کو مشرقی افریقہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال باہر کرنے کا احسان تو پورے افریقہ کے باشندوں کو نہیں بھولتا۔

بلوچ ساحل کے یہ لوگ 1840ء کی دہائی تک ممباسا، دارالسّلام، زنجیبار اور پمبا میں فوجی چھاؤنیوں میں فرائض انجام دیتے رہے۔ انہوں نے مقامی عربوں اور سواہیلیوں میں شادیاں کیں اور ان کے معاشرے میں گھل مل گئے۔ اور پھر ان کے خاندانوں کے اور لوگ بھی وہاں آنے جانے اور رہنے لگے۔ اور پھر انہوں نے کانگو میں، جوگو اور بونیا میں، بستیاں بسائیں، یوگنڈا میں سروتی، اروآ، اور کمپالا میں آبادیاں بنائیں۔ اور تنزانیہ میں ارنگا، ٹابورا، ایمبیا اور روجیوا میں محلے آباد کیے۔ ممباسا میں تو وہ تجارت اور ملازمت کرنے لگے اور یوگنڈا اور تنزانیہ کی زرخیز زمینوں پر جا بسنے والے بلوچ، فارمنگ اور تجارت میں لگ گئے۔ تجارتی مہارت اور بہترین بزنس مین ثابت ہونے پر انہیں پورے افریقہ میں عزت و توقیر نصیب ہوئی۔ دارالسّلام کے بلوچوں نے بھی ممباسا کے بلوچوں کی طرح شہری لائف سٹائل اپنایا۔ یہی کچھ نیروبی والے بلوچوں نے کیا۔ پھر بلوچی زبان نے ایسٹ افریقہ کی سواحلی زبان کو جگہ دی اور بلوچی روایتی تہذیبی قدروں نے بھی پسپائی اختیار کی۔ مگر اس کے باجود بلوچستان کے بلوچوں کی طرح انہیں اپنی شناخت سے پیار تھا اور پیار ہے۔ اپنے بچوں کے بلوچ نام رکھنا، اپنی زبان کی حفاظت کے لیے کوشش کرنا، شادی بیاہ کے بلوچ رسوم کی حفاظت کرنا۔

ہم اُس زمانے کے گوادر کی بات کر رہے تھے۔ ڈاکٹر اسماعیل، مشہور مصنّف محمد علی خان

کے حوالے سے مسقط کے تحت گوادر کی حالت یوں بتاتا ہے۔ ''اس زمانے میں یہاں دو سو دکانیں تھیں۔ ہر دکان پر تین روپے (ہندوستانی) محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایک دکان کا سالانہ کرایا 32 روپے تھا۔ یہاں کے مکانات گچ، پتھروں اور مٹی سے بنائے جاتے تھے اور انہیں کھجور کی شاخوں سے ڈھانپا جاتا تھا۔ یہاں اندرون مکران کے علاقے سے آنے والے تجارتی قافلے کھجوریں، تیل، کھالیں اور اون لاتے تھے۔ گوادر کے باشندے ماہی گیری کے پیشے سے منسلک تھے، اس لیے یہ اپنی مچھلی ان پر بیچتے تھے۔''(2)

انگریز نے پہلے پہل تو گوادر بندرگاہ مسقط کے بادشاہ سے خریدنے یا پٹے پر لینے کی ٹرائی ماری۔ مگر اُس نے نہ دیا۔ البتہ انگریزوں کو ممبئی اور کراچی کے درمیان سمندری راہ گزر اور پھر وہاں سے گوادر تک ٹیلی گراف کی تاریں بچھانے کی اجازت دے دی۔ امام مسقط سید سالم نے انگریزوں کو ایک قطعہ اراضی گرجے اور قبرستان کی تعمیر کے لیے دے دیا۔ انگریزوں نے یہاں ٹیلی گراف کا مرکز قائم کیا اور مشرق میں بمبئی اور مغرب میں بصرہ سے آنے والے بحری جہازوں کے لیے لائٹ ہاؤس تعمیر کیے۔

19ویں صدی کے دوسرے نصف میں برطانیہ نے خلیج فارس میں باقاعدہ ایک شپنگ لائن کھول دی جو مکران کے ساحلی قصبوں کو ایک طرف خلیج فارس کے ملکوں کے ساتھ ملاتی تھی تو دوسری طرف ہندوستان کے ساحلی شہروں سے انہیں جوڑتی تھی۔ ''برٹش انڈیا سٹیم نیویگیشن کمپنی'' کے سٹیمر اور ماڑہ، پسنی اور گوادر کے بلوچ ساحلی شہروں پر ایک ہفتہ چھوڑ کر اگلے ہفتے آتی تھیں۔(3)

اس بلا کے آنے سے ہمارے ماہی گیر، تاجر اور قزاق سب کی کمریں ٹوٹ گئیں۔ اتنی بڑی ٹیکنالوجی کا مقابلہ ہم ڈھاڈری بندوق والے کیا کر پاتے؟۔ لہٰذا بلوچ کی طویل مسافتی کشتی رانی، زوال پذیر ہوئی۔ مگر انڈیا، سری لنکا، بحرِ احمر کے ساحلوں چین اور ایران، عراق اور مشرقی افریقہ کے ممالک تک بلوچ سمندری تجارت بہت عرصہ بعد تک بھی بہر حال جاری رہی۔

زمین اور سرزمین کی اہمیت کا اندازہ سمندر کے اندر دور جا کر ہو سکتا ہے۔ سمندر بہت خوف ناک مقام ہوتا ہے۔ دنیا میں اسی کا تسلّط ہے۔ زمین تو اتھاہ اور مہیب سمندری دنیا میں بس ایک جزیرہ ہے۔

حوالہ جات

1- ہاشمی،ظہور شاہ،غوث بخش صابر''نازک''اکیڈمی آف لیٹرز پاکستان۔صفحہ 48

2- دشتی،ڈاکٹر اسماعیل،محمد صادق بلوچ،''بلوچ تاریخ اور عریب تہذیب''،صفحہ نمبر-547

3- گزیٹر۔مکران۔صفحہ 228

55

گوادر واپس جانے نہیں دیتا!

ہم سمندر کی سیر سے دو بجے واپس ساحل پہ آئے تو عابد کے گھر سے اپنا سامان اٹھایا۔اس کی محترمہ والدہ اور بیگم نے بڑی محنت اور لگاؤ سے ہمارے لیے شاندار کھانا بنایا تھا مگر ہم، بد بخت جہاز کے لیٹ ہو جانے کے ڈر سے ، ان سے ہاتھ جوڑ جوڑ کر معافی مانگتے ہوئے بغیر کھانا کھائے ائیر پورٹ کی طرف دوڑے۔اللہ اُن کی مہمان نوازی کی شان بڑھائے۔اللہ بلوچ عورت کی حرمت سلامت رکھے۔خدا کرے وہ دنیا کی آزاد اور جمہوری زندگی کی نعمتوں سے مالا مال ہو۔

بھئی، یہ لوگ کھانے میں بہت زیادہ مرچیں ڈالتے ہیں۔چٹپٹے کے عاشق ہیں یہ لوگ۔اچار، مصالحے، رنگ، خوشبوئیں، الاچیاں......ہم نے جب عابد کی ماں سے مرچیں کم ڈالنے کی فرمائش کی تو اس نے بہت معصومیت سے کہا،''بھائی، مرچ کے بغیر سالن تو پکانا مجھے آتا ہی نہیں''۔

یہاں ''مذر'' نامی ایک ڈش بہت ہی مقبول ہے۔ یہ ڈش ہم مشرقی بلوچستان والے بھی کھاتے ہیں مگر اِن لوگوں کے مذر میں فرق یہ ہے کہ یہ لوگ اصلی گھی میں آٹا اور کھجوریں ملا کر پکاتے ہیں۔

یہاں خورد ونوش کی ساری چیزیں ایران سے آتی ہیں۔زبردست ٹماٹر، بڑے بڑے سفید پیاز، خشک میوے، تازہ پھل سبزیاں، گھی، آٹا دالیں، پلاسٹک کی چٹائیاں، صابن اور شیمپو۔واٹر کولر، جوتے، قالین، بسکٹ اور مرغی سب ایران سے آتے ہیں۔(یہاں ایرانی مرغی کا ایک مخصوص نام بھی

ہے، جو ہم یہاں نہیں لکھیں گے)۔ پکی پکائی مچھلی، مٹر اور لوبیا کے ٹِن ایران سے سمگل ہو کر یہاں آتے ہیں۔ پیٹرول، کمبل، الیکٹرانک کا سامان، موٹر سائیکل سب وہیں سے آتا ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ ایران سے اگر رابطہ کٹ جائے تو ہم بھوک سے مر جائیں۔ ہماری حکومت 15,216 مربع کلومیٹر کے گوادر کو خورد و نوش کی چیزیں مہیا نہیں کر سکتی جس کی آبادی 160,980 نفوس پر مشتمل ہے۔ اس لیے کباڑی کے کوٹ پتلون اور ایران کا سامان ہم غریبوں کا گذر بسر ہیں۔

اب کے بار ائیر پورٹ پر بہت چہل پہل تھی۔ ہم بہت سارے پان تُھوک کے تابڑ توڑ حملوں کے بیچ سے بچتے بچاتے گزرے اور بالآخر گیٹ پہ آئے۔ دوستوں سے الوداعی جپھیاں ماریں اور سامان کی بھرپور تلاشی دی۔ یہاں تلاشی کے لیے مشینیں، کیمرے، ایکسرے نہیں ہیں، ناپسندیدہ ہاتھ ہیں۔ (تلاشی لینے والے ہاتھوں سے زیادہ بے عزت کرنے والے اور ناپسندیدہ ہاتھ کوئی اور نہیں ہو سکتے۔ دنیا میں تلاشی، تذلیلِ آدم کا بہت بڑا حربہ ہوتی ہے)۔ یہاں ٹیلی فون نہیں ہے، فیکس نہیں ہے۔ کمپیوٹر نہیں ہے.....بس نام ہے اللہ کا، بول بالا ہے سرداری صوبائی حکومت کا، سالمیت پاکستان کی، بادشاہی اے ایس ایف کی.....۔

بورڈنگ کارڈ لے کر نام نہاد لاؤنج میں آ کر بیٹھ گئے۔ لاؤنج کیا ہے، بیس کباڑی کی سستی پلاسٹک کی کمیشن زدہ کرسیوں پر مشتمل ''کمرہ'' ہے، جس کے باتھ روم میں ہاتھ خشک کرنے والی مشین کے سوا کہیں سے ائیر پورٹ کے لاؤنج والی کوئی علامت موجود نہیں ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں، کوئی احتجاج کرنے والا نہیں۔ ائیر پورٹوں کا سارا نظام مرکزی حکومت کے ہاتھ میں ہے اور مرکز اسلام آباد، گوادر سے ہزار میل دور واقع ہے۔ کون احتجاج کرے، کس سے احتجاج کرے؟۔ مرکز کے خلاف احتجاج ویسے بھی وطن کے ساتھ حُب کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ پلاسٹک کی کرسی کی منظوری کا عمل بھی ہزار میل دور سے وابستہ ہے۔ (پاور پاور ہوتی ہے۔ اس کی، نیچے والوں میں تقسیم کے لیے صرف اور صرف عوامی جہد اور اُس کی حتمی کامیابی چاہیے ہوتی ہے۔ وگرنہ پاور تو دنیا میں وہ واحد مظہر ہے جو اَز خود کبھی تحلیل، کبھی بھی نیچے والوں میں تقسیم نہیں ہوتا)۔

ہم ائیر پورٹ پر بیٹھے رہے۔ تین بج گئے۔ چار بج گئے۔ اور پھر پانچ بج گئے۔ سیف جان کا جہاز ابھی آیا کہ آیا۔ اس کا منیجر بے چارہ یہ تک نہیں جانتا تھا کہ جہاز اس خاص سمے پہ تھا کہاں؟ کوئٹہ میں، تربت میں، راستے میں یا پھر سیدھا کراچی نکل گیا؟۔ اور یا پھر بالکل یہ روٹ چھوڑ کر ملتان کی سواریاں پکڑ کر کوئٹہ سے ملتان چلا گیا؟۔ وہ بے چارہ بار بار ہم سے جہاز کے آنے کی دعائیں منگواتا رہا (جب جہاز کا منیجر سواریوں سے دعائیں منگوانے لگے تو سفر کا انت کیا ہوگا؟ جب سائنس کے راستے روک دیے جائیں تو دعائیں طوالت اور تعداد دونوں میں بڑھ جاتی ہیں)۔ مگر دعائیں تو اسباب و علل ہی سے مطابقت رکھنے پر مجبور ہوتی ہیں ناں!، مانگنے میں بھی اور قبولیت میں بھی.....

اور یہاں دعائیں بے کار گئیں۔ پیر مرشد کام نہ آئے، نہ استغفار نہ استسقا۔ نہ تو جہاز تھا، نہ ہی اس کا ہارن۔ سات بجے شام تک اس سنسان ائیر پورٹ پہ (جہاں نہ ائیر ہوسٹسوں کی آمد و رفت دیکھنے میں آتی ہے، اور نہ دیواروں پر چنا گیا کوئی ٹی وی ہمیں فلم دکھانے کے لیے موجود تھا)۔ ہم پاکستان بالخصوص، اور تیسری دنیا بالعموم کی پرائیویٹ سرمایہ داری (بقول یاروں کے ''قومی سرمایہ داری'') کے افلاس مختاجی، اور فالج زدگی پہ غور کرتے رہے۔ جو لوگ پاکستان میں سوشلزم کی تعمیر کی بجائے ''نجی'' سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی کر کے فیوڈل ازم کو اس کے ذریعے ختم کروانا چاہتے ہیں، وہ ''زور آور'' ہیں۔ جہاں ریاست جیسے دیوہیکل ادارے سرمایہ داری کے بحران کے سامنے تنکے بن چکے ہوں وہاں ٹٹ پونجیا، سرکاری بیساکھوں کی پروردہ، منحصر، اپاہج، پیدا گیر، طفیلی اور مفت خورنجی سرمایہ داری منہ توڑ تھپیڑے کیا برداشت کرے گی!!

چنانچہ ہم اسی ''پرائیویٹ'' اور ''قومی'' بورژوازی کے ائیر لائن کے سڑے ہوئے واحد سوزوکی پک اپ کی پائنتی پر بیٹھے، اس کے دفتر واپس آئے، اپنی ٹکٹ کی کینسلی کے پیسے لینے۔ ہم نے اب رسوائی میں ہوائی سفر کے بجائے بذریعہ بس کراچی جانے کا پروگرام بنا لیا۔ مگر معلوم ہوا کہ کراچی کے لیے بسیں نہیں چلیں گی۔ اس لیے کہ ساری بسیں ذکریوں کو لے کر زیارت کے لیے تربت گئی ہوئی ہیں۔

ذکری ماما، ہم تمام بقیہ بلوچوں کی طرح بہت توہمات والے لوگ ہیں۔ ''ذکر'' سے ان کا نام نکلا ہے۔ اس لیے کہ وہ اپنی عبادتوں میں اس کا استعمال زیادہ کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس عقیدے اور مکران میں بلیدیوں کی حکمرانی میں خاصا تعلّق تھا۔ اس کے لیے کہ بلیدیوں کی حکمرانی میں یہ عقیدہ خوب پھیلا اور خوب پھولا۔ گوادر شہر میں 50 فیصد لوگ ذکری ہیں۔ یہاں مچھیروں کی اکثریت ذکریوں کی ہے۔ ظاہر ہے کہ ذکری ہر لحاظ سے پسماندہ ہیں۔ ان کا پیشوا ''ملئی'' کہلاتا ہے۔ آج کل ان کا ملئی داد کریم ہے جو پسنی میں رہتا ہے۔ (یہ صاحب بعد میں فوت ہوا) ملئی، موروثی عہدہ ہے۔

یہاں گوادر میں یہ لوگ زیادہ تر بلوچ پاڑہ میں رہتے ہیں۔ تربت کے برعکس یہاں ابھی تک ذکری اور نمازی باہم شادیاں کرتے ہیں۔ قبرستان، البتہ الگ الگ ہیں کہ ''نان بلوچ'' ملّا بالآخر یہ نفاق ڈالنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ ہم نے یہاں مردانہ ذکر خانہ (عبادت خانہ) بھی دیکھا اور زنانہ بھی۔ جی ہاں پروپیگنڈہ کے برعکس ذکری مرد الگ عبادت کرتے ہیں اور عورتیں الگ۔ یار بلوچ معاشرہ میں یہ کہاں ممکن کہ مخلوط عبادت گاہیں ہوں۔ کتنے ناترس ہیں وہ لوگ جو یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ 27 رمضان کی رات کو مرد و زن بے لباس عبادت نما بداخلاقی کرتے ہیں۔ ناروا اور ناترس لوگ۔ انہوں نے تو ہم بلوچوں کو ایسے پیش کیا جیسے ذکری فرقہ پسماندہ، پہاڑی اور غیرت میں بنیاد پرست بلوچوں کا مذہب نہ ہو بلکہ یہ گویا جدید یورپ کا ہو۔ جھوٹے پر خدا کی ..... (چلو میں ''مار'' لکھتا ہوں)۔

مردوں کا ذکر خانہ مردانہ وجاہت اور بناؤ سنگھار کا نمونہ ہے، جب کہ عورتوں کا ذکر خانہ بلوچ عورت کے سماجی مقام کی طرح بدحال۔

بلوچی میں صبح کی عبادت کو ''بامسار'' کہتے ہیں جو ایک گھنٹہ کی ہوتی ہے۔ جب کہ ظہر اور عشا کو ذکر ہوتا ہے۔ جمعہ کو نماز نہیں ہوتی۔ میں نے جب کراچی میں اپنے ایک غیر مسلم دوست کو بتایا کہ ذکری کا سجدہ پانچ منٹ لمبا ہوتا ہے تو اس نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا، ''جس کے سجدے

اس قدر طویل ہوں، میں اُس میں شامل نہیں ہوسکتا''۔

ذکری اب ہمارے سنی ملا کے اکسانے اور اشتعال دلانے پر بالآخر ایک واحد مذہب بن جائے گا، وگرنہ اب تک تو وہ مختلف علاقوں میں مختلف انداز میں عبادت کرتے ہیں۔ اس کی کوئی مرکزی اور واحد شکل نہیں ہے۔ کوئی بلوچ کہاں پڑا ہوا ہے، کوئی کہیں رہائش پذیر ہے اور رسل و رسائل ہیں نہیں۔ لہٰذا ہر وادی نے اپنی الگ ذکری گیری قائم کر رکھی ہے۔ جونپوری صاحب کے بارے میں ان میں متضاد باتیں ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ وہ آیا تھا مکران، کچھ کہتے ہیں کہ وہ خود تو کبھی نہیں آیا مگر اس کا کوئی چیلا شاگرد آیا تھا۔ اسی طرح کچھ کہتے ہیں کہ وہ شیعت کے قریب ہیں۔ کچھ کو تو کوئی بات معلوم ہی نہیں۔ (ارے بابا اکثریت کو کچھ معلوم نہیں)۔

بلوچ اپنے عقیدوں میں بہت لبرل ہے۔ مگر جب پشین، قندھار، اور جھنگ، ہزارہ کے سارے ملا اکٹھے ہو جائیں اور کلاشنکوف سے مسلح ہو کر ذکریوں کی عبادت گاہوں پر حملہ کرنے تربت پہنچیں، کرفیو کی نوبت آئے، کافر، غدار کے فتوے بٹیں، تو اگلا بھی بلوچ ہے، ضد میں آ کر کوئی بھی اعلان کر سکتا ہے۔ اور توبہ ہے بلوچ کی ضد سے!! اسی ضد میں تو اس نے اپنا وطن بلوچستان، بیگوں کے حوالے کر کے خود کو شاہ حسین کی پناہ میں جھونک دیا تھا۔

ہمیں یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ذکری فرقہ میں کون سا ایسا پیغام، سیاسی معاشی کشش، یا دنیاوی نجات کی بات تھی کہ اِس علاقے کے غلام، چرواہے، ماہی گیر، محنت کش اور نچلے طبقے کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ پنجگور سے لے کر مند اور سیستان تک لوگ ذکری ہیں۔ اس لیے کوئی تو سماجی انصاف کی بات ہوگی اس میں۔ اس ذکری عقیدے کا سماجی پیغام ڈھونڈنا محقّقوں کے لیے ایک اچھا خاصا بڑا چیلنج ہے۔

یہاں کے لوگ ایک دلچسپ روایت کی پیروی کرتے ہیں، جسے مولود کہتے ہیں۔ اس تقریب میں لوگ دائرے میں بیٹھ کر گھنٹہ ڈیڑھ تک اذکار کرتے ہیں۔ یہ تقریب عموماً کسی خوشی کے موقع پر ہوتی ہے جس کے بعد میزبان حسبِ استطاعت دعوت کا انتظام کرتا ہے۔ پھر ایک عجیب

مظاہرہ ہوتا ہے۔ایک لوہے کی زنجیر ہوتی ہے، جسے آگ میں سرخ کر کے لٹکا دیا جاتا ہے۔پھر یہ لوگ ہاتھوں پر تیل مل کر زنجیر پر اوپر سے نیچے لٹکنے کے انداز میں مضبوطی سے ہاتھ پھیرتے ہیں۔اس طرح کرتے ہوئے ان کے ہاتھوں سے شعلے نکلتے ہیں مگر خود ان کا ہاتھ بالکل بھی نہیں جلتا۔مولود، رات کی تقریب ہوتی ہے۔

مگر ''شے پر جا'' دن ہو یا رات، کسی بھی وقت منعقد کی جاسکتی ہے۔اس میں زنجیری کرتب تو نہیں ہوتا لیکن لوگ وجد میں آ کر اپنے بدن میں سوئیاں چبھوتے ہیں، سینے اور پیٹ میں چھرا گھونپ لیتے ہیں۔لیکن نہ تو انہیں درد کا احساس ہوتا ہے اور نہ ہی زخم کا کوئی نشان باقی رہتا ہے۔

یہاں کے لوگ خواجہ خدر (خضر) کو مانتے ہیں۔ان کا خیال ہے کہ وہ سمندروں کی حفاظت کرتا ہے، مگر رہتا ساحلی علاقوں میں ہے۔چابہار میں تو اس کے قدموں کے نشانات بھی ''دریافت'' ہوئے ہیں جو وہاں کے لوگوں کے لیے زیارت گاہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بات ہو رہی تھی اُن بسوں کی جو بجائے کراچی جانے کے ذکری بھائیوں اور بہنوں کو لے کر زیارت پر تربت چلی گئی تھیں۔ہم پھر حمید کے گیراج پہنچے۔اور اس پہ تیسری بار گوادر سے نہ نکل سکنے کی ہزیمت افشاں کی۔بے چارے نے سارے تھکے ہارے میزبانوں کو دوبارہ اکٹھا کیا اور ہم نے اس بار شہر کے اندر ''ساحل ہوٹل'' میں کمرہ لیا اور بلند آواز میں اعلان کیا کہ ہم اب مزید مچھلی نہیں کھائیں گے۔بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ ناشتہ مچھلی، لنچ ڈنر مچھلی، سحری افطار مچھلی، نمازی ذکری مچھلی، ملاملئی مچھلی، اٹھتے مچھلی، بیٹھتے مچھلی.....سری لنکا کے ساحلوں میں یہی حال کھوپرے کے تیل کا ہے۔کھانے میں، لگانے میں، پینے میں، ہوٹل میں، بس میں، ٹیکسی میں، خوب صورت لڑکی کے سر اور بدن پر.....بس آپ کو کھوپرے کی ''خوش'' یا ''بد'' بُو ملے گی۔

یہاں ہوٹل کے ریٹ 800,700 روپے دن کے ہیں۔سہولتیں کیا دے سکیں گے کہ سہولتیں تو ہیں ہی نہیں۔بس باہر دیواروں پر دو کشتیاں لگا دیں، ایک آدھ پرندے کی تصویر، بلوچی کے ایک دو مشہور فقرے لکھ دو..... یہ ہوا جناب ہوٹل۔البتہ ٹی وی نہیں آتا۔یہ ایک لحاظ سے اچھا بھی

ہے کہ پی ٹی وی پہ سوائے جہالت کے کچھ ہوتا نہیں۔(دیگر پرائیویٹ چینل اُس وقت نہیں تھے)۔جغرافیہ میں ان کے پاس ڈوڈہ ہے، اسلام پورہ ہے، سری نگر اور انتت ناگ ہے۔اور تاریخ میں محمد بن قاسم، اکبر بادشاہ، لیاقت علی، غرناطہ، اندلس، بہادر شاہ ظفر، محمد علی جوہر اور سرسید احمد خان ہیں جب کہ سائنس میں عبدالقدیر کے علاوہ ساری دنیا خالی ہے۔حالاتِ حاضرہ ہمارے اپنے سربراہِ مملکت سے شروع ہوتے ہیں اور وزیر اطلاعات پر ختم، جو کسی پل یا بلڈنگ کے افتتاح کے موقع پر باجماعت دعا کرتے دکھائے جاتے ہیں۔(''اللہ اسے کم از کم دو چار سال تک گرنے سے بچا کہ اس کا سارا پیسہ رشوت کمیشن میں گیا، اصل پروجیکٹ تو ریت بجری کا ہے'')۔مگر سیٹلائٹ میں بھی ماسوائے بی بی سی کے کون سا چینل ڈھنگ کا ہوتا ہے۔انڈیا تو سب سے گندے پروگرام دیتا ہے۔بس عورتوں کا دھڑ اور سینہ ہی تڑپتا، تھرکتا اور پھڑکتا رہتا ہے، دو منٹ بعد بندہ بیزار ہو جائے۔انسانی کلچر کو جتنا مردار، انڈین فلموں اور انڈین ٹی وی چینلوں نے کر رکھا ہے، جنوبی ایشیا میں کسی اور نے نہیں کیا۔پاکستان لگاؤ بھی کشمیر، انڈیا لگاؤ بھی کشمیر، پاکستان لگاؤ بھی شیروانی، انڈیا لگاؤ بھی شیروانی، اِدھر بھی سرکار اُدھر بھی سرکار، اِدھر بھی ملا اُدھر بھی ملا۔اِدھر بھی بھوک اُدھر بھی بھوک۔اِس بھوکے کے کندھوں پہ غوری، اُس بھوکے کے کندھے پر پرتھوی، اِس بھوکے کے سر پہ بھی ایٹم بم لادا ہوا ہے، اور اُس بھوکے کے سر پر بھی۔اِس بھوکے کو چاند ماری کے لیے بلوچستان ملا، اُس بھوکے کو راجھستان۔

اس ہوٹل کا اپنا جنریٹر رات بھر بجلی مہیا کرتا ہے۔واپڈا کی ٹی بی زدہ، قحط کی پلی ہوئی نحیف اور قریب المرگ بجلی رات گیارہ بجے کے بعد نہیں ہوتی۔(صرف پسنی میں تھرمل پاور پلانٹ سے 24 گھنٹہ بجلی ملتی ہے اور وہی اور ماڑہ کو بھی بجلی دیتی ہے)۔اس ہوٹل میں ٹیلی فون بھی موجود ہے۔گوادر میں تربت کے برعکس ٹیلی فون بوتھ بہت کم ہیں۔ڈاک کا انتظام تو پورے مکران بلکہ پورے بلوچستان میں ''مٹی دھوڑ'' ہے۔

''ساحل ہوٹل گوادر'' کا مالک ایک تربت والا ہے۔اس میں بیرے لیہ (پنجاب) کے ہیں (جیئے بھٹو)۔ہم نے ڈٹ کر رات کا کھانا کھایا، اس لیے کہ اس میں مچھلی شامل نہیں تھی۔دیر تک

یاروں کے ساتھ گپ شپ کرتے رہے اور رات گئے سو گئے۔

صبح سویرے رمضان زدہ ساحل ہوٹل نے بھی سحری کھانے کے بعد اپنا جنریٹر بند کر دیا۔ ہم نے موم بتی کی ملگجی روشنی میں اپنا سامان پیک کیا، اِسی ''روشنی'' میں اپنا بناؤ سنگھار کیا۔ اور دوستوں کے جھرمٹ میں ایک بار پھر گوادر ائیر پورٹ روانہ ہو گئے۔ مگر اس بار ہجوم تھا، گہما گہمی تھی، لوگ تھے۔ وہی تلاشی، وہی بورڈنگ کارڈ اور بالآخر جہاز آ گیا۔ ہم خوش، جیسے کولمبس کو ساحل نظر آ گیا ہو، جیسے دس سال بعد مردار سولائزیشن کی یہ مردار علامت دیکھنا نصیب ہوئی ہو۔ ہم اس جہاز پر بیٹھے، اور عین مشرق کی سمت بحیرہ بلوچ کے اوپر اوپر سے کراچی کی طرف روانہ ہوئے۔ ہم نے [redacted] الوداع کہنے کا آخری دن بلوچ ساحلی شہر گوادر (بلوچی میں ہوا کا دروازہ، نئے تصورات و خیالات کا آکسیجن) میں گزارا تھا۔ گوادر تو اپنا گھر تھا۔

مگر بے ہودہ سرمایہ داری نظام کی ریاستی کمزوریوں کی وجہ سے اپنے ہی گھر سے نکلنے کی ہمیں جتنی خوشی تھی، اتنی تو عیدالاضحیٰ پر بھی نہیں ہوتی۔ خدا اُن سارے اقتدار والے لوگوں سے بیزار ہو جائے جو گوادر جیسے حسین اور شفاف ساحلی شہر سے مسافر کو بیزار کرا دیتے ہیں۔

علی بلوچ، حمید، عابد اور طارق کے خوب صورت گوادر کی یہ بیزار حالت بنانے والوں کو وقت کا فالج ضرور مارے گا۔

59

حصہ دوم

پندرہ برس بعد

بلوچستان کی سڑکوں پر.....

60

ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو گوادر کے بارے میں سال 2000ء کو لکھی گئی کتاب کا یہ تیسرا ایڈیشن ہے۔

اب 2016ء ہے۔یعنی گوادر کے میرے گذشتہ سفر کو سولہ سترہ برس بیت چکے ہیں۔اکیسویں صدی کے تیزی سے تبدیلیاں لاتے زمانے میں سترہ سال کا عرصہ بہت بڑا ہوتا ہے۔پچھلے زمانوں کا ایک شمسی سال، آج سمجھو گھڑی کے برابر ہوتا ہے۔اِن سترہ سالوں میں ہمارے خطے میں پتہ نہیں کتنے مشرف آصف بنے اور کتنے آصف نوازوں میں ڈھل گئے۔ان پندرہ برسوں میں یہاں اگر شہروں کی آبادیاں بڑھیں تو غیر فطری اموات سے قبرستان بھی توسیع پا گئے۔قبریں، ماتمیں، مسخ شدہ لاشیں، جھنڈے نعرے سب کچھ گڈ مڈ ہو کر سرمایہ داری نظام کے مسخ چہرے کو مزید وحشت ناک بناتے رہے۔

اس عرصے میں عالمی سرمایہ داری نظام سے بندھے بلوچستان میں بھی پیادے بدلتے رہے ۔ پیادہ باپ پیادہ بیٹے کو اپنی دستار سونپتا گیا،اور پیادہ بیٹا پیادہ پوتے کو اپنی جگہ دیتا رہا (بلوچستان کیقبادوالا معاشرہ ہی ہے۔ یہاں موچی کا بیٹا نائی نہیں بن سکتا، اور کاشت کار کا بیٹا لوری نہیں بن سکتا.....وزیر و مشیر؟ ارے ہو ہی نہیں سکتا۔ وزیر و مشیر ہمیشہ سردار کا بیٹا ہی بن سکتا ہے یا پھر وہ، جس کا تبسمہ آب پارہ میں ہو چکا ہو۔.....پشت در پشت!)۔

یہ پیادے یہاں سے وہاں تک اپنی دستار کی جھولی بناتے جاتے رہے اور وہاں سے، وزیر وگزیر بنتے رہے۔

زور آوروں کی بنائی ہوئی اِس فرزندی کو نہ ماننے والے قد آوروں کو کوتاہ قد بنانے کا کام ایک مستقل اور معتبر کام کے بطور چلتا رہا۔بلوچستان میں فارمولا ہے کہ: اونچا سر، یا تو جھکائے رکھو یا دفن کرادو،''سوئے یار اور سلامت سر'' بلوچستان میں ناممکن ہے۔تیسرا کوئی آپشن پینسٹھ برسوں کی طرح اِن پندرہ بیس برسوں میں بھی نہیں رہا۔..... باقی جو ماوشما بچے ہوئے ہیں، وہ کسی طور دراز گردن نہ رہے۔

اُس زمانے والا گوادر بس ایک خفتہ سا، دوردراز واقعہ، ساحلی قصبہ تھا۔ خاموش، انسانی مداخلت نہ ہونے کے برابر۔ ہماری قومی تاریخ میں گوادر کبھی اہم نہ رہا۔ یہاں تو سومیانی، کراچی، کلات، کاہان اور پھر کوئٹہ ہی دنیا سے تلخ یا شیریں لین دین کرتے رہے۔مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ بلوچستان کا کوئی بھی جغرافیائی مقام کسی بھی وقت اچانک اہم بن سکتا ہے۔اور ماقبل سرمایہ داری عہد میں''اہم'' کا مطلب یا تو جنگ کا''سبب'' بنتا ہوتا ہے، یا اُس کا''میدان''۔نصیر خان نوری کے شفیلی (بانسری) بجانے والے چرواہوں کا جغرافیہ ہی اُن کی جواں مرگی کا لوحِ محفوظ ہے..... ہر پہاڑ، وادی اور ندی نالہ یہ والی قابلیت رکھتا ہے۔اور اب کے یہ باری ہے: گوادر کی.....

گوادر تو کسی بھی جگہ سے زیادہ'' واژہ وار'' (مالک خور) ثابت ہوا ہے۔ کھاتا جاتا ہے، کھاتا چلا جاتا ہے۔ پندرہویں صدی کے ہمل سے لے کر آخری حاملہ کے ہمل تک۔ایک حقیر سا سمندری گھاٹ ہمیں کیا فائدہ دے پاتا۔ یہ تو ایک'' سرخور'' ڈائن چلا آیا ہے۔اُس گھاٹ کا حسن، جوانی اور نوعروسی رعنائی، درآمدی اوباشوں کے لیے زبردست کشش رکھتے ہیں۔ وہ بیرونی اوباش سرمہ سیٹیاں اور سیٹھ بنے اس کے آس پاس منڈلانے لگے۔ بے بس بے وسیلہ بوڑھے مالک کے مرشدوں فقیروں تدبیروں حجّتوں کو کوئی کامرانی نصیب نہ ہوئی۔اُن کے سب کچھ کو آہنی مشینیں اپنے پیروں تلے کچلتی بڑھتی جاتی ہیں۔

ہاں، البتہ چوکڑیاں بھرتے لیلوں کو مشینوں، ان کے دھوئیں اور [illegible] پرواہ؟ ۔سو مچلتے رہے پن گھٹ پر، اور اُسی کی حدت میں بھسم ہوتے رہے۔ گھاٹ یکا یک ایک مرگھٹ بن گیا۔ اب صورت یہ ہے کہ نہ مالک کو اُسے نگلنے دیا جاتا ہے، نہ ہی ہم اُسے خوشی سے الٹی کرسکتے ہیں۔

اور یہ جو طوائف الملو کی آپ کو نظر آتی ہے ناں خطے میں، اور یہ جو ملک الطّوائفی آپ کو نظر آتی ہے ناں خطے میں، اس کا ایک بہت بڑا ذمہ دار گوادر ہی ہے۔

پندرہ بیس برس میں کیا کیا تبدیلیاں آ گئیں وہاں، ہم پڑھتے سنتے رہے یا ٹی وی پہ دیکھتے رہے۔ جانے کا اتفاق نہ ہوا، یا جرأت نہ ہوئی۔ سوا نیزے کے سورج والے حشر میں ہر شخص اپنے گناہوں میں گردن گردن ڈوبا ہوتا ہے۔ بہت بڑا (یا بہت بڑا الفاظ) ہی اِس دوزخی آگ سے اوپر اٹھ کر بین الاقوامیت کی بات کر اور لکھ سکتا ہے!

ابھی وہاں ایک نیم سرکاری ادارے کی جانب سے ''کتاب میلہ'' کا فیصلہ ہوا تو بڑے دانش وروں کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی نتھی تھا۔ اور انہی بڑے دانش وروں کا پلو پکڑے مجھے جہاز سے آنے کی دعوت ملی۔..........اور میں نے ہاں کر دی۔ مجھے دوبارہ گوادر کو دیکھنے کا شوق جو تھا کہ دیکھ لوں کس بات پہ ہم تباہ ہو رہے ہیں، کیا نئی تبدیلیاں آ گئیں؟۔

کچھ عرصے سے میری مسافرتیں بہت محدود ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ہر وقت دوستوں کو کہنے لگا تھا کہ مجھے کہیں بھیجو۔ یا چلو مل کر کہیں کا سفر کرتے ہیں۔ مثلاً میں بہت عرصے سے ایران دیکھنا چاہتا تھا اس لیے کہ وہاں بلوچستان کے علاوہ بھی گلستان بوستان جیسی تقدسات موجود ہیں۔ میں نے دوستوں کے ساتھ یہاں وہاں نکلنے کے بے شمار پروگرام بنائے مگر کسی ایک طرف بھی جانے کا ارادہ عملی نہ ہو سکا۔ اب تو ایسا ہونے لگا کہ ماما عبداللہ جان کے ہاں منعقدہ ہفت روزہ ''بلوچستان سنڈے پارٹی'' کی محفلوں میں ہم سفر نہ کرنے کا الزام لگا کر ایک دوسرے کا مذاق اڑانے لگے۔

اب جب اپنے، گوادر جانے کی باتیں ہونے لگیں تو بھی یقین نہ تھا کہ یہ عملی ہو سکے گا..........مگر جب جیئند خان جمالدینی کی طرف سے حامی بھرنے، اور اُسے سڑک کے راستے عملی جامہ پہنانے کی یقین دہانی ہوگئی تو میں جہازی ہم سفروں سے دامن بچا کر اُس کی کار موٹر کی اگلی نشست پہ جا بیٹھا۔ میرے زمینی سفر کو ترجیح دینے کے لیے آپ اس حقیقت پر ضرور غور کریں کہ آکسیجن کی مقدار فضا کی بہ نسبت زمین پر زیادہ ہوتی ہے۔ اور یہ بھی دیکھیں کہ فضا کا اپنا منظر تو کوئی ہوتا ہی نہیں، سب زمینی آئی ایم ایفی قرضے ہیں۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ انسان زمین پر ہوتے ہیں، جہاز میں تو صرف بالائی طبقے کے لوگ ہوتے ہیں۔ اور آخری بات یہ کہ، جب تک آپ زمین کو خوب لتاڑ نہ لیں، وہ آپ کی شناسائی کا اقرار نہیں کرتی۔

چنانچہ ہم جہاز کا ٹکٹ ایک طرف پھینکنے اور ساتھیوں کے ساتھ سڑک سے جانے کے اپنے فیصلے پر مطمئن تھے۔

بارش، بلوچستان کی لائف لائن ہوتی ہے۔ اور یہ لائف لائن کچھ عرصے سے بری طرح کٹ چکی تھی۔ مگر، اُدھر ہم گوادر جانے کے لیے تیار ہوئے اور اُسی روز رات کو کوئٹہ نے ہمیں مہمانی دینے کا فیصلہ کر لیا۔ چرند پرند اور زراعت کے لیے بارش والی حیات آور لائن بحال ہوئی۔ پوری رات زبردست بارش اور برف باری ہوتی رہی۔ اگلی صبح برستی برف میں جو دیکھا تو کوئٹہ وادی کی مکمّل اور مہارت کے ساتھ سفیدی ہو چکی تھی۔ زمین اور سڑکیں کسی جھاڑی، اینٹ، روڑے کے دھبہ اور داغ سے پاک، صرف اور صرف برف کی سفید پوشی میں تھے۔ سیر تفریح، قہقہے، مسرور آوازیں، برف کو گولے بنا کر دوستوں پہ برف باشی کرنے، اور محبوب دوستوں عزیزوں کے ساتھ فوٹو گرافی کرنے کی روایتی سرگرمیوں کے بیچ ہم نے وادی کو خدا حافظ کہا اور پانچ یورپی ممالک جتنے جغرافیائی فاصلے سے پرے واقع، نیلے، شفاف پانیوں والے گوادر کی جانب روانہ ہوئے۔

یوں تو برف باری میں وقت کا ہر پہر سہانا لگتا ہے، مگر اُس کی صبح تو حواس پر قبضہ کر لیتی ہے۔ نشہ طاری کر ڈالنے والے متنوع مناظر عقل و روح کو دل کی سپردگی میں دیے رکھتے ہیں۔ چنانچہ

عقل کو جمال کے ہاں رہن رکھ کر، میرے ایک ہم سفر نے مکمّل طور پر دل کی حکمرانی کی حالت میں صبح سویرے بہت سارے دوستوں کو یہ ایس ایم ایس ٹیکسٹ کیا: ''گڈ مارننگ، وادی میں برف باری ہورہی ہے۔ تین دن کے لیے گوادر جارہا ہوں، ایک ادبی سیمینار کے لیے''۔ کتنے مختلف جواب آئے۔ اُن جوابات سے کسی کی شخصیت کے بارے میں مکمّل فتویٰ تو نہیں دیا سکتا، لیکن ایک اندازہ سا ہوسکتا ہے۔

ایک جواب تھا: گریٹ، تصاویر لیتے جاؤ، سردیوں والی خوراک کھاؤ، اپنا خیال رکھو''۔ .....(اچھا تھا ناں!)۔

ایک اور دیکھیں: ''ماشااللہ، سفر محفوظ رہے۔ وقت کا شکر ادا کرو کہ اُس نے تمھیں تازہ دم ہونے کا موقع دیا ہے''۔

ایک نے یوں کہا: ''مجھے برف باری سے محبّت ہے۔ مجھے گوادر سے محبّت ہے، خیر سے جاؤ، سفر بہ خیر..... ٹی وی کوئٹہ میں برف باری دکھا رہا ہے۔ اوووہ..... میں وہیں ہوں..... مجھے یقین ہے تم میں اب تک جینے کی بہت سی کشش باقی ہے۔ اچھے دوست کی ڈرائیونگ کی مدد لو۔ تم پہلے ایسے جان لیوا سفر کر چکے ہو..... مجھے یاد ہے ذرا ذرا۔ جھیل کنارے، سفید لباس میں..... کچھ یادیں زندگی سے نکل جائیں تو آدمی جھنجھنا تا پیتل رہ جائے (1 Cor 13 Wa St Paul)''۔

مگر اُس دوست کی ایک خاتون دوست کی طرف سے اُسے بھیجے گئے اس خشک ترین مردانہ جواب کو بھی پڑھ لیں: ''سفر بہ خیر، سارے اہلِ قلم کو سلام''۔ ایسے جوابات برف باری کے منظر نامے کی ساری جمالیات کو خاکستر، سارے ذائقے کو غارت کر دیتے ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے کچے کڑوے کریلے کھانے والے کا سا منہ بنا کر موبائل جیب میں پھینک دیا۔

.....اور اب آگے بلوچستان تھا۔ بادلوں کی پناہ میں آئی وادیاں، بارش سے دُھلی پہاڑیاں..... رج رج کے نظارے لو۔ (جن لوگوں نے آخرت، (یا پھر لاہور) میں اپنی جنت بنانے کو یہاں جہنّم جاری کر رکھا ہے، اُن کا کریہہ تذکرہ اس حسین صبح کیا چھیڑنا!)۔

سنگت اکیڈمی کا ہمارا وفد، تنظیم کے سربراہ جیئند خان جمالدینی کی سربراہی میں وادیوں کے کنفیڈریشن بلوچستان میں سے رواں دواں تھا۔ سرگرم، پُر جوش، محنتی اور دُھن کا پکا جیئند خان سنگت اکیڈمی کا سیکرٹری جنرل ہے (جو کہ تنظیم کا اعلیٰ ترین عہدہ ہوتا ہے)۔ میچور اور ذمہ دار لیڈر شپ کے تحت کام کرنے میں ہمیں بڑا لطف آتا ہے۔ اس سفر میں جہاز (کار موٹر) بھی اُسی کا تھا، کپتان (ڈرائیور) اور راہبر بھی وہی تھا، اور ہم سواری (سپاہی) بھی اُسی کے۔

خاران کا ہمارا دوست اور وہاں کی سنگت اکیڈمی کا سربراہ ضیا شفیع ساتھ تھا۔ یہ بہت دلچسپ نوجوان ہے، ہم جس بھی بڑے شہر سے گزرتے وہ بتاتا جاتا کہ وہ تو وہاں کی جیل میں سیاست کے جرم میں جیل کاٹ چکا ہوتا ہے: ''یہاں میں تین ماہ تک رہا۔ اِدھر میں نے سات ماہ جیل کاٹی.....''۔ وہ بی ایس او (آزاد) میں رہ چکا تھا۔ بظاہر تو شرمیلا شرمیلا نظر آتا ہے مگر گپ شپ میں کھل جائے تو پھر شرمیلا پن آٹو میٹک طور پر بھاڑ میں چلا جاتا ہے۔

ادب کا متحرک و محنتی سفیر، عابد میر ویسے ہی ہمارے ساتھ تھا، حادثاتاً۔ اُسے تو گوادر ہی ہونا چاہیے تھا کہ وہی تو اصل میں گوادر میلے کے منتظمین کا کھڑ پینچ تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ وہاں مہمان نہ تھا، بلکہ وہاں ہمارا میزبان تھا۔ وہ سارا راستہ اپنے موبائل کے ذریعے گوادر کو ہدایات دیتا رہا۔ اور، وہی دوسرے شہروں سے رواں دواں وفود کی رہنمائی کرتا رہا۔ یعنی ساروں کے بیچ coordination کر رہا تھا۔ اس طرح ''گوادر میلہ'' گویا ''سنگت میلہ'' تھا۔ ہم مطمئن تھے۔

کوئٹہ کی برف باری کو بصارت والے بصیروں کے لیے چھوڑ کر ہم وطن کی وسعتوں میں کھوئے (پھیلے) چلے جارہے تھے۔ مستنگ و منگوچر تو ہمارے دیکھے بھالے علاقے ہیں۔ مگر زمستانی بادلوں میں یہ علاقہ کتنا خوب صورت بن جاتا ہے، وہ ہم نے آج پہلی بار دیکھ لیا۔ اب پتہ چلا کہ سنت سادھو، عاشق و فلاسفر تنہا سفر کیوں کرتے ہیں، بھیڑ سے کتراتے کیوں ہیں۔ یہاں، ہم خیال و ہم نفسیات احباب کے بیچ ہم جب چاہتے تنہا ہوجاتے اور جب چاہتے مردِ محفل بن جاتے۔ گاڑی سے باہر کھلی کھلی فطرت ہم سے ہم فکر بننے، ہم سخن بننے، ہم سفر بننے، ہم رقص بننے کو مچل مچل جاتی

تھی۔ بلوچستان دنیا کی خوب صورت لینڈ سکیپ کی سرزمین ہے۔ شالا، بادل اُس کا لازمی حصہ رہیں۔

بلوچستان کے ہر پہاڑ کا ہر پتھر سمجھو لکھا مسودہ، ایک تاریخ، ایک افسانہ، ایک ناول۔ مگر اس شاہراہ پر چلتے چلتے آپ بلوچ تاریخ اور جغرافیہ میں سے بالخصوص QALAT کو TALAQ نہیں دے سکتے، کہ قلات میں ہماری قوم کی عظمت کی فلک بوس سربلندی سے لے کر تذلیل کی دوسری انتہا تک کے فیصلے دفن ہیں۔ یہ وادی بادشاہوں، سربراہوں اور سفیروں کے تحفوں اور اُن کی میزبانی کے مزے بھی لیتی رہی، اور حملہ آوروں کے گھوڑوں کو، مزاحمت کے توبرے بھی کھلاتی رہی۔ یہاں وطن کی آزادی کی بحالی کے متبرک فیصلے بھی ہوتے رہے اور داخلی فیوڈل حاکمیت کی سیاہ کاریاں طویل کرنے کی سازشیں بھی پکتی رہیں۔

یہاں ''[illegible]'' کے اُس قلعے کے آثار موجود ہیں جو بلوچوں کی ریاست وسلطنت کا چارسو برس تک مرکز رہا تھا۔ اور جسے زلزلے، اور بارشوں نے تباہ کر دیا ہے۔ یہیں قلات میں سادہ اور مردم ناشناس ''خان'' احمد یار خان کی وہ مسجد بھی موجود ہے جس کا مینارہ حکومت کی توپوں سے زخمی ہو گیا تھا اور جسے خان نے جوں کا توں رکھنے کی فرمائش کی تھی۔ اسی توپ ماری کے نتیجے میں بلوچستان کو گلے سے پکڑ کر ایک کڑی میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس کی نصف ہزار برس کی آزاد حیثیت ختم کر کے اُسے ایک بالکل ہی نوزائیدہ ملک کی ون یونٹ میں بھرتی کر دیا گیا تھا۔

یہیں اِسی قلات میں سکھر جیل میں پھانسی چڑھائے گئے اُن بلوچوں کے روضے ہیں جو اِس ''ضم ناکی'' کے خلاف لڑے تھے۔ اور یہیں پر بلوچستان کے، خانوں بادشاہوں کے مزار ہیں جو اس دارالخلافہ کی تاریخی اہمیت بڑھاتے ہیں۔

اسی قلات میں، بالخصوص اُس بادشاہ کا مبارک روضہ بھی ہے جو انگریز کے خلاف دست بدست جنگ کرتے ہوئے شہید ہو چکا تھا۔ اس کا متبرک نام تھا: خان محراب خان (لعل شہید)۔ غالباً اِس پورے خطے میں بلوچوں کے اس حکمران کے علاوہ کوئی اور حکمران انگریز سے دست بہ دست جنگ کرتے ہوئے نہ مارا گیا ہو............ بلوچستان انوکھی تاریخ بناتا رہا ہے!!۔

ہم جب سُوراب سے گزرے تو ہم نے اِس عجب نام پر غور ''فرمایا''، بحث کی۔ یہ پتہ نہیں ''سُہر آف'' (سرخ پانی) ہے، یا ''سور آف'' (نمکین پانی)۔ اور اگر یہ ''سور آف'' ہے تو پھر اس کے ''س'' پر پیش کس طرح پڑا ہو گا اور یہ عوام الناس میں کیسے قبولیت پا چکا ہو گا، اس لیے کہ اس کا مطلب تو کچھ نہیں نکلتا۔

ہم نے خضدار کراس کیا، مگر چائے کا کپ پی کر۔ ایک بدترین خانہ جنگی کے مرکز میں زیادہ دیر ٹھہرا بھی تو نہیں جا سکتا۔ بے گناہوں کا خون جہاں بھی بہا ہو، وہاں کی پاک ہیبت آپ کو خود میں ڈوبنے نہیں دیتی، آپ اچھال کھا کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ ریاست کے مسلح کردہ جتھوں نے بلوچستان کو ''تُوتکستان'' بنا ڈالا ہے۔

ہم وہاں سے نکلے۔ بلوچستان کی کسی بھی شاہراہ پر سفر کرتے ہوئے آپ تعجّب میں پڑیں گے کہ ہمارا یہ وطن کتنا بڑا ہے۔ ہر سفر تقدس بھرا سفر کہ بلوچستان اپنا وقار جگہ جگہ جتاتا جاتا ہے۔ تئی پند ہاں سبز جناثاں: (مرشد تجھ پہ سفر کریں شالا) اور اس میں رنگ ونور کی کیا کیا انواع موجود ہیں۔ بلوچستان! تیرا تقدس، تیرے جغرافیہ میں بھی ہے۔

ہم مرکزی سڑک چھوڑ بیلہ شہر چلے گئے۔ اِسے ''بیلہ'' لکھا جاتا ہے۔ سوچا یہ کیسا نام ہے۔ کیا یہ ''بیلا'' نہیں ہو سکتی تھی؟ مگر ''بیلا'' کیوں ہو۔ بلوچ قدیم شہر کا نام نئی زبان اردو میں کیوں ہو؟............ ہمیں یہاں بیلہ میں اپنی ایک قومی بدنصیبی کا منبع دیکھنا تھا، اپنی بربادی کا ایک سبب دیکھنا تھا، سنڈیمن کی قبر دیکھنی تھی۔ ہم اپنی عبرت کے ایک سب سے بڑے سبب کو دیکھنا چاہتے تھے، لہٰذا ہم شہر کی پان سے سرخ دیواروں سڑکوں پر سے گزرتے ہوئے سنڈیمن کی قبر تک پہنچے۔ یہ، سمجھو دو فٹ بال گراؤنڈوں جتنا خالی رقبہ ہے۔ اور اس کے دوسرے سرے پر ایک پرشکوہ مگر بہت ہی سادہ مقبرے میں سنڈیمن دفن ہے۔ قبر کے اوپر سنگ مرمر کی تہہ چڑھی ہوئی ہے۔ پھر کھلے محرابوں پہ مشتمل زرد رنگ کا مستطیل کمرہ بنا ہوا ہے۔ اُس کے بعد ایک چاردیواری ہے جس پہ عام بکریوں والے باڑھ جیسا دروازہ لگا ہے، کنڈی کے ساتھ۔ تالا والا کچھ بھی نہیں ہے۔

قبر پر کالے رنگ کے سنگ مرمر پر اُس سے متعلّق انگریزی میں تعارفی تحریر ہے۔ مگر اس قدر مبہم و مدہم کہ اچھی طرح پڑھی نہیں جاسکتی۔ ہم زرد رنگ کے گنبد نما پر شکوہ مقبرے میں سیاہی مائل سنگِ مرمر کی تحریر کو دیر تک پڑھتے رہنے کی جستجو کو ترک کر کے اُس کے عہد کو یاد کرتے رہے۔

ہم اُس کا تعارف یہاں نہیں کر پائیں گے۔ کہیں اور ہم نے اس کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ بس یہاں تو وہی کچھ کہنا کافی ہوگا جو کہ ہمارے وفد کے لیڈر جیئند خان جمالدینی نے اُس کی قبر پر اچانک انگلی لہراتے فی البدیہہ طور پر کہا تھا، انگریزی میں بھی، اور اردو میں بھی (پتہ نہیں اُس بلوچ دشمن کی قبر پر اُس نے بلوچی میں تقریر کیوں نہ کی؟): ''یہ ہے اُس شخص کی قبر جس نے بلوچوں کو تباہ و برباد کرنے کی پالیسی بنائی تھی''۔

ہم سات سمندر پار کے اِس دشمن کی قبر کو متانت، رنجیدگی و سنجیدگی و سنگینی سے دیکھ کر دماغ میں آئے سیکڑوں فلموں کو جھٹک کر چل دیے۔ مجھے بوڑھا کریموجت یاد آیا۔ اُس نے اِس سن مِن (سنڈیمن) کو سرداروں سواروں کی معیت میں مری علاقے سے گزرتے دیکھا تھا۔

یہ شکر ہے کہ بیلہ والے لوگ جیکب آباد کے لوگ نہیں ہیں۔ ورنہ وہ بھی سنڈیمن کی قبر پرستی کرتے جس طرح کہ خان گڑھ (جیکب آباد) والے، غاصب جنرل جیکب کی قبر کو ولی کی قبر گردان کر اس پہ جمعراتوں کو چراغ جلاتے ہیں۔

رات کا کھانا ہمیں دالبندین کے ایک ملازم پیشہ سابقہ (اور اب تک قائم دائم ہونے کا دعویٰ کرنے والے) کامریڈ بلوچ نے کھلایا۔ وہ پرانا سیاسی ورکر ہے، سیاست کی برکت سے سوویت یونین میں علم حاصل کیا ہوا ہے۔ مگر اب شہری سیاست سے کٹا ہوا، اور مایوس تلخی سے بھرا ہوا ہے۔ ساری زندگی موجودہ وزیراعلیٰ کی نیشنل پارٹی اور اس سے قبل انہی کی طلبا تنظیم بی ایس او سے وابستہ رہا۔ ایسی پرکٹی پاک روحیں آپ کو بلوچستان بھر میں نظر آئیں گی۔ ہمارے صوبے کے حالیہ عرصے میں تقریر و جلسہ والی سیاست بلاشبہ نیشنل پارٹی ہی کی ہے، اور اب حکومت بھی اُسی کی ہے۔ اُس پارٹی کی دوسری طرف بائیں جانب بلوچ سیاست میں آزادی طلب جنگی محاذ سجا ہوا ہے۔ ہمارا میزبان،

محبوبہ کی طرف سے بے وفائی کے شکار نوجوان کی طرح تیز بولتا ہے، ہونٹوں کی اضافی کھینچ تان میں، ہاتھوں کی ضروری اور غیر ضروری جنبش میں.....اور تلخ پانی کے زیر اثر بھی۔ سیاسی تلخی میں بجھی ہوئی گفتگو، جو بلوچستان میں کوئی نادر منظر نہیں ہے۔ بے بسی کا بھی اظہار کہ جونیئر لوگ کروڑ پتی ہو گئے ہیں۔ ساری امید آزادی پسندوں کے ساتھ رکھتے ہوئے بھی وہاں نہ جا پانے کی حسرت دو آتشہ۔ بلوچ کو کس کس کمپلیکس کا شکار بنا دیا گیا ہے!!

اگلی صبح، اوتھل کی صبح۔ سرد، اور برف باری سے لدے کوئٹہ سے آیا مسافر۔ مگر، یہاں تو جنوری کے وسط میں بھی نہ کمرے میں ہیٹر ہے، نہ پانی گرم کرنے کی حاجت ہے، نہ کوٹ سویٹر پہننے کی ضرورت۔ موسموں کے ضدین کا اجتماع ہے میرا دیس۔

یہ، بھوتانڑیوں اور جاموں کی باہمی سیاسی چپقلش میں واضح طور پر جیتا ہوا جام کا اوتھل ہے۔ سب لوگ اُسی کی مرتب کردہ فضا کی مطابقت میں جیتے ہیں۔ اُس کے ابرو کے اشاروں پہ سارا سیاسی معاشی انتظامی ٹریفک چل رہا ہے۔ نباتات، حشرات اور حیوانات میں سے جو کوئی بھی، اُس متکبّر و معتبر ماتھے پہ شکن کے اسباب بنتے ہوں وہ ضلع باہر۔ چپڑاسی سے ڈپٹی کمشنر تک آپ جام پیئیں یا نہیں، مگر آپ کا 'جام پسند' ہونا ضروری ہے.....

سڑک کے لیے کوئی بھی جلوس نہیں نکالتا، یہاں سکول کالج قائم کرنے کے مطالبے نہیں ہوتے، یہاں آغازِ حقوقِ بلوچستان بغیر کچھ نظر آئے انجام تک پہنچتے ہیں۔ بلوچستان کے حقوق کا آغاز بھی سردار کی جیب میں ہو جاتا ہے اور انجام بھی۔ ہر پانچ سال بعد سردار کی زمینیں وسیع ہو جاتی ہیں، اُس کے پاس مہیب گاڑیوں کا فلیٹ بڑھتا جاتا ہے، کراچی اسلام آباد، دبئی اور لندن میں اُس کی جائیداد میں اضافہ ہوتا جاتا ہے.....عام آدمی خدا کا مال ہوتا ہے، جیے جا رہا ہے خدا کے سہارے۔

.....تو؟۔ تو، اوتھل غیر سیاسی نہیں، حتماً اور کاملاً سیاسی خطہ ہے۔ یہ بقیہ بلوچستان ہی کی طرح سرداری نظام کے خلاف چوں تک نہ کر سکنے والا سیاسی ضلع ہے۔ کیا خضدار غیر سیاسی ہے؟ نہیں۔ کیا مستنگ غیر سیاسی ہے؟ نہیں۔ بلوچستان بھرپور سیاسی، صوبہ ہے۔ یہ سرکاری اور سرداری

نظام کا سو فیصد سیاسی صوبہ ہے۔ ہاں، اِن دو مظاہر سے باہر کی سیاست جرم ہے، دونوں مل کر ماریں گے، سرکار بھی سردار بھی۔ میڈیا بھی اِن کا۔ عدالت، طریقت، شریعت سب اِن دو قوتوں کی۔ ایک گرنے لگتی ہے تو دوسری سہارا دیتی ہے، اِسے دیمک کھاتی ہے تو دوسری اس کا شہتیر بن جاتی ہے۔ اختیار (اقتدار) اسی سردار سرکار کی جوڑی کے پاس ہی رہتا ہے۔ اور اُسے اپنے پاس رکھنے کے اُن کے پاس ہزاروں گُر موجود ہیں۔.....دم چھو، پیسہ پلاٹ، دھونس دھمکی، ترغیب، تحریک، ڈنڈا کونڈا، شعر ادب، چوری چکاری، خانہ جنگی، مقدمات و پیشیاں، فتوے غداریاں، حتیٰ کہ قتل و غارت سب ذرائع موجود ہیں۔ لہٰذا، اقتدار ان دو قوتوں سے باہر نہیں جاتا۔ بلوچستان میں جام گردی کو نہ جمہوریت کچھ کہتی ہے نہ ہی مارشل لا اس کا کچھ بگاڑ سکے گا، جب تک کہ.....

ہم پان کی یلغار، صنعتوں، زرعی فارموں سے بھرے مگر طبقاتی سیاست کی مکمّل غیر موجودگی میں صبح سویرے بلوچستان کے اس رنگ سے نکل کھڑے ہوئے۔

سسی پنوں کے مقبرے کی زیارت ہماری قسمت میں نہ تھی اس لیے کہ وہ راستے سے دور پڑتا تھا۔ ہم نے مکران کے راستے پہ جانا تھا اور وہ پاک مزار دوسری طرف واقع تھا۔

ہم کراچی والے راستے چار پانچ میل چلنے کے بعد مغرب کی طرف دائیں ہاتھ کو ایک ہائی وے کی طرف مڑے: کوسٹل ہائی وے۔ اس موڑ والی جگہ کو زیرو پوائنٹ کہتے ہیں۔ انسان بھی زور آور ہے، جہاں چاہے ہندسہ اور عدد لکھ دیتا ہے۔ پاگل ؟۔ بھلا کوئی جگہ زیرو پوائنٹ بھی ہوسکتی ہے۔ کائنات ریاضی کی طرح حسین تو ہوتی ہے مگر ہندسے تو بہت ہی relative ہوتے ہیں۔ ہم نے ہی انہیں ایجاد کیا اور ہم ہی ان کا اطلاق واستعمال کرتے ہیں۔.....زیرو پوائنٹ!!، ہونہہ۔

گوادر اس نام نہاد زیرو پوائنٹ سے 530 کلومیٹر پر ہے۔ یہ جگہ لاری بھی کہلاتی ہے (کراچی میں جولیاری ہے، یہ وہ لیاری نہیں بلکہ لاری ہے۔ یہ دونوں یا پھر ایک ہی قدیم لفظ کس زبان کی ہے اور اس کے کیا مطلب ہیں، معلوم نہیں)۔

بلوچستان کا یہ جنوبی ساحلی علاقہ وسطی ایشیا کے بجائے اب مشرق وسطیٰ کا ایک خود سر،

بیابان، اور الجھا ہوا بچہ لگتا ہے۔ یہاں اب گوراگیری، یا گندمی رنگت کی بجائے سیاہ فامیت بڑھتی جاتی ہے۔ یہاں زمین کے ساتھ ساتھ پانی (سمندر) بھی روزی رسانی میں حصہ ڈالتا جاتا ہے۔ یہاں زمین پہ ٹریفک اور روانی کے ساتھ ساتھ پانی پہ بھی انسانی کنٹرول کے ثبوت ملتے جاتے ہیں۔ یہاں فطرت کی دو (پہاڑ اور زمین) نہیں تین مظاہر موجود ہیں۔ پہاڑ، میدان اور سمندر۔

ہم یہاں رکے کہ کراچی سے سعدیہ بلوچ، 'ڈان' اخبار کی سحر بلوچ اور فہیم صدیقی کی ''رینٹ اے کار'' نے یہاں آن ملنا تھا۔ ایک کڑک چائے پینے کی کوشش کی، مگر حسرت ہی رہی۔ زیرو ہم سے بائیں طرف جو تھا۔.....انسان خود کو ایک کاہندسہ بنا کر ساری زندگی زیرو کو اپنے دائیں طرف گھسیٹ لانے کو پسینہ بہاتا رہتا ہے۔ مگر زیرو، بدبخت تھرکتے پارے کی طرح دائیں بائیں مچلتا رہتا ہے اور ساتھ میں اپنے طلب گار کو بھی تگنی کا ناچ نچاتا جاتا ہے۔ یہ مستقلاً دائیں جانب قیام نہیں کرتا۔ زیرو، سب سے بڑا رقاص!!۔

کراچی والے وہ لوگ آگئے۔ سلام دعا ہوئی اور ہم روانہ ہوگئے۔ اب کے ہمارا رخ مغرب کی طرف تھا۔ چل سو چل۔ وسعتیں بلوچستان میں سمٹنے کے تصور سے نا آشنا ہیں۔ گز، کلیر، کہیر، گیشتر، اور پیر کے جانے پہچانے درخت اور جھاڑیاں گزرتی رہیں۔ ان میں کچھ گدھے، کچھ اونٹ، اور کہیں کہیں انسان نظر آئے۔ سپاہی بھی۔ ہم نے اپنے سامنے حدِ نظر تک لیٹے ہوئے ایک طویل پہاڑ کا جنوبی سرا پکڑنا تھا اور وہاں سے مڑ کر پھر اُس کی دوسری طرف اُسی کے ساتھ ساتھ سمندر اور اُس کے بیچ سفر کرنا تھا۔

یہاں ہم ایک بحث میں پڑ گئے۔.....وہ یہ کہ سڑک اور ٹکنالوجی جسمانی اور ذہنی آسودگی تو دیتی ہیں مگر کیا یہ ذہن کو بھی آزاد کرتی ہیں؟۔ کیا ٹکنالوجی اُسی مناسبت سے روشن فکری بھی دیتی ہے؟۔ جیبند خان سڑک وٹکنالوجی کی نعمتیں گنواتا رہا۔ ہم بھی اتفاق کرتے رہے۔ اور اُس جزوی ذہنی نجات کی بھی تائید کرتے رہے جو یہ عطا کرتی ہیں۔ ہر سائنسی، علمی، تجرباتی نئی دریافت، روایت رواج اور عقیدہ کو زخم لگاتی ہے۔ یہ مل کر چیختے چلاتے ہیں، غراتے ہیں، حملہ کرتے ہیں مگر پھر بالآخر

مجبور ہوکر دُم دبا کر بھاگ جاتے ہیں.....اور پھر جب لوٹتے ہیں تو اس نئی ایجاد کو مان لیتے ہیں۔ دُم کھڑی کر کے بتاتے ہیں کہ یہ ایجاد تو ہماری فلاں شاعری، ضرب المثل اور فرمان کے طفیل ہی ہوئی ہے۔ اِس کی خبر تو صدیوں قبل ہمارے اکابرین نے دے رکھی تھی۔

مگر کمال بات دیکھیے کہ صدیوں سے موجود علم نے ایران کا کچھ نہ بگاڑا اور وہاں نصف صدی سے بدترین ملاّئی نظام قائم ہے، اِسی طرح ٹکنالوجی نے امریکہ کا کچھ نہ بگاڑا جس کا صدر اب بھی ہنومان کی مورتی جیب میں رکھے بدترین سامراجیت میں غلطاں ہے۔ تو اُس مظہر کو کیا کہیے گا؟۔ پس ثابت ہوا کہ انسانوں کی خردافروزی، اور روشن فکری کے لیے علم، سڑک اور ٹکنالوجی ہی نہیں، کچھ اور عناصر اور مظاہر کا ہونا بھی ضروری ہے۔

بحث، بحث اور بحث۔ نتیجہ؟۔ ہم نے نتیجہ اخذ کرنے کے لیے یہ بحث چھیڑی ہی نہ تھی۔..... جی ہاں، بلوچستان کے دور دراز کے سفروں کے مسافر ایسا بھی کرتے ہیں!! (مگر لاہور اور کراچی کے سیاسی ورکر اور دانش ور تو ساری زندگی یہی کرتے رہتے ہیں، پتہ نہیں کیوں؟)۔

یہ آیا کُنڈ ملیر۔ ہمارا سمندر یہیں سے ہمارا ساتھی بنا۔ ہماری اس دوستی نے گوادر تک ہمارا ساتھ دینا تھا، منزلِ مقصود گوادر تک۔ پانچ سو کلومیٹر تک ساحل ہی ساحل کا سفر!!۔ ایک بالکل ہی نیا رنگ، نئے پیداواری رشتے، نئی طرزِ حیات۔ یار یہ بلوچستان کیا عجوبہ جگہ ہے!! آنکھوں پہ زور لگا کر تاحدِ نظر، نظریں دوڑائیں، ایک ہی منظر میں سمندر کے شیڈز فرق فرق نظر آتے ہیں۔ یہاں پانی سبز ہے، اُسی سے ذرا سا آگے دیکھیں، ارے یہ اگلا شیڈ تو بھورا ہے، اُسی سے متّصل پھر نیلا، پھر سیاہ نیلا۔ جیسے کسی ماہر مصور کی پینٹنگ ہو۔ ہم خوش قسمت تھے کہ ہماری منزل کے آخری پڑاؤ گوادر تک ہم نے سمندر کے ساتھ ساتھ سفر کرنا تھا۔

سمندر کا کنارہ، آبادی، اور ایک پیر کی موجودگی سمجھ میں آتی ہے۔ اس لیے کہ بلوچ پیر رکھتا ہے، اپنے مال مویشی کی حفاظت کے لیے، اپنی جان و آبرو کی حفاظت کے لیے (وہ سردار بھی تقریباً اسی لیے رکھتا ہے، بندوق بھی.....اور شاید ایک کتا بھی)۔ مگر میں حیران اس بات پہ ہوا کہ اِس

پیر کا نام اسماعیل شاہ غازی تھا۔ اور کراچی والے ہمارے پیر کا نام عبداللہ شاہ غازی تھا۔ اب پتہ نہیں یہ لوگ ''غازی'' کیوں تھے؟۔ عبداللہ تو کراچی کے بلوچوں کو (دوسروں کو بھی) سمندری طوفانوں آفتوں سے بچاتا ہے۔ ابھی پچھلی بار سمندری طوفان کے موقع پر ٹی وی پہ سندھ کا اکیسویں صدی کا وزیرِاعلیٰ کہہ رہا تھا کہ، ہمیں کوئی خطرہ نہیں، عبداللہ شاہ غازی وہاں ساحل پہ کھڑا (پڑا) ہماری حفاظت کرے گا۔ مگر، یہاں کنڈ ملیر میں چلتے سفر میں ہمیں موقع ہی نہ ملا کہ اسماعیل شاہ غازی کا استعمال معلوم کرسکیں۔ کوئی بڑا شہر تو یہاں ہے نہیں کہ وہ اُسے سمندری طوفانوں سے بچائے۔ کسی سے ضرور معلوم کر کے بتاؤں گا۔

بلوچی ضرب المثل ہے کہ ''انسان کی پہچان یا سفر میں ہوسکتی ہے یا جیل میں''۔ جیل میں تو میں، صرف جینید خان کے ساتھ رہا ہوں مگر وہ بھی مختصر وقت کے لیے۔ ہم دونوں کے بیرک بھی جدا تھے۔ یہ ضیاالحقی مارشل لا کا زمانہ تھا۔ ہم افغان انقلاب کے دفاع میں، حمید بلوچ کی شہادت کے خلاف جدوجہد میں کی پاداش میں کوئٹہ جیل میں تھے۔ مگر، ضیا شفیع اور عابد میر کے ساتھ میرا جیل میں ساتھ رہنے کا اتفاق نہ ہوا۔

البتہ سفر میں آج ہم اکٹھّے تھے، گذشتہ دو دنوں سے۔ اور وہ بھی ایک ہی کار موٹر میں۔ تو اتنے طویل سفر میں آپ گھل مل جاتے ہیں، آپ کا ظاہر باطن ایک دوسرے سے آشنائی حاصل کرتے ہیں۔ انسان کی اصلیت سامنے آجاتی ہے، بشرطیکہ آپ انسان ہوں۔ بادشاہوں، سیاست کاروں، سرداروں اور اداکاروں کی بات الگ ہے۔

لہٰذا اب ہم گھل مل چکے تھے۔ راستہ بھر ہم لطیفے بازیاں کرتے رہے، سفر کٹنے کو ہم نے لوک کہانیوں کا بھی ایک مقابلہ منعقد کیا، ہم نے ٹیپ پر انگلش اردو بلوچی گانے ترانے سنے، اسی طرح ہم نے بلوچی ڈیہی اور دیگر اصنافِ شعر کی گا گا کر بیت بازی بھی کی۔ ہم نے تاریخ پر گفتگو کی، ہم سیاست اور ادب پہ بولے.....اور ہم نے پہیلیاں بھی عین قواعد وضوابط کے ساتھ بُجھوائیں۔ پہیلی کو بلوچی، میں ''چاچ'' بھی کہتے ہیں اور ''بند'' بھی۔ ''بند'' قدیم بلوچی میں استعمال ہوا ہے:

بندے کہ بستہ چا کرار رِندہ قو یہیں واثر ہار بند بوژغئے جاہانہ یا........... ہم مقابلہ کرتے رہے۔مگر آخری پہیلی جو میں نہ بُوجھ سکا تو ہمارا یہ پہیلی ٹورنامنٹ غیر اعلانیہ طور پر ختم ہوا، اور ہم اِس پہیلی کے جواب کو موضوع بنا کر دیر تک گفتگو کرتے رہے۔جیئند خان اور ضیا شفیع کی مشترکہ پہلی جو میں نہ بوجھ سکا، یوں تھی۔: منی پیر کئے پاغ چو گرّ اننت وگرانت ....''۔(میرے دادا کی پگڑی اتنی لمبی کہ سر پہ پیچتے جاؤ پیچتے جاؤ، کبھی ختم نہیں ہوتی)۔

میں پہیلی نہ بُوجھ سکا۔قواعد کے مطابق ناکامی کے اعتراف کے ساتھ جرمانہ کے بطور مجھے ایک شہر اُنہیں دینا تھا۔میں نے ''مچ'' کا شہر انہیں دے دیا۔تب انہوں نے جواب بتانے سے پہلے شاعری جیسے یہ جملے بلند آواز میں بولے: ''اَل کناں بَل کناں ....کوکراں جل کناں .... ہنجگاں پُل کناں، میتگئے تہا مَل کناں''۔...........مشرقی بلوچستان میں البتہ اِن جملوں کے بجائے یوں کہتے ہیں: مچ باپل، مچ باجُھل، باث منی میشانی دفا'' (مچ خدا کرے پُر بہار ہو، سبزہ و چراگاہ ہو، اورمیری بھیڑوں کے منہ میں ہو)۔انہوں نے پہیلی کا جواب بتایا: سڑک۔

ارے واہ بلوچستان کی سڑک جو موڑ پہ موڑ مڑتی ہے، بلندیاں اترائیاں پھلانگتی جاتی ہے مگر چلتی ہی جاتی ہے، ختم ہونے میں نہیں آتی۔سفر، بلوچستان کا سفر۔ چلتے ہی رہو، چلتے ہی جاؤ۔مناظر بدلتے جائیں گے، گھنٹے گزرتے جائیں گے۔مگر منزل؟ ابھی ایک پہاڑ آگے، ابھی ایک دشت اور ۔...........بلوچستان کی سڑک، دادا کی پگڑی!!

ہنگول نیشنل پارک

ہم چلتے ہی رہے، آگے بڑھتے گئے، اور پھر ایک وسیع علاقہ آیا: ہنگول نیشنل پارک بہت ہی اہم، مگر نظر انداز کردہ علاقہ ایک ایسا پراسرار خطہ جس کے بے شمار نام ہیں: ہنگلاج مندر۔ ہنگلاج ماتا، رانی مندر، نانی مندر، ہنگلاج دیوی، ہنگولا دیوی۔ یہ سارے نام ہم سنتے رہتے ہیں۔مگر کیا یہ سرکار کے دیے ہوئے غیر مقامی نام ہیں یا ہمارے اپنے مقامی بلوچ نام ہیں؟

کیا خوب صورت علاقہ ہے یہ۔1650 مربع کلومیٹر پر پھیلا یہ علاقہ رنگا رنگی، تنوع اور لمحہ بہ لمحہ بدلتے منظر کا دوسرا نام ہے۔اس کا ایک علاقہ جھک کر سطحِ سمندر جتنا نیچا ہو جاتا ہے تو دوسرا بلند ہو کر آواران کے سر بلند پہاڑ بناتا ہے۔ یہاں اگر ایک طرف میلوں تک پھیلی ہموار وادیاں ہیں، تو یہیں ریت کے وسیع صحرا بھی ہیں۔ آتش اچھالنے والے پہاڑ بھی ہیں اور آگ بجھانے والا بحیرہِ بلوچ بھی۔اس کا ہر منظر آنکھوں کو فرحت عطا کرنے والا منظر ہے۔

بلوچستان کو ایک گونا گوں لینڈ سکیپ سے نوازا گیا ہے۔زمینی سائنس کے عجائبات کا نام بلوچستان ہے۔ہمیں اندازہ ہونا شروع ہوا کہ یہ محض ہنگلاج مندر نہیں ہے جو تقدس و استعجاب و استغراق کا باعث ہے بلکہ یہ اُس کے اردگرد کے پورے علاقے کی جادوئیت اور بھاری پن ہے جو مندر کو ساری اساطیریت عطا کرتی ہیں۔ہم یہاں دنیا کے وسیع ترین اور بلند ترین جیوتھرمل مظہر یعنی گارے کے آتش فشانوں (mud valcanoes) کے ہیڈ کوارٹر میں تھے۔

یہ مَڈ والکینو کیا ہیں؟۔اصل میں بے شمار اسباب سے زیرِ زمین، پریشر کافی بڑھ جاتا ہے۔ وہاں پانی کا درجہ حرارت زیادہ ہو جاتا ہے اور وہ مختلف زمینی مرکبات کو اپنے اندر شامل کرتا ہوا گارے کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ یہ ابلتا گارا پھر نکاس کے لیے اوپر زمین کی سطح کی طرف لپکتا ہے۔ یوں سمندر کے آس پاس ریت میں سے گرم گارا، آتشیں گیسیں اور منرلز پر مشتمل مواد بہت تیزی اور تندی کے ساتھ پھوٹ کر باہر بہنے لگتا ہے۔اس طرح کے لاوے میں نظر آنے والے بلبلے گیس کے خراج کی نشانی ہے جو کہ اکثریت میں میتھین ہوتی ہے۔ہم ڈاکٹری میں جاندار جسم سے بہنے والے پیپ والے مادے کو exudate کہتے ہیں: جسم کا exudate۔اب ہم ''جیوا یگزوڈیٹ'' دیکھ رہے تھے۔

آتش فشاں جو ابلتا ہوا گرم گاڑھا گارا پھینکتی ہے، اُس سے جیالوجی کے پراسیس معجزے بناتے جاتے ہیں۔آتش فشاں جو تختر سکیل کے سات اور آٹھ سے زیادہ درجے کے ہوتے ہیں۔ ابھرتی گیسوں، خاص کر میتھین گیس سے ابھرتا آتش فشاں، سینکڑوں فٹ بلند شعلے ہی شعلے اگلتا ہے۔(کیا طلسماتی کہانیاں وضع ہوتی ہوں گی!)۔ہم انہی شعلوں، گرم گاڑھے گارے اور پھر ان سے بنے بلند جزیروں کی باقیات سے صدیوں پرانی پیدا شدہ نظاروں کے بیچ سے سفر کر رہے تھے۔ یہاں مکمّل سکوت، ازلی ابدی حتمی خاموشی تھی۔بس ہوا سنسناتی ہے، جھرنے بولتے ہیں، پرندے گاتے ہیں، پہاڑی جانور باتیں کرتے ہیں۔شہروں، بنکوں، چمنیوں، سازشوں سے دور، ہم امریکہ کے'' کاؤبوائے'' فلموں جیسے وسیع خطے میں سے گزر رہے تھے۔یہاں کوئی انسانی آئین نہیں کوئی آئین ساز نہیں۔بس ''سب سے زیادہ فِٹ ہی زندہ رہ سکے گا'' کا ازلی ابدی کھردرا عالمی قانون چلتا ہے۔ اس قانون کو صرف انسانی محنت اور بشری دماغ ہی سنوارتا نکھارتا اور ترمیم کرتا ہے۔مگر انسان یہاں سے دور سول سیکریٹریٹ میں بیٹھا ہے..... جہاں اچھا بھلا اشرف المخلوقات جا کر دو ہفتے کے اندر اندر واپس بوزنہ کی عادتیں اختیار کرتا ہے۔سول سیکریٹریٹ میں جانور کمپیوٹروں، موبائلوں، آٹو موبیل اور بینکوں کے ذریعے خود کو بقا کے لیے فٹ سے فٹ تر بناتا ہے اور یہاں ہنگول میں جانور بے ساختہ، کم پیچیدہ، کم تکلیف دِہ اور کم ایذا رساں نیچرل طریقوں سے اپنی بقا کا سامان کرتا ہے۔

سمندر، آتش فشاں اور بلوچستان: فطرت زلزلوں کی صورت میں اٹھکیلیاں کرتی ہے یہاں۔جب چاہے نئے جزیرے بنا ڈالتی ہے اور پھر ایک ڈیڑھ ماہ میں سمندر سے اُسے پھر نگلوا لیتی ہے۔فطرت، جب چاہے ٹھوس وجوہات کی موجودگی میں خطے کو سونامی میں ڈھال دیتی ہے۔جانداروں کے بے شمار اقسام کروڑوں کی تعداد میں خواہ غرقِ گِل ہوں، غرقِ خاک ہوں یا پھر غرقِ جبل ہوں، بے پرواہ کو کیا پرواہ۔اِس ''میگا'' اتھل پتھل میں معدومیت اور بعثت ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ہم اپنے قاری کو اس علاقے میں موجود جبل الغراب اور بابا چندر گُپ نام کی جگہوں کے چکر میں ڈالے بغیر یہ بتا دیں کہ فطرت کی یہ بازی گری ہنگلاج ٹمپل کے گرد و نواح میں میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔

بل کھاتا، ناز دکھاتا، اٹھکیلیاں کرتا کوسٹل ہائی وے خود اپنے حسن کے علاوہ اپنے آس پاس سے بھی مسافر کو دہنِ حیرت بند کرنے نہیں دے رہا تھا۔حسن و جمال ایسا، جو نادرونا پید ہے۔ایسا حسن جو آپ کو دنیا بھر میں صرف اور صرف یہیں ملے گا۔ممتاز ویکتا خوب صورت اشکال کی چٹانیں اور چھوٹی پہاڑیاں آپ کے ذہن و دل کو حیران کیے جاتی ہیں۔ڈیزائینیں ..... کچھ ایسی بھی بدشکل جیسے چھوٹے بچوں کے کم ترقی یافتہ ذہنوں اور ''نا اُستاد'' ننّھے ہاتھوں نے بنائے ہوں۔کچھ ایسی خوش شکل جو تدڑی اور تربت کی محنت کشوں عورتوں کے مشاق ہاتھوں کی گِل کاری کی شاہ کار ہوں، اور کچھ ایسی جنہیں دیوہیکل اہرامِ مصر کے اساطیری معماروں نے ڈیزائن کیا ہو۔سیما سردار زئی، عبدالباسط شیخی، اکرم دوست، جمیل جَان اور حسن یادگار زادہ کی ارواح کن کن جسموں کو ملبوس کرتی رہی ہیں!!

بد بخت یونیسکو پتہ نہیں کہاں مر گیا؟۔ ہمارا ٹورازم ڈیپارٹمنٹ پتہ نہیں کہاں ہے؟۔ آرکیالوجی اور کلچر کے محکمے کہاں ہیں؟۔اور وہ وائلڈ لائف والی این جی اوز کہاں ہیں؟۔

یہ تین ضلعوں پر مشتمل علاقہ ہے: لسبیلہ، آواران اور گوادر۔اور ضلع بھی بلوچستان کا، جو کہ خود ایک صوبے کے برابر ہوتا ہے۔دریائے ہنگو کی طوالت اور حیات بخشی نے اس وسیع و غیر آباد علاقے کو نباتات اور جانداروں کی ایک عظیم ورائٹی عطا کر رکھی ہے۔رینگنے والے زہریلے اور بے زہر جانوروں، دودھ پلانے والے جانوروں سے لے کر چیتوں بھیڑیوں تک اور ہزاروں پرندوں کی

اقسام سے لے کر میمل جانوروں کی رجمنٹوں تک اس علاقہ کو آباد کیے ہوئے ہیں۔ بہت ہی قابلِ اعتبار سروے بتاتے ہیں کہ ہنگول کم از کم میمل کے 35 انواع، 65 سانپ جیسے رینگنے والی انواع اور خشکی و تری دونوں میں رہنے والے جانداروں، اور 185 انواع کے پرندوں کو روٹی روزی اور آرامگاہ مہیا کرتا ہے۔ اب تک پودوں کے 250 کے انواع ریکارڈ کیے گئے ہیں۔

یہاں Olive Ridley، چیتے، لگڑ بھگڑ، پرشین جنگلی بکرے، صحرائی بلی، spiny چوہا، بلوچستان Cape hare gerbil، بھیڑیا، پینگولن، سرخ لومڑی، چنکارا غزال، بنگال مانیٹر گرگٹ، گرے مانیٹر گرگٹ، گیکو، Sunks نامی گوشت خور، کوبرا سانپ، Saw-Scaled کوبرا وائپر، horned وائپر سانپ، سمندری سانپ، جھینگا، شرمپ، پام فریٹ، ڈولفن، بُلو وھیل، کچھوے.....آپ کوئی بھی نام لیں، وہ جانور اس وسیع و عریض اور متنوع جغرافیائی علاقے کے کسی پلُو میں بندھا ملے گا۔

پرندوں میں hoopoe, woodpecker, eagle owl ماہی گیر عقاب، Bonnelli's عقاب، امپیریل عقاب، Tawny عقاب، گولڈن عقاب، سرخ سر والا باز، Patridge، سینڈ گاؤز، تلور، Pelicans sport billed نامی ماہی خور پرندہ، یوریشین griffon گِدھ، مصری گِدھ، Cinereous گدھ، Lagger falcon، Kestrel، سی سی، تیتر، چکور آپ کو عام ملیں گے.....اس کے علاوہ ہنگول نیشنل پارک مہاجرت کرنے والے پرندوں کا زمستانی مسکن تو ہے ہی۔ پرندوں کی انواع کا 40 فیصد پانی سے وابستہ زندگانی جیتے ہیں۔ ہنگول دریا کے کنارے، estuary اور mudflats بین البراعظمی خانہ بدوش پرندوں کے لیے اہم ترین سرائے بناتے ہیں، سبی کے قدرتی صحبت سرائے۔

ارے اصل بات تو میں اب کرنے لگا ہوں۔ یہاں اِس پارک میں پہاڑی بکرا Ibex پایا جاتا ہے۔

اوڑیال اور غزال یہاں چوکڑیاں بھرتے ہیں۔ Ibex تو سارے پہاڑی ڈھلوانوں میں

ملتا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان کی کل تعداد 3000 ہے۔ جی ہاں تین ہزار۔ بلوچ قبائل کا بھیڑوں کا ریوڑ اوسطاً 60 مویشیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ تو اُس حساب سے اے بلوچو! تمہارے دیس میں 3000 بنتے ہیں، پچاس ریوڑ، اور وہ بھی Ibext کے۔ مزے ہیں!!

انٹرنیشنل یونین فار کنزرویشن آف نیچر (IUCN) نے ہمارے اِس پارک کے سولہ اقسام کے جانوروں کو اپنی اُس لسٹ میں ڈال دیا ہے جن کا وجود ختم ہونے کا خطرہ ہے۔

اور اب دکھ کی سب سے بڑی بات.....ہنگول نیشنل پارک کا ایک بڑا رقبہ سپارکو نامی تنظیم کو دیا گیا ہے۔ جس کا جنگلی حیات، مائتھالوجی اور سیر گاہوں سے کوئی تعلّق واسطہ نہیں سپارکو ایک ایگزیکٹو اور بیوروکریٹک خلائی ایجنسی ہے جو کہ ایرونا ٹک اور ایروسپیس تحقیقات کے لیے بنا ہے۔ اس قدر غیر ذمہ داری!۔ اس قدر جنگلی حیات دشمنی!۔

ہنگلاج مندر بلوچستان میں کوسٹل ہائی وے پر اور ماڑہ جاتے ہوئے دریائے ہنگول کے پار واقع ہے۔ یہ کراچی سے تقریباً ڈھائی سو کلومیٹرز کے فاصلے پر ہے۔

اسی ہنگول نیشنل پارک میں ہنگلاج مندر بھی موجود ہے۔ یہ بلوچستان میں کوسٹل ہائی وے پر اور ماڑہ سے پہلے اگھور نامی جگہ پر آتا ہے۔ کراچی سے اس کا فاصلہ تقریباً ڈھائی سو کلومیٹرز ہے۔ ہم بہت عرصے سے اس مندر کے بارے میں پڑھتے رہے تھے، سنتے رہے تھے۔ بس دیکھنے کی حسرت تھی۔ اور آج یہ موقع مل ہی گیا۔

ہنگول سے ہنگلاج

ہنگلا ج پری کا Shrine دنیا میں ہندو مت کے قدیم ترین اور سب سے مقدسShrinesمیں سے ایک ہے۔ دنیا بھر کے بالخصوص سندھ کے ہندوؤں کی اہم ترین زیارت گاہ۔ یہshrineہنگول پارک میں ہی ہے۔بھئی، یہ شہروں کا عام پارک نہیں ہے۔ یہ تو1650 کلومیٹر کا وسیع علاقہ ہے، جسے پارک قرار دیا گیا ہے۔

مین ہائی وے کے دائیں طرف ایک بڑا گیٹ نظر آیا۔ یہاں ایف سی، لیویز وغیرہ کے چیک پوسٹ ہیں، ایک آدھ کھوکھا نما دکان ہے۔اور چائے کا دھابا تو ہے ہی۔ یہاں بے شمار بورڈز بھی لگے ہوئے ہیں.......... ہندوانہ بورڈ۔اسی طرف تھا: ہنگلاج مندر۔

یک دم سارا منظر بدل گیا اور ہم بلوچستان کے بالکل ہی ایک نئے رنگ سے آشنا ہو رہے تھے۔مین کوسٹل ہائی وے سے ہم اُس بہت اچھی سڑک پہ شمال کی جانب مڑ گئے۔......دائیں طرف! (ہمیں خدا نے سیاسی ''دائیں'' مڑنے سے ہمیشہ بچائے رکھا)۔

اب ہم پہاڑوں، تنگ درّوں، اور چھوٹی چھوٹی وادیوں میں سے گزر رہے تھے۔ہم نے یہ تو دیکھ رکھا تھا کہ سبی کے پہاڑ سورج کی حدت سے جلے ہوئے ہیں۔ یہاں ہنگلاج میں اتنی گرمی تو نہیں پڑتی مگر اُس کے باوجود پتھر یہاں کے بھی جلے ہوئے ہیں۔اندازہ ہوا کہ یہ پتھر بعد میں نہیں جلے، یہ تو پیدائشی سوختہ ہیں۔ان کی ماں (سمندر) کی نرم و آرام دِہ کوکھ ہی کیمیائی اور طبعی پراسیسوں

سے آگ بگولہ ہو جاتی ہے۔چنانچہ ہنگول کا رحِم مادر سیکڑوں سینٹی گریڈ تک کے درجہ حرارت والا تھا۔اس پورے علاقے کی حمل سمندر میں آگ کے اندر ٹھہری تھی۔دائی بھی آگ تھی۔اور ہنگول کا ناف بھی آگ نے کاٹا تھا۔یعنی اس علاقے کا خمیر آگ، اس کی مٹی، پانی آگ، اور میتھین گیس آگ تھی۔آگ جس نے ان سب مظاہر کو نیم مائع نیم گیس بنا کر شعلہ میں بدل کر سمندر کی گہرائیوں سے سیکڑوں میٹر باہر زمین کی کھال پر پٹخ دیا تھا۔اس مواد کو ٹھنڈا ہو کر ٹھوس شکل اختیار کرنے میں برسوں لگے۔اور آج جو کچھ ہم دیکھتے ہیں وہ زمین پر عجیب شکلیں بناتی چٹانیں ہیں۔کہیں بھوری، کہیں سیاسی مائل اور کہیں مٹیالی چٹانیں۔جیسے بہت سے بچوں نے ڈھیریاں بنانے کا کلیڑو می ٹورنامنٹ منعقد کیا ہو۔بیسیوں مہیب ڈھیریاں، ایک کے بعد ایک، بے ترتیبی سے بنی پڑی ہوئی ہیں۔ان کا حجم و رنگ، اور شکل وصورت مختلف عظیم الجثّہ جانوروں کی سی لگتی ہے۔

یوں، یہ سڑک مٹی اور پتھر سے بنے جو راسک پارک کے بیچ میں سے بھاگ رہی ہوتی ہے۔ یہ پہاڑیاں بھول بھلیاں ہیں اور ہماری سڑک پھنسے ہوئے چوہے کی طرح کبھی اِدھر بھاگ نکلتی ہے، کبھی اُدھر سے فرار کا راستہ تلاش کرتی جاتی ہے۔ پہاڑوں، ٹیلوں اور کھر دراہٹوں کا یہ چڑیا گھر بے انت اور بے منتا ہی ہے۔حد نظر تک چاروں طرف یہ پہاڑیاں نظر آئیں گی، ایک بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری۔(کبھی غور کیا کہ بلوچ سیاست، ثقافت، محنت، نفرت، آرٹ، شاعری سب اس کی اِس جغرافیائی ساخت ہی سے پھوٹتی ہے!!)

ہم عجب رنگ اور ہیئت اور شکل والے پہاڑوں پتھروں چٹانوں میں سے گزر رہے تھے۔دریا کنارے گز، بیر، کہیجڑ کے درختوں جھاڑیوں کے ساتھ آنکھ مچولی کرتے ہوئے۔میلوں تک یہی منظر نامہ تھا۔کہیں ہم ہنگول دریا کا کنارہ تھامے بڑھ رہے تھے اور کہیں اس کی رَو سے دو چار میل کا فاصلہ رکھے جا رہے تھے۔

ہمیں سڑک کے قریب دو چار پہوال بچے بیر کے درخت کو سنگسار کرتے نظر آئے۔وہ اپنے ریوڑ سے بے خبر تھے، اور اُن کا ریوڑ اُن سے بے نیاز۔ان کی بھیڑیں دریا کنارے مکمّل آزادی

میں تھیں۔ حتمی، قطعی اور بے حد وحساب آزادی۔ بے شعور حتمی آزادی میں آدھا ریوڑ بیٹھا قیلولہ کر رہا تھا، اور دوسرا نصف، دریا کنارے گھاس اور جھاڑیوں کو ٹٹول رہا تھا۔ اور دو بھیڑیں یا تو فاقہ مستی میں یا پھر شکم سیری میں باہم دست و گریباں تھیں۔ مگر انہیں تو دست اور گریبان دونوں کی سہولتیں میسر نہ تھیں۔ یہ دونوں نعمتیں تو صرف انسان کے پاس تھیں۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جس قدر بھونڈا اور سفاک استعمال انہی دو نعمتوں کا انسان نے کیا ہے، اس سے کبھی کبھی اپنے انسان بننے سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ چنانچہ یہ بھیڑیں دست و گریباں نہ تھیں بلکہ سینگ و سر تھیں۔ اور وہ بھی اس حال میں کہ اُس ارینا میں نہ تماش بین موجود تھے، نہ باتیاتس کا کوئی اوورسیئر موجود تھا اور نہ کوئی تھرڈ امپائر۔ نہ سیٹی، نہ تالیاں اور نہ پریس کوریج۔

بھیڑوں کی سینگ آزمائی کا کھیل بلوچ قبائلی برادر کشی کی طرح ہے جس میں کسی ٹھوس وجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بلا سبب، بلا اشتعال، محض اللہ واسطے۔ بلوچ اور اس کے مویشیوں کا یہ کھیل سردی گرمی، بارش طوفان، ریل اور جیل ہر وقت اور ہر جگہ برپا ہو سکتا ہے۔ اِس میں زمان و مکان کی کوئی بندش اور پابندی نہیں ہوتی۔ چاہے تو اِسے اِن ڈور کھیلیں چاہے تو آؤٹ ڈور منعقد کریں۔ اور چونکہ اس جنگ میں ہار جیت کا کوئی تصور موجود نہیں ہے اور بس، کھیل برائے کھیل، جنگ برائے جنگ، قتل برائے قتل ہے، اس لیے چاہیں تو تھک کر چھوڑ دیں، اور چاہیں تو تیس سال سبی میں سینگ و سر رہیں اور کسی ترکمن کے ہاتھ اپنی کمان دینے اور اپنی مکمّل بربادی تک اُسے جاری رکھیں۔

گز کے ایک درخت پہ گلہریاں شجر پیمائی کی مہم سر کر رہی ہیں۔ گز کے درخت محض گلہریوں کے ریس کورس ہی نہیں، ان کے جھنڈ تو گیدڑوں، لومڑوں اور جنگلی بلی کے مسکن بھی ہیں۔

یہاں ہم ایک بحث میں مبتلا ہو گئے۔ بحث یہ تھی کہ کیا بلوچ ٹھیک ہیں یا پھر انگریز؟ اس لیے کہ اُن کے ہاں لومڑی چالاک اور مکار مشہور ہے۔ ہمارے ہاں لومڑ کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ یک دم زیرو ہے۔ ہمیں صرف ایک فوک شاعری میں لومڑ کے مکار و سازشی والی خصلت کی بات ملی۔ وہ یوں کہ ایوب خان اور فاطمہ جناح کے الیکشن میں ایوب نے اپنے حق میں دھاندلی کرائی تھی، اور شاعر

نے کہا تھا:

''ایوب نے جناح کو پرے دھکیلا اور روباہ جیسی چالاکی سے وطن پہ قبضہ کر لیا''۔

بلوچ کے ہاں تو مکاری کے ہر رنگ اور ہر شیڈ کی ملکیت گیدڑ کی ہے۔ نیز لغوری بزدلی کا اضافی مگر مستقل چارج بھی گیدڑ ہی کو ودیعت ہے۔

اور ایک اور دلچسپ فرق بھی بلوچ اور انگریز میں ہے۔ بلوچ کبھی بھی اپنے بچوں پر اِن جانوروں کے نام نہیں رکھتا۔ ہمارا کوئی قبائلی مسٹر فوکس اور وولف نام کا آپ کو نہیں ملے گا۔

فوکس اور وولف اور جیکال کی انسان سے یاری بالکل نہیں ہے۔ وہ اُس کے ''سائے'' سے بھی دور بھاگتے ہیں۔ ٹاکرا ہو تو غصے اور خوف کا کاک ٹیل پی کر بھاگ پڑتے ہیں۔

چیتا، شیر، بھیڑیا اور ہرن البتہ ذرا بلند معیار ہوتے ہیں، بلندیوں میں زندگی گزارتے ہیں۔ یہ واقعتاً بڑی جنٹلمین زندگی گزارتے ہیں۔ روایتوں اور رسم و رواج کے پکے۔ کمال یہ ہے کہ درندے ہوتے ہوئے بھی یہ کبھی بھی بلا جواز، اور محض دھاک بٹھانے کی خاطر قتل و غارت نہیں کرتے۔ یہ تو محض اپنی بھوک مٹانے کے لیے ایک جانور کو شکار کرتے ہیں، قتلِ عام قطعاً نہیں کرتے۔ اور اپنے شکار پہ اپنی وقتی بھوک ہی مٹا کر چلتے بنتے ہیں۔ اور بقیہ شکار کو نہ کوئٹہ میں ذخیرہ کرتے ہیں نہ کراچی، لندن اور دبئی میں ہڈیوں اور گوشت کے محل بناتے ہیں، بلکہ لگڑ بھگڑوں، گیدڑوں اور دوسرے مردار خور موقع پرست مڈل کلاسیوں کے کھانے کو چھوڑ جاتے ہیں۔ یہاں اگر صنفی مساوات نہیں ہے تو صنفی اپارتھائیڈ بھی موجود نہیں ہے۔

شکر ہے کہ بلوچستان کا ہنگول ابھی پالتو نہیں بنا۔ یہاں کی گلہریاں، کوے، گیدڑ اور لومڑی ابھی تک خارجی کو دیکھ کر لالچ میں اپنی آنکھیں نہیں چمکاتیں۔ ابھی تک دم ہلا ہلا کر کیک اور پیسٹری کی آس کی عادت اُنہیں نہیں پڑی ہے۔ یہاں کے انسان کو بھی۔

ہنگول کیا ہے؟ گھنٹیاں بجاتے ریوڑ، شفیلی بجاتے چرواہے اور بار بردار اونٹوں کی قطار .....اور فطرت..... یک دم چُپ، یکساں خاموشی۔ اتاہ ترین اور، بے کراں خاموشی۔

ہم ایک رواں دریا کے پیچ وخم کے ساتھ ساتھ بہت اچھی سڑک پہ جا رہے تھے۔مگر کم رفتاری سے۔اس لیے نہیں کہ بلوچستان کی دیگر سڑکوں کی طرح یہ سڑک خراب تھی۔ بلکہ اس لیے کہ آس پاس کے پرکشش مناظر ہمیں تیز چلنے نہیں دے رہے تھے۔مناظر میں موجود یہ خاموشی ایک پھیلنے والی بیماری کی طرح آپ کو لگ جاتی ہے۔ہم نے بھی باتیں بند کردی تھیں، کہ کبھی کبھی باتیں، مناظر دیکھنے میں خلل ڈالتی ہیں۔ ہم خاموش ، ہماری ٹیپ خاموش، قرب و جوار کی فطرت خاموش۔بس ''بہتا ہوا چشمہ بولے''۔مگر یہ تو چشمہ نہ تھا کہ شور مچاتا۔یہ تو مقدس دریائے ہنگول تھا۔بے پرواہی سے،اور لاابالی میں پہاڑوں کے بیچ صدیوں سے مٹکتا، بل کھاتا، رقصاں دریا۔ذرا سی چینج کے لیے کہیں بڑ بڑاتا ہے، کہیں آبشار ہوجاتا ہے، کہیں نیلا جھیل بن جاتا ہے، کہیں شکارگاہ مہیا کرتا ہے، کہیں ریوڑوں کے ریوڑوں کی پیاس بجھاتا ہے۔اور کہیں اپنے کناروں پہ کسی کھیلتے بچے کے کھلونے چھین کر اپنے ساتھ دور بہالے جاتا ہے، اور اُس سے اپنے اندر موجود آبی جانداروں کے بچوں کے ٹورنامنٹ منعقد کرواتا ہے۔بہتی چاندی کا یہ دریا اگر اس علاقے میں نہ ہوتا تو بلوچستان کتنا درشت لگتا.....ہنگول، بلوچ کا نرم چہرہ ہے۔

یہاں مجھے ایک تجسّس ہوا۔وہ یہ کہ اِس دریا کی پوجا ہوتی ہے یا نہیں؟۔دریائے گنگا ہو یا سندھو دریا، اُن کے کناروں پہ بسنے والے انہیں متبرک اور باکرامت گردانتے ہیں مگر بلوچ پتہ نہیں اپنے اس بڑے دریا کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں۔ دریا انسان کی تاریخ اور سولائزیشن کے ساتھ قریبی طور پر جڑے رہے ہیں۔فلسفہ اور روحانیت کے ساتھ پیوست ان کی ہمیشہ سے الوہیت کی تجسیم کے بطور پرستش ہوتی رہی ہے۔ دریا کنارے واقع مقامات کو مقدس مانا جاتا ہے۔ پرانے زمانے سے ''دریا پرستش'' اس بات کا احساس دلانے کے لیے جاری ہے تاکہ پانی کی اہمیت کا احساس رہے، پانی جو زندگی کی بقا کا ضامن ہے۔

مگر ہنگول دریا کے بارے میں ایسا کیوں مشہور نہیں؟۔بالخصوص جب اِس علاقے کا ایک ایک موڑ، ایک ایک پہاڑ بلوچ مائتھالوجی کا سرچشمہ ہو۔نہ کوئی عشتار، نہ کمب میلہ، نہ دریائے بیجی کی

کرامتوں کی پیروی۔یہ محض ندی نالہ نہیں، یہ تو 350 میل لمبا، اور بلوچستان کا سب سے طویل دریا ہے۔جی ہاں نہنگ اور بیجی طویل ترین دریا نہیں ہیں، بلکہ بلوچستان کا سب سے طویل دریا دریائے ہنگول ہے۔اور یہ موسمی نہیں بلکہ سال بھر بہتا دریا ہے۔ساون کی بارشوں میں یہ دیگر سارے سیلابی دریاؤں کی طرح دس دس گز بلند سیلابی ریلے انڈیلتا ہے۔اس کے باوجود یہ طویل اور عظمت بھرا دریا مائتھالوجی سے خالی ہو، حیرانی ہوتی ہے۔

کیا ستی کی بزرگی اور عظمت نے پرشکوہ ہنگول دریا کی کرامت خود چوس لی؟۔

ہم، جیسے بلوچستان گھوم نہ رہے ہوں، بلکہ جیسے دوستوئفسکی کا کوئی ناول پڑھ رہے ہوں۔ جیسے ورڈزورتھ کی کوئی نظم دیکھ رہے ہو، جیسے شاہ لطیف کی سنت دہرا رہے ہوں، جیسے توکلی مست کی منظر بیانی گنگنا رہے ہوں۔اے ناول نگار! تم اپنا ناول بے شک کرسی میز پہ بیٹھ کر لکھو مگر میری فرمائش ہے کہ ایک بار ہنگول گھوم لو، پھر لکھنے بیٹھ جاؤ۔

اور اگر آپ ناول نگار نہیں ہیں، شاعر نہیں ہیں۔نیچر لسٹ نہیں ہیں؟۔تو ذرا ہنگول ہو آؤ، جام درک بن جاؤ گے، مرید بلیدی بن کر گنگنانے مسکرانے لگو گے، جینی جیسے خطوط لکھنے لگو گے۔

ہاں مگر سکوت کا مزہ لینے کے لیے ضروری ہے کہ لاؤلشکر ساتھ نہ ہو۔بس ''ہم مزاج'' تین چار ساتھی ہوں۔ایسے ساتھی جو فطرت اور اُس کے بچوں سے باتیں بھی کریں۔مگر جنہیں چپ ہوجانا بھی آتا ہو۔

بلوچستان سے یاری کرنی ہو تو اُس کی چُپ میں بھی اُتنا ہی حصہ ڈالنا ہوتا ہے جتنا کہ اُس کے شور میں۔چپ اور سنگینی تو بلوچستان کی اصل زبان ہے، آوازیں تو محض اُس کی سنگت ہیں۔آواز بلوچستان کی ترجمان کب رہی ہے۔

ویسے بھی بھدے ترجمے کو دس بار پڑھنے سے بہتر ہے کہ آدمی اصل متن صرف ایک بار پڑھے۔خاموشی کا پڑھنا البتہ مشکل ضرور ہے۔بلوچستان بہت وقت آپ کو چُپ کرا دیتا ہے۔خود بھی چُپ، آپ بھی چُپ۔اتاہ، پرسکون، حتمی چُپ۔اتھاہ شانتی۔(اب میں وہ ذومعنی لفظ نہیں دوہراؤں گا

جو ہمارا نواب اکبر خان بگٹی اپنے مصاحب نما دوستوں سے کہا کرتا تھا۔ وہ جب سب کا فرداً فرداً حال حوال پوچھتا تو جب بھی کوئی بطور تکیہِ کلام ''شانتی'' کہتا تو نواب فوراً پوچھتا ''کہاں ہے شانتی؟''.....
سچی بات یہ ہے کہ ہم قرنوں سے شانتی شانتی کا ارمان لیے پشت در پشت جیے جاتے ہیں، شانتی ہے کہ بلوچستان لوٹتی ہی نہیں!!)

المختصر، اے ہنگول کے زائر! جلسہِ عام کے ساتھ ہنگول کا سفر قطعاً نہ کرنا۔

دریائے ہنگول پر ایک خوب صورت طویل پل ہماری آنکھوں کے لیے ایک دل فریب دعوت تھی۔ دراصل اوپر بہت دُور کہیں پرشکوہ پہاڑوں کے بیچ پانچ دریا مل جاتے ہیں، تب ہنگول بنتا ہے۔ اور اِس دریا کا ''کوالی ٹیٹو'' روپ اُس وقت ہوتا ہے، جب یہ تین سو پچاس میل چل کر بحیرہِ بلوچ میں اتر جاتا ہے۔

بلوچ مائتھالوجی اور ہنگلاج ماتا مندر

(بلوچ آزمانک)

اور یوں، آپ اچانک اُس گیٹ پر پہنچتے ہیں جس پر لکھا ہے: نانی مندر، ہنگلاج کا مندر۔
اور آس پاس سرخ، نارنجی جھنڈے ہیں، بینرز پوسٹرز ہیں۔

یہ مندر ہے، مزار ہے، تاریخی مقام ہے یا عبادت گاہ، تاریخ ابھی تک فیصلہ نہ کر پائی۔ شاید انگلش کا Shrine لفظ ہی درست ہو۔ مزار، آستانہ.....

کبھی کبھی اتاہ بے بسی میں میں اپنا ہی نچلا ہونٹ کاٹتا ہوں۔ بلوچ دنیا کی بے بس ترین قوم ہے۔ اُسے تین سو سال سے گردن پہ لات رکھ کر معاشی وسائل، سیاسی وجغرافیائی آزادی جیسی (لازمی اور اشرف المخلوقاتی) سیاسی باتوں میں ڈال دیا گیا ہے۔ اور جواں مردی اور انسانیت بھری اپنی اِن چھ نصف صدیوں میں اُسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ ثقافتی طور پر کس قدر لٹ چکا ہے۔ دنیا تو کیا خود اُس کے بچوں کو بھی معلوم نہیں کہ اس کی سرزمین پانچ کروڑ برس قبل کی خشکی والی وہیل مچھلی ''روڈھوسی ٹس بلوچستانی سس'' کی مسکن ہے۔ ساڑھے تین کروڑ سالوں سے بلوچی تھیریم اُسی کے سینے میں دفن ہے۔ نیز اُسے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ ساری مائتھالوجی دراصل اُس کی ہے جس کو غیر محسوس طور پر اُس سے چھین لیا گیا ہے اور اُس پر بعد میں ایک پورا مذہب (ہندومت) کھڑا کرنے کی

کوشش کی جارہی ہے ۔ بلوچ مائتھالوجی کے سرچشمہ یعنی ہنگلاج کے بارے میں ہماری قوم کی معلومات صفر ہیں۔ہم میں سے کتنے لوگ جانتے ہیں کہ بلوچستان پورے ہندوستان، سری لنکا، اور نیپال کی زیارت گاہ ہے۔ کیسے خود کو بتایا جائے کہ شیو، ستی، گنڑیش، وشنو، یہ سب دیو، یہ سب پریاں بلوچستان سے ہیں۔

مائتھالوجی کیا ہے؟۔ یہ یونانی لفظ myth ہے جس کا مطلب ہے: داستان، فوک کہانی، .....۔بلوچستان کی ہر وادی ایک مائتھالوجی کی نرم و آرام دِہ گود ہے۔اس کا ہر پہاڑ ایک داستان اپنے سینے میں دفن کیے بیٹھا ہے۔اس کا ہر دریا ایک سولائزیشن کا خالق ہے اور اس کا ہر درہ ایک ناول ہے۔بلوچستان قصہ خوانی کی کتاب ہے۔

بلوچ مائتھالوجی ہماری قوم کی تہذیب وثقافت کی بنیاد ہے۔ایسے قصے اور داستانیں جہاں فطرت کو، فطرت کے مظاہر کو، دیوؤں پریوں کو، اور مافوق الفطرت انسانوں کو جسم کی صورت دی جاتی ہے۔اُن سے کہانیاں اور قصے بنتے ہیں، ہمارے آبا نے اپنی رسموں کو تاریخی واقعات بنا کر بہت رنگین انداز دے کر پیش کیا تھا۔

دوسرے لفظوں میں ہماری قوم فطرت، تاریخ اور رواجوں کی وضاحت کے لیے ہزاروں برسوں سے جو کہانیاں بناتی رہی ہے، اُن کے مجموعے کو بلوچ مائتھالوجی کہتے ہیں۔ بدقسمت ہے وہ قوم اور وہ زبان جس کی اپنی مائتھالوجی نہ ہو۔

واضح کرنا ضروری ہے کہ مائتھالوجی کا مذاہب سے کسی طرح کا کوئی تعلّق نہیں ہے .....انسان کی ترقی کے لیے میتھالوجیوں کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔

یہ بات بھی واضح کر دینی چاہیے کہ بلوچستان مائتھالوجیوں کی ''ماں'' ہے۔ یہ بھی، کہ یہاں کے مائتھالوجی منظّم مذہبوں یعنی یہودیت، مسیحیت، ہندومت، اسلام اور بدھ مت آنے سے ہزاروں سال پرانے ہیں۔

ہم یہ ذکر صرف بلوچستان میں موجود ہندو بلوچوں کے لیے نہیں کر رہے، اس لیے کہ ہندو

مت تو ابھی تک مکمّل طور پر ایک منظّم اور واحد مذہب بنا ہی نہیں ہے۔ہم تو ہندومت سے بھی ہزاروں برس قبل والے بلوچستان اور اس کے اساطیر کی بات کر رہے ہیں۔اسی طرح ہم اپنی اُس تاریخ کے ضمن میں بات کر رہے ہیں، جس سے ہم بلوچ، ہزاروں سال پہلے گزرے۔ ہماری مائتھالوجی کوئی خاص مذہب نہ تھی اور نہ ہی منظّم انداز میں ایک مذہبی خانے میں فٹ آتی تھی۔ یہ قصے تو سخت حالات میں رہتے ہوئے انسان کے ایسے سہارے تھے، جو دنیا کی ہر جگہ اور ہر علاقے میں معمولی فرق کے ساتھ موجود رہے ہیں۔اور یہاں تو ہم حضرت یسوع کی پیدائش سے بھی تین چار ہزار سال قبل کی بات کر رہے ہیں۔

ہنگلاج ماتا کا یہ مندر بلوچستان کے ضلع لسبیلہ کے لیاری تحصیل کے دور دراز اور دشوار گزار کوہستانی علاقے میں ایک تنگ گھاٹی میں ہے۔ یہ مندر ایک چھوٹے قدرتی غار (جُڈو) میں ہے۔ یہ دیوی کا، انسان کا بنایا ہوا بت نہیں ہے۔ بلکہ یہ اُس غار کے فرش کے پتھر میں ایک ابھرتی ہوئی صورت ہے۔ جیسے ایک خاتون سوئی ہوئی ہو۔اُس کا سر، ناک کا ابھار اور ناک کے دونوں اطراف چھوٹے گڑھے آنکھوں کی صورت ہیں۔پتھر سے بنا، لیٹا ہوا، قدرتی بت۔

یہ پورے ہندوستان میں بالخصوص کلدیوی، کھشتر یہ اور دیگر ہندوگرو ہوں میں مشہور ہے۔ یہ ہندوستان، پاکستان اور دنیا کے دیگر ملکوں کے ہندوؤں کی ایک مقدس زیارت گاہ ہے۔ یہاں اپریل میں چار روزہ زبردست میلہ ہوتا ہے۔ میں سوچتے ہوئے حیران ہوتا ہوں کہ دیومالائی بلوچستان کے حسن وموسیقیت میں کیا اضافہ کیا جاسکتا ہوگا، خواہ وہ موسیقی بھجن ہی کیوں نہ ہو۔ بلوچستان کی خاموش نبض اپنے اندر کس قدر متنوع نبضیں رکھتی ہوگی، ابھی اور عیسوی ملینیم چاہئیں اندازہ کرنے کو۔ بھجن تو اُس مدہم وملائم ونیم روشنی اور روحانیت کو خوب بے آرام کرتا ہے جو ازل سے یہاں موجود ہے۔ انڈیا، نیپال اور دنیا بھر سے ہندو زائرین آتے ہیں۔شاہ لطیف سے لے کر ہندوستان کے طاقت ور وزیر خارجہ جسونت سنگھ (جنوری 2006ء) تک صدیوں سے لوگ زیارت کرنے آتے ہیں۔ چنانچہ ہنگول پارک ایسا ٹورازم سپاٹ نہیں جہاں آپ لوگوں کو بلائیں۔

یہاں تو آٹو میٹک طور پر لاکھوں ہندو زائرین نے آنا ہوتا ہے، مذہبی لزومیت کے سبب۔ لہٰذا اُسے پرکشش بنائیں یا نہ بنائیں اُسے تکالیف و پریشانیوں سے مبرا علاقہ بنا دیں۔ ویسے یہاں ہم نے اچھی خاصی سہولتیں دیکھی بھی ہیں۔ یہاں سولر پلیٹوں کے ذریعے دن رات بجلی موجود ہے اور ایک دور افتادہ، غیر آباد علاقہ عجیب رنگوں اور مختلف طاقت کے بلبوں سے روشن رہتا ہے۔ ڈیزل جنریٹر اُس کے علاوہ ہیں۔ باتھ روم بنے ہوئے ہیں۔

ہنگلاج زیارت پیچ وختم کھاتے بہتے پانی کے برساتی دریا کے ساتھ ساتھ بنائی گئی سڑک کے آخر میں واقع ہے۔ جس کے بعد ایک بہت بڑا پہاڑ اس ندی کو بند کر دیتا ہے۔

بلوچ اُسے بی بی ''نانی کی زیارت'' بھی کہتے ہیں۔ ہمارے لوگ ہزاروں سالوں سے یہاں کی زیارت کرتے ہیں۔ سرخ کپڑے پہنے، خوشبو لگائے، چراغ جلاتے اور شیرینی بانٹتے ہوئے۔ اور اگر آپ بلوچ کے سامنے نانی کے بجائے ہنگلاج کہہ دیں تو گویا آپ نے نام ٹھیک سے نہ لیا ہو۔ بے حد عقیدت مند ہیں بلوچ اس عظیم ورثے کے۔

یہ بی بی نانی کون ہے؟ کوئی نہیں جانتا۔ یہ اسلام سے بہت پہلے کا مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ ابھی دو تین ہزار سال تک تو ایسی کوئی ہستی پیدا نہ ہوئی تھی۔ یہ پانچ چھ ہزار پرانا افسانوی (آزمائکی) وجود ہے، جس کی ناز برداری آج بھی بلوچ کرتا ہے۔ نانی، یونانی دیوی اناہیتا ہے یا پھر اناہیتا، نانی ہے؟۔ پتہ نہیں۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ بی بی نانی کی زیارت صرف ہنگلاج میں نہیں، ہمارے وطن میں یہ بے شمار جگہوں پر موجود ہے۔

چنانچہ، مہرگڑھ سے بھی قدیم تہذیب کا وارث بلوچستان مائتھالوجی کا اڈہ ہے۔.....

بلوچ کو کوئی تباہی' کوئی زوال نہیں کہ ہم سب سے پاک ومقدس جگہ یعنی ہنگلاج کے مالک ہیں۔ دس دس دفعہ تباہ کر دو بھی، مائتھالوجی اُسے زندہ کیے رکھے گی۔.....ایک دعویٰ سن لیجیے: ''بلوچ کو آپ ڈی کلچر نہیں کر سکتے''۔

نانی مندر جاتے ہی مرید اور سادھو ہاتھ جوڑ کر آپ کا سواگت ''ماتا جی کی جے'' کہہ کر کریں

گے۔ عاجز، منکسر، ملائم، اور خوش گفتار مرید۔ مست توکلی کے مزار کے رکھوالے کو 'مستہ ملنگ'' کہتے ہیں۔ ہنگلاج والے کو کیا کہوں؟۔ فقیر، مرید، ملنگ، یا کچھ اور؟۔ مجھ سے انہیں سجادہ نشین نہیں کہا جاتا، نہ ہی انہیں سادھو کہہ کر اپنی متاع، گنگا جمنا کے حوالے کر سکتا ہوں۔ ''ہنگلاجہ پخیر''، یا اِس جیسا نام!!۔

وہ سادھو دونوں ہاتھ جوڑ کر آپ کا استقبال ''ماتا جی کی جے'' سے کریں گے۔ عاجز، منکسر، ملائم اور خوش گفتار۔ بھئی یہ تو ہمارے بلوچ بقال ہیں۔ قمیص شلوار میں ملبوس۔ داڑھی پگڑی والے، ہمارے ہی طور طریقے، ہماری زبان بولتے ہوئے۔ ہاں، البتہ سائیں، بھوتار اور واجہ کے القابات ذرا زیادہ مقدار میں قے کرتے ہوئے۔ اقلیت میں ہونا ایک طرح کی غلامی ہوتی ہے۔ مگر یہ اقلیت تو کسی بورژوا صنعتی معاشرے میں بھی نہیں رہتی۔ یہ تو فیوڈل سندھ میں رہتی ہے یا پھر سردار زدہ بلوچستان میں۔ اِدھر ہنگلاج ماتا مندر کے سادھو ہمارے اپنے سردار زدہ معاشرے کے باسی ہیں۔

تماشا دیکھیے کہ پہلے تو سردار کے پاس طاقت بھی ہوتی تھی، اُسی کی جی حضوری کر کے بقیہ چھوٹے چھوٹے ظالموں بدمعاشوں سے محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ مگر، اب تو سردار اپنی عوامی پُشتی بانی کب سے کھو چکا ہے۔ بس مرکزی سرکاری پھوں پھاں میں بھتہ وصول کرنے والا مافیائی دادا بن چکا ہے۔ اِس کی پشت پر مرکزی سرکار موجود نہ ہو تو نہ تو وہ الیکشن جیت سکے، نہ وزیر بن سکے، نہ لیویز والے باڈی گارڈ ساتھ رکھ سکے.....لہٰذا اس بے اختیار فرعون کی جی حضوری کرتے کرتے نانی کا بھگت ''ہر'' شخص کو جی حضور کہنے کا عادی ہو چکا ہے۔

مگر عادتیں تو چھوٹتے چھوٹتی ہیں۔ ابھی تو وہ بات سنیے جو ہمارے راہنما دوست نے کہی تھی اور جو ہمیں سب سے اچھی لگی۔ ہوا یوں کہ کراچی کی سحر بلوچ ہم سے ناواقفیت کی بنا پر گروپ فوٹو سے ہچکچا رہی تھی۔ ٹائٹ جینز پہنی یہ، ننھّی منی لڑکی سی لگتی تھی۔ اِن سنسانوں میں جینز وہی خاتون پہن سکتی ہے، جسے کراچی شہر سے نکلنا بہت کم نصیب ہوتا ہو۔ چنانچہ جینز والی ڈان اخبار کی یہ ننھّی لگتی رپورٹر، فوٹو کھچوانے گروپ میں آنے سے تکلّف برت رہی تھی۔ ایرانی بلوچستان کی یہ لڑکی بلوچی زبان کا ایک لفظ تک بول نہ پاتی تھی۔ تازہ تازہ ملاقات میں بھلا کیسے گھل مل جاتی!۔ اور جیسے ہوتا ہے، وہ

ہمارے ساتھ ساتھ ہوتی، باتیں سنتی، محظوظ ہوتی مگر خود بولتی نہ تھی اور گروپ تصویر کشی کے وقت جبلّت کے ہاتھوں تین چار گز پرے ہو جاتی۔ گائیڈ کرنے والے ریش بردار پجاری نے، اُس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انتہائی ملائمت سے کہا: ''ماتا جی آپ بھی آئیے ناں!''۔

ننھّی منی لگتی سحر بلوچ تو ہمارے ساتھ ہی داستانوں کے غاروں کی سیڑھیاں بلندیاں چڑھتی رہی، خاموش مگر بھرپور سامع۔ بلوچستان کی اِس نئی ثقافتی تاریخی وسعت کو دیکھ کر جس طرح ہم باقی لوگوں کے ذہنوں دلوں کی ہوائیاں اڑ رہی تھیں، سحر بلوچ اُس سب سے بے خبر لگ رہی تھی۔ شاید ہم پچپنائے سٹھیائے لوگوں کا احساسِ زیاں اِس نوجوان کو نہیں ہو رہا تھا۔

سعدیہ بلوچ تو خیر وطن کی ایک اور نعمت سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ چٹان کے سائے میں بہتی ندی کنارے سگریٹ کے کش لگانے کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ پتہ نہیں وہ کوئی شعر سوچ رہی تھی یا دور آسمانوں میں کسی نئی ستی اور شیو کا ملاپ Conceive کر رہی تھی۔ وہ کراچی کے صنعتی معاشرہ کی شاعری کرتی ہے۔ مجھے اپنی فرسودگی پسماندگی، نام نہاد اخلاقی گھٹن والی تربیت اور فیوڈل غلام فطرت نے مشہور بھجن سنانے سے روک دیا۔

****

نانی کے مرید ہمیں معلومات دیتے رہے۔ مگر اُن کی ساری معلومات عقیدے میں گُندھی ہوئی تھیں۔ عقیدہ اور ''آزمانک'' کا آپس میں کوئی سمبندھ نہیں ہوتی۔ آزمانک میں نے متھ Myth کو کہا ہے۔ دراصل آسمان کو ہم ''آزمان'' کہتے ہیں۔ اور چوں کہ پری اور دیو آزمانوں میں رہتے ہیں، اس لیے اُن سے متعلّق قصے کہانیوں کو ہم ''آزمانک'' کہتے ہیں۔ اور آزمان میں رہنے والی پریاں اور دیو وہی کچھ کرتے ہیں جو زمین پہ ہم انسان کرتے ہیں۔ شادیاں، محبّت، اغوا، کثیر بیویاں، مستیاں، شرارتیں.....

مگر یہاں معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہاں ہنگلاج کا ہمارا ملنگ و مجاور تو ہزاروں برس قدیم ہمارا اساطیر کو آج اکیسویں صدی کے بلوچستان کا مُلّا اور پنڈٹ بنانے لگا تھا۔ لہٰذا اُس کا سارا مبلغ علم

ہمارے دانش ور دوستوں کے سائنسی سوالات کے سامنے بار بار گھٹنے ٹیک جاتا تھا۔ ہم اور یہ گائیڈ دونوں نادان تھے اس لیے کہ مجاور مائتھالوجی کو مذہب سمجھ رہا تھا اور ہم مائتھالوجی کو سائنس کے گز سے ناپنے کی کوشش کر رہے تھے۔

تفصیل اور سوال تو مائتھالوجی کو قتل کر دیتے ہیں۔ اور ہم نے اس درے میں موجود بہت سارے گائیڈوں، مریدوں اور پنڈتوں کی معلومات کی لاشیں تڑپتی دیکھیں۔

بھئی 5000 برس پرانے، اساطیر سے بھرے Shrine کی معلومات ایک عام پجاری کیا دے پائے گا۔ ہمیں احساس ہوا کہ یہاں تو مائتھالوجی نامی سائنسی مضمون کے پی ایچ ڈی گائیڈ چاہئیں، یہ مَن مِن کرتے پجاریوں کے بس کی بات نہیں۔

بلوچ مائتھالوجی کے مطابق ستی، یا، دُرگا ایک پری تھی۔ اُس کے دس بازو تھے۔ ان میں اس نے جنگی ہتھیار پکڑے ہوئے ہیں۔ وہ بدمعاش دیوؤں یعنی راکھشسوں کو ختم کرنے والی پری ہے اور اس مقصد سے اس نے بہت سے جنم لیے ہیں۔ اُسے ستی اور پاروتی (پہاڑوں والی) بھی کہا جاتا ہے۔ اُس کے کل ناموں کی تعداد ایک ہزار سے زیادہ ہے۔ ظاہر ہے یہ پری زمین پر تو نہیں رہتی تھی، دور کہیں آسمانوں میں اس کا محل ماڑی تھا۔ اور یہ پری چوں کہ انسان نہیں ہوتی، اس لیے محض زمین تک محدود نہیں رہتی۔ وہ زمین آسمان اور سمندر جہاں چاہے جب چاہے پل بھر میں موجود ہو سکتی ہے۔ ستی کے باپ کا نام دِکشا ہے جو کہ خود دیو ہے، پہاڑوں کا دیو۔

دکشا کی اس بیٹی ستّی کو ایک دیو سے محبّت ہو گئی۔ .....شیو دیو سے: ''تباہ کرنے والا'' ''موت کا شہزادہ'' اور ''جنگ کا دیو''۔ اِس شیو کو بعض اوقات پانچ چہروں اور چار بازوؤں کے ساتھ اور دوسری جگہوں پر قدرتی طور پر آدمی کی شکل میں، لیکن ایک اضافی آنکھ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ یہ کھوپڑیوں کا ہار پہنا ہوتا ہے۔ وہ کٹی پھٹی لاشوں پر ناچتا ہے۔ اور مقتولوں کی کھوپڑیوں سے خون پیتا ہے۔ شیو، درگا کے علاوہ کالی دیو کا خاوند بھی ہے۔ بلوچستان سے باہر ہندوستان وغیرہ میں ہر سال اس کے احترام میں تہوار منائے جاتے ہیں۔ اور ان تہواروں میں خود پر اذیت ناک تشدد کیا جاتا ہے۔

مثلاً زبان کاٹنا، زخم میں لکڑی کے ٹکڑے داخل کرنا.....

پتہ نہیں انسان سپر پاورز کی تابعداری میں اور ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود پر تشدد کیوں کرتا ہے۔ کیا بھگوان یہی چاہتا ہے کہ بھگت خود کو پیٹے، مارے؟۔

ہم دُرگا پری کی بات کر رہے تھے، جسے شیو دیو سے محبّت ہوگئی تھی۔ اور وہ اس سے شادی کرنا چاہتی ہے۔ مگر شیو ہر طرح سے اس کی حوصلہ شکنی کرتا رہتا ہے۔ ستی، درگا، یا، پاروتی نے ہر جتن کر کے دیکھا۔ اس نے اُس کے حصول کے لیے روزے رکھے، دور تنہائی میں عبادت و دعائیں کیں، محبّت و جنسی دیو کی مدد حاصل کی، منہ بولے بھائی وشنو نے اس کی کافی مدد کی۔ مگر وہ شیو کا دل جیتنے میں کامیاب نہیں ہو رہی تھی۔

وشنو یعنی ''حفاظت کرنے والا'' کے بارے میں آپ کو بتاؤں کہ وہ بھی ایک دیو ہے اور وہ ستی کا منہ بولا بھائی ہے۔ اس کے چار بازو ہیں۔ اس نے ایک ہاتھ میں نیزہ، دوسرے میں سنکھ، تیسرے میں ایک پہیہ اور چوتھے میں کنول پکڑا ہوا ہے۔ اس کے کپڑے نارنجی رنگ کے ہیں اور وہ ایک ایسے جانور پر سوار ہے جو آدھا آدمی ہے اور آدھا پرندہ ۔ وہ گھر بار کا دیو ہے اور خاندان کی بدبختیوں کو دور کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ وہ خوش حالی اور خوش قسمتی کی پری لکشمی کا خاوند ہے۔ (آپ یہ دلچسپ حقیقت نوٹ کر لیں کہ اس بلوچ مائتھالوجی میں کپڑا ایجاد ہو چکا تھا۔ نیز رنگ سازی بھی موجود تھی۔ ساتھ میں نیزہ لوہے کے زمانے کی طرف کے زمانے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ یہ بھی دیکھیے کہ یہاں انسان کے سماج میں شادی کا ادارہ قائم ہو چکا ہے)۔

ہم نے ملنگ سے ستی کے بارے میں مزید تفصیل پوچھی۔ اُس کا شیو نامی دیو کے ساتھ عشق ابھی تک یک طرفہ تھا۔ اس کی ہر کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ مگر اُس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے باپ کا محل چھوڑا اور جنگل ویران میں بیٹھ گئی۔ کھانا چھوڑ دیا اور محض دن کا ایک پتا درخت کا کھا کر گزارہ کرتی رہی۔ بالآخر وہ بھی ترک کر دیا۔ مکمّل بھوک۔

یوں کہیں جا کر اس نے شیو کی محبّت حاصل کر لی۔ اور اپنے باپ کی مرضی کے برخلاف

شادی شدہ شیو دیو سے شادی کر لی ۔ (کثیر ازدواجی کا رواج۔ باپ سے بغاوت کی مثالیں!!)۔

میں نے نانی غار سے آس پاس کنراج پہاڑ کی طرف نگاہ دوڑائی۔ اور میری سمجھ میں آ گیا کہ رومانویت ہزاروں سالوں سے بلوچ کی رگوں میں کیوں موجود ہے۔ بھئی، سنگلاخ بلوچستان کو رومانویت نے ہی رہائش کے قابل بنا رکھا ہے۔ نہیں؟!

اُس کا باپ دکشا ضدی اور مغرور دیو تھا۔ اس نے ایک عظیم یجنا (آگ کی ایک بہت بڑی عبادت) منعقد کی۔ (اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمارے اساطیر میں آتش پرستی زرتشیوں سے بھی پہلے سے موجود تھی)۔ آگ کا تقدس اس لیے کہ یہ گرمائش و روشنی کا ہی منبع نہیں بلکہ یہ رات کو درندوں سے بچاتی ہے۔ مچھروں، کیڑے مکوڑوں سے بچاتی ہے۔ خوف کو بھگاتی ہے۔ اسی لیے تو یہ محض عبادت کے ہی نہیں بلکہ ایسا چیف جسٹس بھی ہے کہ اس میں سے ننگے پیر چل کر پار ہو گئے تو بے گناہ، اور اگر جل گئے تو دوشی۔

ضدی اور مغرور دکشا نے اس عبادت کے جشن میں سارے دیویوں، پریوں اور شہزادوں کو شمولیت کی دعوت دی.....مگر اس نے ستی اور شیو کو نہیں بلایا۔ ستی کا تو خیر تھا مگر شیو کو نہ بلانا بہت مستی کی بات تھی۔ شیو تو سارے دیوؤں میں سب سے طاقت ور تھا۔ یہ تو بہت ہتک اور توہین کی بات تھی۔

ستی اس نظر اندازی کے باوجود باپ کے گھر جانا چاہتی تھی۔ آخر وہ اس کا باپ تھا۔ اُس نے خاوند سے وہاں جانے کی ضد کی۔ شیو خود تو جانے پہ راضی نہ ہوا البتہ ستی کے وہاں جانے پہ کوئی اعتراض نہ کیا۔ ستی وہاں گئی تو دیکھا کہ عبادت میں اُس کے لیے اور اس کے خاوند کے لیے کوئی جگہ نہیں رکھی گئی۔ کسی نے اس کا استقبال نہ کیا۔ بلکہ وہ پہنچی تو اس کا باپ اس پر بہت چیخا، اس کی بے عزتی کی۔ اور اس کے خاوند شیو کی زبردست توہین کی۔ ستی دیوی اپنے محبوب خاوند کی اِس توہین برداشت نہ کر سکی۔ اس نے اُسی یجنا کُنڈ (آگ) میں کود کر خودکشی کر لی۔ پری مر تو گئی مگر اُس کا جسم جلا نہیں۔ (مائتھالوجی میں ایسا ہی ہوتا ہے)۔

یہ جو ہندوستان وغیرہ میں ستی بننے کا رواج ابھی تک ہے ناں شوہر کی موت پہ، تو یہ دراصل ستی کی اُس وفاداری کی پیروی ہے جو اُس نے اپنے خاوند سے دکھائی تھی۔ جس کے وقار کی خاطر اُس نے خود کو آگ کے شعلوں کے حوالے کیا تھا۔

اپنی محبوبہ کی موت پہ ظاہر ہے شیو دیوتا غصے سے بپھر گیا۔ اس نے اپنے آدمی بھیجے اور تقریب کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا (اچھا؟ یہ آدمی بھیجنے کی سردار گردی تب بھی موجود تھی!!)۔ اُس نے دکشا کا سر تن سے جدا کر دیا۔ شیو دیو نے اپنی محبوبہ بیوی، ستی کی لاش کندھے پہ رکھی اور تباہ کن رقص شروع کر دیا۔

شیو دیوتا کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ رقص کا دیوتا بھی ہے۔ رقص کے ذریعے وہ دنیا میں تبدیلیاں لاتا رہتا ہے۔ اُس کا ایک رقص تو بالخصوص سب سے تباہ کن ہوتا ہے۔ وہ جب سخت ناراض یا غصے میں ہوتا ہے تو تباہی والا اپنا یہ رقص کرتا ہے۔ لولاک کو اتھل پتھل کرنے کا رقص، پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنے کا رقص۔

اُس روز بھی غصے سے بپھرے شیو نے یہی رقص شروع کیا۔ جب اُس کے رقص سے دنیا تباہی کے دہانے پر پہنچنے کے قریب ہوتی ہے تو لوگ دوڑے دوڑے دوسرے دیو کے پاس چلے گئے۔ جس کا نام وشنو تھا۔ انہوں نے اس سے فریاد کی کہ کسی تدبیر اور حکمت سے شیو کو رقص سے روکے ورنہ دنیا تباہ ہو جائے گی۔ تب وشنو دیو، پاروتی کے جسم کو اپنے سُدرشن چکرا کے ذریعے باون ٹکڑوں میں کاٹ ڈالتا ہے اور اُن ٹکڑوں کو ایشیا بھر میں پھینک دیتا ہے، تاکہ لاش غائب ہو جائے اور شیوا اپنا تباہ کن غصہ بھول پائے۔

ستی (پاروتی) پری کے جسم کے یہ باون ٹکڑے مغرب میں بلوچستان سے لے کر، مشرق میں گوہاٹی تک، اور یہاں سے بہت دور سری لنکا تک پورے جنوبی ایشیا میں جگہ جگہ گرے۔ جہاں جہاں یہ ٹکڑے گرے وہاں ''تیرتھ استان'' یعنی مقدس زیارت گاہیں قائم ہوئیں، مختلف ناموں سے۔ بلوچستان کا ہنگلاج (کُنراج پہاڑ میں واقع) سب سے مقدس ٹھہرا، اس لیے کہ پاروتی پری کا

سر یہاں گرا۔ اس کا نام ہوا: ہنگلاج تیرتھ۔

پتہ نہیں اُس زمانے میں انسان کو جغرافیہ کس طرح معلوم تھا کہ وہ قطب نما، خلائی جہاز اور دیگر آلات کے بغیر پاروتی کی لاش کے باون ٹکڑے تلاش کر بیٹھا۔ اور وہ بھی، ایک ٹکڑا بلوچستان اور دوسرا ہزاروں میل دور گوہاٹی میں۔

.....ہم پھر آپ کو خبردار کرتے ہیں کہ مائتھالوجی کے مزے لو، سوال نہ پوچھو۔ یہ ہمارے اجداد کی قائم کردہ داستانیں ہیں۔ انہیں فخر سے سنو، اپنے بچوں کو کہانی کے بطور سناؤ۔ اور اپنے ادب پہ نازاں ہو جاؤ، اپنی قدامت اور اپنی دھرتی کی تقدیس پہ اتراؤ۔

چوں کہ ستی، یا، پاروتی پری کا سر بلوچستان میں ہے، اس لیے اُس کا ہنگلاج بقیہ اکیاون زیارت گاہوں میں سب سے مقدس ہے۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ ستی پری سے وابستہ اِن سارے باون مقدس مقامات کو کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکتا، اس لیے کہ اِن سارے مقامات کی حفاظت شیو دیو کا ایک خون خوار دیو کرتا ہے۔ (تقدسات کی حفاظت ہمیشہ انسان سے زیادہ طاقت ور ماورائی قوتیں کرتی ہے)۔

ایک مقبول ترین روایت یہ بھی ہے کہ ''وچاتر'' نامی ایک بادشاہ تھا۔ اس کے دو بیٹے تھے: ہنگول اور سندر۔ وہ بہادر مگر ظالم تھے اور عیاش زندگی گزارتے تھے۔ وہاں کے لوگ شیو دیوتا کے پیروکار تھے۔ شہزادہ سندر نے اِن علاقوں پر حملہ کیا اور ہزاروں کو قتل کر دیا اور سونے کے زیورات لوٹ لیے اور ٹیکس کا مطالبہ کیا۔

لوگوں نے شیو دیو سے اس ظالم شہزادے سے نجات دلانے کی دعا کی۔ اُن کی درخواست قبول کرتے ہوئے شیو دیو نے ایک کرامت عطا کی اور گنڑیش دیو نے سفاک شہزادہ سندر کو تین دنوں میں قتل کر دیا۔

گنڑیش ہاتھی کے سر اور چار ہاتھوں والے موٹے آدمی کی شکل میں ہے۔ وہ چوہے پر بیٹھتا ہے۔ وہ اِسی درگا پری کا بیٹا ہے۔ جو شیو دیو کی بیوی ہے۔ شیوا اور ستی کے اِس بیٹے کو معاشرتی

معاملات پر طاقت حاصل ہے۔کسی بینک کار کے پاس چلے جائیں، آپ کو دروازے پر گنڑیش کی تصویر بنی نظر آئے گی ۔ آپ کسی بنیے کے پاس چلے جائیں تو اس کی دوکان کی دیوار پر نمایاں جگہ پر گنڑیش کی تصویر موجود ملے گی۔تمام کاروباری آدمی، اس تصویر کو حفاظت کے نشان کے طور پر رکھتے ہیں۔خط اس کے نام سے شروع کیے جاتے ہیں۔حسابات کی کتابوں کے سرورق زعفران کے ساتھ اس کی شبیہہ سے آراستہ کے جاتے ہیں۔

شہزادہ سندر کے قتل ہوجانے پر اُس کا بھائی ہنگول غضب ناک ہوگیا اور اس نے اپنے بھائی کا انتقام لینے کی قسم کھالی۔ وہ نفس کشی، چلہ یا اسی طرح کی روپوشی میں چلا گیا۔(جس طرح ہزاروں سال بعد ہمارا بالاچ گورگیژ، سخی سرور کے دربار میں چلا گیا۔دلچسپ ہے کہ بالاچ بھی اپنے بھائیوں کا انتقام لینے کے لیے شکتی یا مافوق الفطرت طاقتیں لینے زُہد اور خدمت گاری میں رہا۔اُسے بھی سخی سرور نے ایک مافوق الفطرت طاقت بخشی.....تیز دوڑنے کی طاقت۔دشمن اُس کا تعاقب کر ہی نہیں سکتا تھا)۔ہنگول کو بھی برسوں کی زُہد کے بعد ہی بالاچ کی طرح کرامت ملی۔ یہ کہ تین دنیاؤں میں کوئی بھی جاندار اُسے آہنی ہتھیار سے نہیں مار سکتا، اور اُس کی موت صرف ایسی جگہ پر ہوگی جہاں سورج کی شعاع داخل نہ ہوسکے۔

لہٰذا کلا اور کرامتوں سے لدے پھندے اِس ہنگول بادشاہ نے آس پاس کے دوسرے بادشاہوں کو شکست دی، دہشت اور ظلم سے اپنی حکمرانی وسیع کردی۔اس نے خود کو ہنگول دیو کہلانا شروع کردیا۔لوگ اس کی حکمرانی میں ظلم اور بربریت سے تھک گئے، بیزار ہوئے۔انہوں نے پری کے حضور ہنگول بادشاہ سے نجات کے لیے عبادتیں سجائیں۔ بالآخر پری ظاہر ہوئی اور ہنگول کو قتل کردینے کا وعدہ کیا۔ہنگول فرار ہوکر بلوچستان کے اِس علاقے آیا اور ایک اندھیرے غار میں چلا گیا مگر تعاقب کرتی پری لوہے کے ہتھیار کے بجائے اپنے لکڑی کے ہتھیار ''ترشول'' کے ساتھ آئی اور اُسے قتل کردیا۔اپنی آخری سانسوں میں ہنگول نے پری سے درخواست کی کہ مستقبل میں یہ جگہ اُس کے نام پہ ''ہنگول تیرتھ'' کے نام سے پکاری جائے۔ جسے پری (دیوی) نے قبول کرلیا۔

میں اِس زیارت گاہ کے لیے ''واحد'' کا صیغہ یونہی استعمال کررہا ہوں۔بھئی یہاں ایک ٹمپل نہیں، یہاں تو ٹمپلز ہیں۔اس ایک جگہ پر کئی زیارت گاہیں ہیں۔ویسے بھی اوپر ہم نے دیکھا کہ ایشیا کی ساری مائتھالوجی، سارے آزمانک ستی اور شیو سے نکلے ہیں۔کوئی اُن دونوں کا بیٹا ہے، کوئی بھائی۔تقریباً سب کچھ اسی خاندان سے منسوب ہے۔چنانچہ گنڑیش کی پوجا یہاں ہوتی ہے،، ہنومان اور کالی ماتا کی بھی، تیرکُنڈ، گروگورکھ ناتھ، براہم کُنڈ، رام جروخا بیٹھک، انیل کُنڈ.....۔

ہمارے ذہنوں میں مندر کا جو تصور ہندوستانی فلموں نے ڈال دیا ہے، وہ غلط ہے۔ بلوچستان کے یہ مقامات مذہب کی عبادت گاہیں نہیں ہیں۔یہ تو بہادروں، درویشوں کے عشق ومحبّت، جنگ وجدل، اور شوق وشغل کے آسمانی قصوں کی زمینی صورت ہیں۔خواہشات وعزائم کا زمینی آسمانی تصور۔ہنگلاج سے لے کر نورانی تک اور مست توکلی سے لے کر سسی پنوں تک.....ہنگلاج تو بالخصوص ہندوستانی فلموں والا مصنوعی مندر نہیں ہے۔اس لیے کہ نہ یہاں کوئی کمرہ گنبد ہے اور نہ کوئی گھنٹی گھڑیال ہے۔اسے مندر کے بجائے متبرک جگہ کہنا چاہیے ۔ میں آپ کو بتاتا ہوں کہ یہ کیسی مقدس جگہ ہے۔

جغرافیائی طور پر ہم بتاچکے ہیں کہ ہنگلاج ماتا کا یہ تیرتھ استان بلوچستان کے ضلع لسبیلہ کی لیاری تحصیل کے دور دراز اور دشوار گزار کوہستانی علاقے میں ایک تنگ درے میں ہے۔آپ پہاڑی دریا (بارشوں کی عدم موجودگی میں بھی ایک ندی جتنا رواں پانی) کے کنارے چلتے جائیں، اور اچانک سامنے گیٹ لگا ملے گا۔اندر داخل ہوں تو عبادت گاہوں کی ایک قطار ملے گی۔وہاں لگا ہوا بڑا نیلا بورڈ یوں کہتا ہے:

''جئے ماتادی۔ہنگلاج مندر لسبیلہ شیوا میں۔مُکھی شام لال لاسی''۔

(مجھے مکھی شام لال کے ساتھ لفظ لاسی بہت اچھا لگا۔مجھے بگٹی اور ڈومبکی ہندو اچھے لگتے ہیں کہ وہ اپنے نام کے ساتھ اپنا قبیلہ بھی لکھتے ہیں۔میں ہمیشہ سے چاہتا ہوں کہ بلوچ ہندو، بلوچ سید، اور بلوچ آرٹسٹ (لوری، لوڑی، ترکھان، جت، مریثہ) کو اپنے نام کے ساتھ اپنا قبیلہ ضرور لکھنا

چاہیے۔اس شناختی علامت کے ساتھ وہ کوئی مساوات تو نہ پائے گا لیکن رفتہ رفتہ کمیونٹی میں ضم ہونے میں آسانی ہوگی)۔

یہاں آتے ہی سب سے پہلو ہنومان کا مندر ملے گا۔چھوٹا گیٹ ہے، اندر داخل ہوں تو ہنومان کے بت رکھے ہیں مختلف پوز میں۔پوسٹر، جھنڈے، سندور، تیل کا چراغ.....

یہاں سے نکلیں آگے بڑھیں اور ندی کنارے درے میں چلتے جائیں۔چھوٹی چھوٹی پہاڑی غاروں میں مختلف عبادت گاہیں ہیں۔

جھنڈیوں پوسٹروں سے لدی پھندی ایک چھوٹی غار میں ایک عجب منظر ہے۔ایک عورت نما لاش پڑی ہے اُس پہ (دس ہاتھوں والی، ہار پہنی) ایک اور خاتون کھڑی ہے جس نے اپنا ایک پاؤں اُس کی لاش پر رکھا ہوا ہے، بالکل سلطان راہی کی فلموں کے طرز پر۔اُس نے ایک ہاتھ میں ایک مرد کا کاٹا ہوا سر بالوں سے پکڑ رکھا ہے۔باقی نو ہاتھوں میں بھی دوسری کئی باریکیاں ہیں۔اور اس کے ساتھ بورڈ پہ لکھا ہے: ''ماں کالی''۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کالی جو اپنے جنگی کارناموں کی وجہ سے مشہور ہے۔وہ اپنے خاوند شیو دیو کے بالکل شایان شان ہے۔اُسے سانپ کے بالوں اور خوف و دہشت کی ہر خصوصیت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اس نے ایک مرتبہ ایک راکھشس پر فتح حاصل کر لی اور اس فتح سے اتنی خوش ہوئی کہ اس نے انتہائی زور سے ناچنا شروع کر دیا۔جس سے زمین کی بنیادیں تک ہل گئیں۔اور بہت سے لوگ ہلاک ہو گئے۔جب اس نے دیکھا کہ مُردوں میں اس کا شوہر شیو دیو بھی شامل ہے تو وہ بہت دہشت زدہ ہوگئی، اس نے بہت زیادہ لمبائی میں اپنی زبان نکالی اور بت کی طرح بے حس و حرکت رہ گئی۔اسے اسی انداز میں پیش کیا جاتا ہے۔

''مشکی'' رنگت کا ہمارا خارانی دوست ضیا شفیع اور اُس کا کیمرہ بردار موبائل اگر ساتھ نہ ہوتے تو ہم ہنگلاج آزمانک کی بھول بھلیاں نہ یاد رکھ سکتے تھے اور نہ اُن پر یہ رپورتاژ لکھ سکتے تھے۔ دلچسپ آدمی ہے ضیا شفیع۔ ہمہ وقتی بڑھتی ہوئی نامکمل خواہشوں سے بھرا ہوا اُس کا دل اس سے

حساسیت بھری شاعری کرواتا ہے تو خوش طبعی اُس کی ''سوزارنگی'' کو حسین بناتی ہے۔جب چاہے دانش ور بن جاتا ہے اور جب ضرورت ہو خدمت ار۔خدا اُسے اپنی اچھی بلوچیت کے ساتھ چمٹے رہنے کی توفیق دے۔

یہ مقام دیکھنے کے بعد آگے چلتے جائیے، ندی کراس کیجیے اور اب بائیں طرف وہ Shrine آئے گا، جس کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔یہ مقدس مقام ایک چھوٹے قدرتی غار (جُڈو) میں ہے۔اب بدبخت شہریت کی وجہ سے اس قدرتی پہاڑی غار کی شکل بدلنی شروع کر دی گئی۔ظالموں نے سیڑھیاں بنا دی ہیں۔سرخی مائل سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جائیں۔سیڑھیاں آپ کو پہاڑ پر بلندی پہ بنے ایک پلیٹ فارم تک لے جائیں گی۔ظالموں نے ٹائیلوں والا پلیٹ فارم بنا کر اُس مقام کی اصل صورت بدل ڈالنے کی کوشش کی۔وہاں ایک دروازہ کھڑا کر دیا۔گھنٹی (بیل پر بندھی گھنٹی (شب) سے دگنی تگنی بڑی گھنٹی) لٹکانے کی تو خیر ہے۔حکومت بلوچستان کو چاہیے کہ وہ اس پورے اہم تاریخی اساطیری سلسلے کو اپنی تحویل اور حفاظت میں لے لے۔اور اس میں کسی طرح کی مصنوعی تبدیلی نہ کرنے دے۔یہ ہمارے آباؤاجداد کے زرخیز ذہنوں کی تخلیقی داستانیں ہیں، ہمیں فطرت کی طرف سے عطا کردہ نعمتوں کو آلودہ ہونے سے بچانا ہوگا۔سیاسی پارٹیوں، دانش وروں، آثارِ قدیمہ اور آرٹ کے شائقین اس بڑے اثاثہ کو اپنی اصل صورت میں برقرار و برجاہ رکھنے میں اپنا رول ادا کریں۔آپ اُس پلیٹ فارم پر بیٹھیں تو آپ کو اپنے ساتھ ہی پہلو میں، چار پانچ گز کا ایک غار نظر آئے گا۔یہی ہے، Shrine۔

وہاں بڑا فقیر نارنجی رنگ کی پگڑی پہنے بیٹھا ہے۔قمیص شلوار میں۔یہ سندھی بولنے والا ہے۔اصل فقیر چھٹی گیا ہوا ہے اور یہ اُس کا replacement ہے۔

وہیں اُس کے پیچھے بائیں طرف بالٹیاں رکھی ہوئی تھیں، کچھ ڈبے اور راشن پانی رکھا ہے۔ اُسی غار یا جڈو کے فرش پر پہاڑ ہی سے پاروتی پری کا سر بنا ہوا لیٹا ہے۔میں یہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ یہ انسان کا بنایا ہوا پاروتی کا بت نہیں ہے۔بلکہ یہ اُس پہاڑی غار کے فرش پہ ایک ابھرتی ہوئی قدرتی

صورت ہے۔ جیسے ایک خاتون سوئی ہوئی ہو۔ اُس کا سر، ناک کا ابھار اور ناک کے دونوں اطراف چھوٹے گڑھے آنکھوں کی صورت ہیں۔ پتھر سے بنا، لیٹا ہوا، قدرتی انسان۔ اُس کے چہرے پر ایک باریک سرخ کپڑا چُست انداز میں بچھایا ہوا ہے۔ جہاں سے ناک کا ابھار صاف نظر آتا ہے۔

اس مورتی والے پتھر اور آس پاس پہاڑ کو سندور سے سرخ کر دیا گیا ہے۔ اگربتیوں کے گچھّے ہیں۔ عجیب الخلقت جانوروں کی تصاویر کے پوسٹر لگے تھے، جن پہ ہار پہنا رکھے تھے۔ روایتی ترشول وہاں فکس تھا۔ آس پاس جھنڈے بینرز تھے، پینافلکس تھے۔ سب زیادہ تر تاریخی رنگ کے۔ یوں اس مقام کا قدرتی حسن فوت ہو چکا ہے۔ اور دیوی دیوتاؤں کے ہیبت ناک واقعات سامنے موجود ہوتے ہیں۔

اسی پلیٹ فارم یعنی مجسمے کے نیچے نیم دائرے میں کھدی ایک اندھیری سرنگ ہے۔ جس میں لوگ رینگتے رینگتے گھٹنوں کے بل نیم دائرہ کے ایک طرف سے جا کر دوسری طرف سے نکلتے ہیں۔ اسے ''گربھ گپھا'' کہتے ہیں۔ زرد پٹکا پہنے گائیڈ نے اُسے ''ماتا کا گربھ'' کہا تھا، یعنی ماں کا پیٹ۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ اس تنگ و تاریک دس بارہ گز کے نیم دائرہ نما غار میں سے ہو آئیں تو سمجھیں آپ کے سارے سابقہ گناہ ختم ہو گئے ہیں۔ اور آپ ایسے پاک صاف ہو جاتے ہیں جیسے ماں کے پیٹ سے ابھی ابھی پیدا ہوئے ہوں۔

اس مرادمند سرنگ میں خواہشیں رکھنے والے لوگ گھٹنوں اور پیٹ کے بل رینگتے باہر آتے ہیں.....۔

یہ الگ بات ہے کہ سرنگ بازی کرتے وقت میری عینک وہیں گپھا میں گر گئی۔ کم زور عقیدے کا مالک، میں بہت خوش تھا کہ گپھا میں میری عینک گم نہیں ہوگئی بلکہ اُسے تو ستی پری نے رکھ لیا۔ اب بس میری نظر خود بخود ٹھیک ہو جائے گی اور عینکوں کی ضرورت نہ رہے گی۔ مگر ایسی کوئی کرامت میرے ساتھ ہوئی نہیں۔ مجھے تو الٹا جنید خان کی عینک ادھار لینا پڑی گوادر تک۔ مگر وہاں بھی دکانوں میں نئی عینک نہ ملی، لہٰذا وہاں سے کوئٹہ تک میں 'اُدھار آنکھوں' سے دیکھتا رہا۔

میں نے دل میں طے کر لیا کہ میں سائنس کی دنیا کا فرد ہو کر بھی اِس علاقے اور اِن اساطیری مقامات کی عزت کرتا رہوں گا۔ بھئی یہ ہمارے ادب، ہماری ثقافت کا حصہ ہیں۔ میں اسے ''آؤٹ ڈیٹ'' کہہ کر اپنے آباؤاجداد کو مسترد نہیں کر سکتا۔ انہوں نے عالم گیر صداقتوں کو پہلی بار بطور علم کے پہنچانے کے واسطے مائتھالوجی بنائی اور پانچ چھ ہزار سال قبل ہمیں بتایا کہ ''خیر'' کے واسطے جدوجہد کرنے والوں کو عوام کی طرف سے پانچ ہزار سال بعد بھی یاد رکھا جاتا رہے گا۔ آباؤاجداد نے اپنے زمانے کے اہداف، خوفوں، آرزوؤں کو مجسّم شکل دینے کے لیے جو کہانیاں بنائیں، ہمارے عوام اب تک انہیں یاد رکھتے ہیں۔

پاروتی پری کے بت کے ساتھ بیٹھے پنڈت کے ساتھ ہی ایک بڑا سا چوکور ڈبہ رکھا ہے۔ اس پر نیچے ہندی میں کچھ لکھا ہے۔ اور اُس سے اوپر کی لائن پہ اردو میں یوں لکھا ہے: ''پیسے پیٹی میں ڈالیں''۔ واضح رہے کہ اُس وقت تک ہم نے عامر خان کی مشہور فلم ''پی کے'' نہیں دیکھی تھی۔ (عامر خان نے ہنگول بھی تو نہیں دیکھا!)۔

میں نے 500 روپے کا نوٹ اُس کے ڈبے میں کسی پیارے کا نام لے کر ڈال دیا۔ دربار کے ملنگ نے جواباً مجھے ایک ناریل دے دیا۔ یہاں زائرین بالخصوص، دیالُو اور سخی (کم زور عقیدے والے) زائرین کو ایک ''الوداعی'' ناریل دیا جاتا ہے۔ یہ ناریل، میں اُسی پیارے وجود کے لیے لے گیا، جس کے لیے منت مانگی تھی اور جس کے لیے خود کو سرنگ آلود کیا تھا۔

یہاں سیمنٹ کی خوب صورت پگڈنڈیاں ہیں، پُل ہیں، ریلنگ ہیں۔ سبزہ ہے، جن میں گز کی قدرتی جھاڑیاں بھی ہیں اور انسانی لگائے گئے درخت و پودے بھی۔ البتہ برگد کا درخت مجھے یہاں کہیں بھی نظر نہ آیا۔ اس بڑے اساطیری مقام کے ساتھ بہتے نالے کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔

نانی مندر کی غار کے عین سامنے نیچے ندی کے کنارے ذرا سی جگہ کو جو بہ مشکل ایک بڑے کمرے کے برابر ہوگی، پارک جیسا بنا دیا گیا۔ پتلے آہنی ڈنڈے وہاں لگے تھے جن کے سروں پر بجلی کے خوب صورت بلب اور جھنڈے تھے اور اُن کی بنیادوں پر پودے اور پھولوں والے بیل بوٹے لپٹے

تھے۔اس پارک نما جگہ پر ترشول گاڑے ہوئے ہیں (ترشول شیو کا ہتھیار ہوا کرتا تھا)۔اس پارک نما جگہ پر سفید بیل کا خوب صورت مجسّمہ ہے، جس پر سرخ کپڑا کوہان سے آگے گردن پہ اور کوہان کے پیچھے پیٹھ پر آرائشی انداز میں لپٹا ہوا ہے۔

وہیں پر سیمنٹ سے بنا شیولنگ زمین میں پیوست تھا، جسے ناگ جیسا ڈھانچہ گویا سایہ کیے ہوئے تھا۔سجادہ نشین نے اس کی تشریح اِس طرح گھما پھرا کر کی جس طرح کہ پادری ''اگر مگر، چوں کہ چنانچہ'' کرتا رہتا ہے۔آپ جب بھی ہزاروں برس پرانی بات کا تذکرہ کرتے ہوئے اُسے آج کے اخلاقی معیار کے ساتھ ہم آہنگ کرنا چاہیں گے، تو آپ پھنس جائیں گے۔اگر آپ مائتھالوجی کو سائنسی پیمانہ دینے کی کوشش کریں گے تو آپ اپنی دانش کی بڑھوتری روک دیں گے۔چنانچہ پنڈت پھنس چکا تھا۔اُس نے سیدھے سادے شِو، لِنگ کے ساتھ فلسفہ جوڑ دیا اور ہمیں سمجھاتے سمجھاتے وہ اور فلسفہ دونوں، ہلکان ہو چکے تھے۔ہم نے اپنے سابقہ علم ہی کو غنیمت جانا جس میں شیولنگ بس شیولنگ ہوتا ہے۔بھئی مائتھالوجی آپ کی میری فیوڈل اخلاقیات نہیں مانتی۔پانچ ہزار سال پہلے اخلاقی طور پر جو کچھ جائز ناجائز تھا، وہ آج پتہ نہیں کہاں تک applicable ہے۔

یہ بلوچ میتھالوجیکل سائٹ پورے ہندوستان میں مقدس ہے، بالخصوص کلدیوی، کھشتر یہ اور دیگر گروہوں میں۔یوں یہ ہندوستان، پاکستان اور دنیا کے دیگر لوگوں اور بلوچستان کے بلوچوں (بالخصوص ہندو) بلوچوں کی ایک مشترک زیارت گاہ ہے۔یہاں اپریل میں چار روزہ زبردست میلہ ہوتا ہے۔انڈیا، نیپال اور دنیا بھر سے زائرین آتے ہیں۔بلوچ اس میلے میں جوش وخروش سے شامل ہوتے ہیں۔وہ غیر ملکی زائرین کا خیال رکھتے ہیں۔

ہندوستان کا بادشاہ سمراٹھ وکرم جیت سارا ہندوستان فتح کرنے کے بعد یہاں شکر گزاری کے لیے حاضر ہوا تھا۔مغل بادشاہت کا راجہ ٹوڈرمل بھی یہاں زیارت کے لیے آیا تھا۔شاہ لطیف سے لے کر ہندوستان کے طاقت ور وزیر خارجہ جسونت سنگھ (جنوری 2006ء) تک صدیوں سے لوگ زیارت کرنے یہاں آتے ہیں۔

جسونت سنگھ کیا چیز ہے بھئی، یہاں عبادت کے لیے تو خود رام بھی آیا تھا۔رام کو جانتے ہو ناں؟۔وہ مشہور داستان، رامائن کا ہیرو ہے۔رام کا مطلب ''خوشی'' یا ''خوش کرنے والا'' ہے۔اُس کا شمار بھی زندہ لوگوں میں ہوتا ہے۔اس دیوتا کے نام کو پوشیدہ طور پر لازوال طاقت کے متعلّق تصور سے وابستہ کیا گیا ہے۔اسی سے رام رام، ''خوشی'' یا ''تم خوش رہو'' اخذ کیا گیا ہے۔اس نے ہنومان (بندر دیوتا) کے ہم راہ بہت سی مہمات کیں۔

''ہنو'' سنسکرت کا لفظ ہے، جس کا مطلب ''رخسار کی ہڈی'' ہے۔آپ جانتے ہوں گے کہ سورج کے مدار سے گزرنے کے بعد، بندر کے رخسار کی ہڈی ٹوٹ گئی، اسی وجہ سے اسے ہنومان یا بندر دیوتا کہا جانے لگا۔وہ غیر فانی ہے اور انسانوں کو لمبی زندگی عطا کرتا ہے۔جنم دنوں پر اس کی پوجا کی جاتی ہے۔

مارکس نے ہندوستان میں انسانیت کی اس بے عزتی کا زبردست نوٹس لیا۔جہاں انسان جو کہ پوری فطرت کا مالک ہے، ہنومان بندر، اور سبالا گائے کی عبادت میں اپنے گھٹنوں کے بل گر گیا۔ہم بھی بلوچ مائتھالوجی کو کسی منظّم مذہب کا رخ دینے کے سخت خلاف ہیں۔یہ جگہیں عبادت خانے نہیں ہیں۔یہ تو ہماری تہذیب، ہماری تخلیقی تاریخ اور ادب آرٹ کا ورثہ ہیں۔ہم دیانت داری سے دانش وروں کو خبردار کرتے ہیں کہ وہ بے شک اپنے مستقبل یعنی گوادر کی حفاظت کریں، مگر اُن کا ماضی، اُن کا کلاسیک اور اُن کی مائتھالوجی کو بھی زبردست خطرات لاحق ہیں۔لوگ ہمارے ہنگلاج کو، ہمارے بلوچستان کو، مذہب بنا چکے ہیں، اور پھر اُسے سیاست میں بی جے پی کے ذریعے استعمال کر کے سیاسی اقتدار حاصل کر چکے ہیں۔یعنی ہمارے ثقافتی فرش کو اکھیڑا اکھیڑ چکے ہیں۔مگر شکر ہے وہ چاند کو گُل نہ کر پائے، اِن سائٹس کو اِن پہاڑوں کو اکھاڑ کر نہ لے جا پائے۔اے نوجوانو! اُن کہانیوں داستانوں کو کبھی فراموش نہ ہونے دو جس پر آج بلوچ سماج کا پورا ڈھانچہ کھڑا ہے۔کسی قوم کی مائتھالوجی چھین لو تو سمجھو اُسے گھٹنوں کے بل جھکا دیا۔

انسان کہانیوں کے ذریعے ابلاغ کرتا ہے۔مائتھالوجی انسان کو شناخت دیتی ہے اور

انہیں تعلّقات میں مربوط کرتی ہے۔ مائتھالوجی (آزمانک) میری، آپ کی موضوعی سچائی ہوتی ہے۔ ظاہر ہے ہر کلچر سچ کو اپنے اپنے انداز میں دیکھتا اور سمجھتا ہے۔ آپ اُن کہانیوں کے ذریعے آزمانکوں کی دنیا میں داخل ہوتے ہیں جو عوام الناس کی ملکیت ہیں۔ اور اُن کہانیوں کے ذریعے آپ ایک سچ تلاش کرتے ہیں۔ یہ ہے مائتھالوجی۔

مائتھالوجی ماضی نہیں ہوتی۔ بلوچ مائتھالوجی میں بے شمار دیو اور پریاں موجود ہیں۔ اِن میں ولن بھی ہیں، فرشتے بھی، شیطان بھی اور بہت خیر والے بھی۔ شرارتی، مزاحیہ۔ بدی اور اچھائی کی طاقتوں سے بھرے ہوئے۔

بہر حال، رام نے جب راونڑ کو قتل کر دیا تو اپنا یہ گناہ بخشوانے اور کفارہ کرنے وہ ہنگلاج آیا تھا۔ بھئی حیران مت ہو جاؤ۔ مجھے پتہ ہے رام اچھا شریف آدمی تھا جب کہ راونڑ بدکار اور بدمعاش تھا۔ رام نے اُسے قتل کر کے بہت نیکی کا کام کیا تھا۔ مگر، اب وہ بلوچستان میں آ کر، ہنگلاج میں بیٹھ کر اُس پہ معافیاں مانگ رہا تھا۔ بات یہ ہے جی کہ راونڑ، براہمنڑ ذات کا تھا!۔ اور براہمنڑ تو ہمارے سیدوں کی طرح اونچی اور پاک ذات ہوتے ہیں۔ انہیں قتل کرنا بہر حال گناہ ہوتا ہے، خواہ مقتول راونڑ جتنا بدکردار کیوں نہ ہو، اور قاتل، رام جیسا پاک اور باغیرت ہی کیوں نہ ہو۔ اس لیے رام نے یہاں آ کر کفارہ ادا کیا۔

رام صرف سیدزادے کے قتل پہ ہی یہاں گڑگڑا کر معافی مانگنے نہیں آیا تھا بلکہ اس لیے بھی وہ یہاں آیا تھا کہ راونڑ، شیو اور ستی کا بہت بڑا ماننے والا تھا۔ جس طرح دنیا بھر میں ظالموں، جابروں، قہاروں، بدمعاشوں اور ڈاکوؤں کے پیر مرشد ہوتے ہیں۔ اور وہ وہاں خیراتیں چڑھاوے منتیں کرتے ہیں۔ اسی طرح راونڑ بھی شیو کا پکا مرید تھا۔ چنانچہ رام کے لیے شیو کو منانا ضروری ہو گیا تھا، کہ اُس کا مریدِ خاص قتل کر ڈالا تھا رام جی نے۔

الغرض، بلوچستان اگر ایک طرف شیو اور درگا دیوی کا استھان ہے تو دوسری طرف شری رام اور شاہ لطیف کی عبادت گاہ بھی ہے۔

یہاں، برسبیل تذکرہ ایک بات کہنے کی یہ بھی ہے کہ ہنگول پارک ایسا ٹورازم سپاٹ نہیں جہاں حکومت کو مصنوعی آرائشیں سہولتیں یا عیاشیاں مہیا کر کے لوگوں کو بلانا پڑے۔ یہاں تو آٹو میٹک طور پر لاکھوں زائرین نے آنا ہوتا ہے۔ کسی نے کوئی برا خواب دیکھا، اُسے رفع کرنے کو، کسی کی منت پوری ہو گی اُس کا نذرانہ دینے کو، کسی کی کوئی تمنا اور خواہش ہو وہ آئے گا، مانگے گا..... پوری ایک دنیا ہے جن کی ضرورتیں حکومتیں ریاستیں پورا نہیں کرتیں تو وہ مانگنے مافوق الفطری قوتوں سے بھرے ہوئے پیروں فقیروں کے درباروں کا رخ کرتے ہیں۔

نیز یہاں عام سیاحت کے لیے نوجوان لوگ براعظموں کے سفر کرتے ہیں۔ اسی طرح تاریخ، ادب اور مائتھالوجی کے طالب علم تحقیق اور ریسرچ کرنے یہاں کی مسافرت کرتے ہیں۔ لہٰذا حکومت سے یہ کہوں گا کہ اُسے پرکشش بنائے یا نہ بنائے اُسے تکالیف و پریشانیوں سے مبرا علاقہ بنا دے۔

ویسے ہم نے یہاں اچھی خاصی سہولتیں دیکھی بھی ہیں۔ یہاں سولر پلیٹوں کے ذریعے دن رات بجلی موجود ہے اور ایک دور افتادہ، غیر آباد علاقہ عجیب رنگوں اور مختلف طاقت کے بلبوں سے روشن رہتا ہے۔ ڈیزل جنریٹر اُس کے علاوہ ہیں۔ باتھ روم بنے ہوئے ہیں۔

یہاں گیان اور بھجن ہوتا ہے اور پرشاد تقسیم ہوتی ہے۔ بلوچستان کی خاموش نبض اپنے اندر کس قدر متنوع نبضیں رکھتی ہو گی، کتنے اور ملینیم چاہئیں اندازہ کرنے کو۔ بھجن تو اُس خاموش و دھندلی روحانیت کو چھونے میں اہم کردار ادا کرتا ہو گا جو ازل سے یہاں موجود ہے۔

نانی مندر کو قدیم کتابوں میں ''ماروتر تھا ہنگلاج'' بھی کہتے ہیں۔ یعنی ہنگلاج، صحرا کی زیارت گاہ۔ اسی نام کا ایک بنگالی ناول بھی ہے جس میں مصنّف نے اپنے سفرِ زیارت کی تفصیلات بیان کی ہیں۔ بعد میں اسے فلمی صورت بھی دی گئی۔

اِس قدر مشہور Shrines میں ایک طرح کی گھمبیرتا، ایک طرح کا بھاری پن موجود ہوتا ہے۔ ایک حرمت بھری خاموشی۔ آپ شاؤلین ٹمپل میں ہوں یا نانی کے مندر میں، عقیدہ نہ رکھتے

ہوئے بھی، اِن کا پیروکار نہ ہوتے ہوئے بھی، اُس بھاری پن سے مبتلا ضرور ہوتے ہیں۔ ایک پُرشکوہ عظمت اور حسن آپ کو اپنی آغوش میں لیتا ہے۔

زیارت گاہ کے سامنے والے پہاڑ پر سورج کی طرح کا قدرتی سورج کندہ ہے۔ عقیدہ ہے کہ چوں کہ رام چندر جی سورج ونشی تھا، یہ اُسی کی نشانی ہے۔ جب رام نے توبہ اور کفارہ والی اپنی عبادت مکمّل کی تو اپنے کمان سے تیر مار کر اپنا یہ نشان یہاں بنالیا۔

اور یہ ساری باتیں ہمیں کوئٹہ اور کیچ کے پی ایچ ڈی نہیں بتا رہے تھے بلکہ عام آدمی بتا رہا تھا۔ یہ اُس نے آج کے ٹی وی، سمینار، اور وڈیو گیمز سے نہیں سیکھے تھے بلکہ تحریر کی سہولتوں سے مبرا، زبانی روایتوں سے سنبھالے، دوسرے لوگوں سے سن کر محفوظ کیے تھے۔ عوام اپنی کلچرل میراث کو خود محفوظ رکھے گی۔ یونان کے اپنے سمیت پورا پوسٹ ٹکنالوجی والا یورپ زور لگا کر دکھائے، عوام الناس کے دلوں سے پرومی تھی اَس کو نہ مٹا پائیں گے۔

آخر میں بس یہ، کہ شاہ لطیف بھٹائی ہنگلاج مندر کی زیارت پر آیا تھا۔ میں نے اُس کی شاعری کے اندر اُس کے اِن زیارتی سفروں کے بارے میں اشعار پڑھ رکھے ہیں۔ آئیے ذرا میر گل خان کے ترجمے کے ساتھ شاہ لطیف پڑھتے ہیں:

نانی

دیمپہ نانی شتنت منی دِلدار
کئے اِداں مَنتہ نیں منی ہمراز
بید چَماواں من زِندہ چوں ماناں
آمنی بیل اتنت و ہم دَمساز

....

دستا نا قُوس و حاک و پُھرجانا
دِگہ ڈوُل ئنت جو گِیانی رواج
منی دِل دار و ہم دل آرام ئنت
رحمت ئنت کِرد گارئے جوگ مزاج

....

دیمپہ نانی پچے رَوَئے سادُھو!
تئ منزل، تئ گوئرا اِیرِنت
ہر حقیقّتے آ کہ توُ پوِلئے
مس دِلئے توکا تئ وَتی چیرِنت
یک بَبنت ہر دیں تئ دل و دیدَگ
پٹّ و پولا پدا حَبر تیرِ نت

*****

ہنگلاج

اِشتہ ہنگلاجا بے تمائیں مَلَنگ
دیمپہ نانی ءَ چڑّ و لَڑ بَندَنت
اُشکتگ من کہ زیارتانی سرا
آ، مُراداں وَتی دِلئے گِندَنت

....

شُتَنت ہنگلاجئے نیمگا ، کئے زانت
لوٹِتگ کئے ہما نگوئرَ آوانا

کئے اِنت تِیر جَن مں پردَگئے پُشتا
ٹپّی کئی مان ئنت مں دل و جانا

....

نہ ہوا و ہَوَس، نہ حِرص و تَماہ
ڈُبّ ووَش ئنت وَتی چڑھا، شپ و روچ
مِہری گوں ہنگلاجا اِکدّر اِنت
نَدری گردیئنت زندئے وشّیں روچ

....

تو بلوٹَے اگاں ہِبئے جوگی
بُست بِرہ، مُرشِدئے بِکن دِیدار
پَٹ و دَرگیجی ہنگلاجئے گوئرا
نِشتہ بِیت اوداں ، ہَندے آ بوتار

....

ہنگلاجئے سفر تئی دیما انت
راہئے سِنگ ئنت پہ تئی سفر اَوھام
لوگئے نِندگ دلیل اِنت مَنڈی ئے
قاتِلیں جؤر پَرتؤ اِنت آرام
پُھل دَپے ہیل اِنت، پرتئی دیدار
کایَگا ئنت چہ شگھرِ با پیگَھام

....

دیم پہ ہنگلاجئے زیارتا ، زُوتی
کِلّنت اِے مَہتگاں رؤنت جوگی

85

کَد پدا بِیت نصیب دِیدارِش
تؤ کُجا بئے، کُجا بی ئنت جوگی

....

چَہ ندارگ بِبَند پچّمانا
جُست و جُو آ گوں ، ہچ نہ بِیت حاصِل
آرِزُوگانی لَمبَگاں مں بُسُچ
رنگ و بُو آ گوں ، ہچ نہ بِیت حاصِل
پَٹّ و پولِش مں ہنگلاجا بِروَ
آہ و ھُو آ گوں، ہچ نہ بیت حاصل

....

پَدّھرا بوت شمے مَیَرزوئی
ہنگلاجئے شُمے سفر، بے کار
جَلوگا روچئے چے بِزانت ، ہما
کپتگنت مں تہارِیاں، جَمّار
شُما اوداں نہ دیستھتی جوگی!
نِز درھنز ینت جلوہ نا کین یار

مسرت ہوئی کہ آج شاہ لطیف کے مقدس پیروں کی پیروی میں ہم ناچیز لوگ رینگ رہے تھے..........گوکہ شاہ لطیف کی حالت کے برعکس ہم پیدل بھی نہ تھے، ننگے پیر بھی نہ تھے، اور بے راشن بھی نہ تھے................مگر کمٹ منٹ؟؟!!

اومیتانی بانک

Princess of Hope

اب کے سواریاں بدل چکی تھیں۔سعدیہ بلوچ اپنی گاڑی چھوڑ کر ہمارے ساتھ جیئند خان کی گاڑی میں آ گئیں۔سعدیہ پرانی دوست ہیں۔ملتان کے میرے ساتھی میاں اقبال سے کسی سیمینار وغیرہ میں ملی تھیں۔اُسی حوالے سے مجھ سے فون پر باتیں ہوئی ہوں گی۔ہم یقیناً ملے بھی ہوں گے۔ مگر جب کوئٹہ دوستوں کے ساتھ ملنے میرے لیب آئیں اور آمنے سامنے بیٹھ گئیں، دوستوں کی طرح باتیں کرنے لگیں تو مجھے معلوم ہوگیا کہ میرے دماغ کے کمپیوٹر میں یادداشت والا حصہ کرپٹ سا ہوگیا۔ بجائے اس کے کہ موقع کو سنبھالتا، میں بے صبرے نے پوچھا،'' سعدیہ جی، ہم پہلے مل چکے ہیں ناں؟''۔ اس نے سب کے سامنے کھڑاک سے جواب دیا،'' شاہ محمد، شرم کرو''.....۔اور میں شرم اور تکلّف میں آج تک نہ پوچھ سکا کہ ہم پہلی بار کب ملے تھے۔ ایک عمر میں جا کر آپ دماغ کو کھرچتے بھی زیادہ نہیں ہیں۔چیزوں کو سنجیدہ لینا ترک کر دیتے ہیں۔بس ملے ہوں گے۔..... ہم ہر اُس ذی روح سے ملے ہوں گے جو ظلمتوں سے نفرت کرتا ہو۔

بعد میں سعدیہ کوئٹہ روزگار کے لیے بھی آئیں اور دو چار ماہ ٹھہریں۔لوگوں سے میل جول رکھا، ہم بس اپنے بے برکت، مگر برحق ادبی سیاسی کاموں میں جتے رہے۔کبھی ملاقات ہوئی، کبھی فون

ہوا، یا کسی کے ہاتھ سلام دعا.....

اور آج ہم جادو نگری میں پھر آن ملے تھے، بلوچ نگر میں، افسانوں کی سرزمین میں، آزمانکوں کے دیس میں، مائتھالوجی کے گڑھ میں.....

مگر اب سعدیہ کی بولتی زبان بھی خود کو لگام دے چکی تھی۔ایسے خوش گوار حیرت کدہ دیکھ چکنے کے بعد جس طرح کی خاموشی بنتی ہے، وہی خاموشی ہماری تھی۔ایک طرح کا تاسف، ایک احساسِ زیاں کہ ہم کیوں پورا بلوچستان دیکھ نہ پائے۔کیوں زیادہ گھومے نہیں۔ایسی بابرکت جگہیں پہلے کیوں نہ دیکھ پائے، مگر اچھا ہوا ہم پہلے یہاں نہ آئے۔ ہمارا سر، جو آج اِس عمر میں بھی مغز سے خالی ہے، تو نوجوانی میں ہم بھلا ہنگول مائتھالوجیکل سائٹ کی قدر و قیمت کیا جان پاتے۔

اچھا کیا خدا نے مجھے بادشاہ اور حاکم نہیں بنایا۔وگرنہ میں بلوچستان کے بہت سارے پیسے'' ضائع'' کرتا۔میں یقیناً انٹرنیشنل لیول کا ایک بہت بڑا میوزیم بناتا جہاں ہنگول سے متعلّق اپنے آباؤ اجداد کی بنائی ہوئی اس ساری افسانوی داستانوں کے مجموعے کو مجسّم کرتا۔ملینیوں ڈالر اس پہ خرچ کرتا۔میں نصاب میں ساری بلوچ مائتھالوجی شامل کرتا۔بین الاقوامی ریسرچ والوں کو بلواتا۔ ٹورازم کو ترقی دیتا.....اور، اور اور.....(ہے کوئی جواں مرد جو مجھ شیخ چلی کی ان خواہشات کی پیاس بجھائے؟!)۔

سعیدہ سگریٹ پیتی ہے۔اس کے کش لینے کی رفتار اور طوالت سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس قدر گہری سوچ میں ہے۔مجھے یقین ہے کہ وہ ہماری طرح غیر رومانی سوچوں میں بالکل محو نہ تھی۔ وہ یقیناً دیویوں اور دیوتاؤں کو وصل کی حالت میں دیکھ رہی تھی۔حیرانی ہوتی ہے کہ پیاسی ارواح اور رومانس سے سرشار خطے میں آنکھیں تو ہم بقیہ سواریوں نے کھولیں، مگر ہم سے ہزار گنا وکل اور بولڈ و بہادر سعدیہ ہے۔

کار موٹر میں ہم سب زائرین، خاموشی میں حصہ دار تھے۔ہم ہنگول میں غرق تھے۔بہت وقت چپ رہنے کے بعد کہیں جا کر ہم بولنے لگے۔کار میں جب سعدیہ موجود ہو تو باقی تین سواریاں

کیا بول پائیں گی۔ وہ کراچی کے صنعتی سماج کی بے تکلّفی کی روح تھی اور ہم ابھی غاروں کے سماج کے حجاب کے متعدی مرض میں مبتلا فرسودگی میں گردن گردن ڈوبے ہوئے۔ شاعر، دانش ور اور نئے نئے خیالات بھری وہ لڑکی باتیں کر رہی تھی۔ ہم بھیڑ چال لوگ، سعدیہ سے حجاب کے تاثر میں اپنے قبائلی ہم سفروں سے حجاب کے ہاتھوں خاموش تھے۔ ہم سب جنگ زدہ بلوچوں کو احساس تھا کہ ایک اور دُرگوش مہیری کو شتر بچوں کے قتلِ عام کا سبب نہیں بننا چاہیے۔ ہم خاران اور نوشکی میں سے کسی کو بھی رامین لاشاری بننے نہیں دینا چاہتے تھے۔

وہ بولتی جاتی ہے، بولتی جاتی ہے۔ اور جب موضوع ختم ہوتے ہیں تو ہم مشاعرہ سجا لیتے ہیں۔ اس کارموٹر میں دو شاعر ہیں، سعدیہ اور ضیا۔ مجھے تو شاعروں سے یاری کی بدولت کچھ واہ واہ کرنا آتا ہے لیکن عزیزم جیئند خان تو ایسا بھی نہیں کرتا۔ وہ کارموٹر چلاتا جاتا ہے اور جب تک شاعر اُس کا نام لے کر اُسے شعر نہ سنائے، وہ کچھ بولے بغیر بس سنتا جاتا ہے۔ چنانچہ میں ہی ''ہاں ہاں، ہوں ہوں، دوبارہ پڑھو''، کہتے رہنے کے تکلّف میں ڈال دیا گیا ہوں۔ محبّت اور مروت میں بہت فرق ہوتا ہے ناں! ۔ مشرقی بلوچستان میں واہ واہ کہنا شاعر کی توہین میں شمار ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ کھانسنے سے بھی شاعر برا مناتا ہے۔ یہاں الٹا حساب ہے۔ آپ کو شاعر سے بھی زیادہ بولنا پڑتا ہے: ''واہ واہ، بہت خوب، کیا کہنے مکرر............''۔

سعدیہ ہی سنا رہی تھی۔ ہمہ زاویہ، ہمہ پہلو............ ایک سٹائل ایک اسلوب، اور ایک سلیقہ والی شاعری جو جدید سے بھی جدید تھی۔ وہ اپنے موبائل سے ہمیں شاعری پڑھ کر سنا رہی تھی، ہم مہذب سے بھی مہذب سامعین بنے اُسے سنے جا رہے تھے۔ چھوٹی مگر بھرپور اور پُر معنی نظمیں۔ استعارات، تشبیہات، ادائیگی کا انداز .... انوکھی نرالی نظمیں۔ خود کلامی میں جگ ترجمانی۔ اشاروں کنایوں سے لے کر بھرپور قیسی عریانیت تک۔ پرت در پرت معانی، شدت بھرا، ایک ایک لفظ جاندار، ایک ایک لفظ پُرسوز و پُر درد۔ مکھّن نظمیں جو ''واہ واہ'' کی آواز میں پگھل جائیں۔

ضیا شفیع کی شاعری نما چیز بلوچی میں تھی مگر یہاں ایک سواری یعنی سعدیہ بلوچی نہیں

جانتی۔ لہٰذا اُس ایک سواری کی خاطر ہم تین لوگ اپنی مادری قومی زبان نہیں بولے............ بلوچ کی رواداری نے بلوچی کو کتنا نقصان پہنچایا!!۔

ہنگول دریا سے کوسٹل ہائی وے پر آگے بڑھیں تو آپ کُنڈ ملیر ساحل پہ آئیں گے۔ اسے ''اگور'' بھی کہتے ہیں۔ وہاں سے درہ بُزی آئے گا۔

ہمیں اندازہ تھا کہ اب ہمیں ایک اور منظر دیکھنے کو ملے گا۔ نعمت کدہ ہے میرا وطن۔ جہاں مٹی جیسی ''بے کار'' چیز نے وہ کارآمدی دکھائی کہ صرف اُسے دور سے دیکھنے کے لیے سالانہ اتنے پیسے ملنے تھے جس سے پورے بلوچستان کا بجٹ چلایا جا سکتا ہے۔

اور ایک موڑ مڑتے ہی ہمارے اوسان سلامت نہ رہے۔............ یہاں سکوت میں ڈوبا بلوچستان ایک اور منظر نامہ دکھانے لگا، بالکل ہی اجنبی، نا آشنا منظر نامہ۔ یہاں ہزاروں سالوں کی بارشوں اور ہوا کی تعمیر کردہ عظیم الجثّہ عمارتیں ہیں، مجسمے ہیں، قلعے ہیں۔ بالکل حیرت ہو رہی تھی کہ ہم آئے کہاں پہ ہیں۔ لگتا تھا وطن آج اپنے بیٹوں پہ ہمیشہ سے زیادہ مہربان ہو چلا ہے۔ یہاں آپ کے اندر جمالیات کے مختلف قبائل، جنگ شروع کرتے ہیں۔ یوں تو آنکھ والا قبیلہ جیت جاتا ہے، مگر کان اور ناک کی حسیات کبھی ہار نہیں مانتیں۔ بالآخر ایک دوسرے کی تکمیل کرتے رہنے پر صلح ہو جاتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ ہم نے چند برس قبل ہالی وڈ کی حسین اور کمال فن رکھنے والی ایکٹریس انجلینا جولی کی تصویر سے اپنے ماہنامہ ''سنگت'' کا ٹائٹل منور کیا تھا۔ انسان دوست، امن و خیر کی سفیر انجلینا جولی۔ بے حد حسین، باصلاحیت اور ہالی وڈ کی سب سے زیادہ معاوضہ لینے والی اداکارہ انجلینا جولی۔ اُسے جائز طور طور پر ''دنیا کی حسین ترین عورت'' قرار دیا گیا۔ میں نے یہ بھی پڑھا ہے کہ وہ ''چپّپٹر'' ہے۔ چَپ ہاتھ سے کام کرتی ہے۔ اُس کا دایاں ہاتھ، ایسا جیسا ہمارا بایاں ہاتھ۔

ہماری یہ ممدوحہ انجلینا معروف اداکارہ اور دنیا کی حسین ترین خاتون ہونے کے ساتھ ساتھ انسانی بھلائی اور خیر کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ وہ سیلاب و زلزلہ جیسی آفات میں گھرے ضرورت مندوں پہ خود کو وقف کیے رکھتی ہے۔ وہ سیرالیون اور تنزانیہ گئی، کمبوڈیا اور سوڈان

کے جنگ زدہ علاقے گئی، ڈارفر، اور خانہ جنگی والے چاڈ پہنچی، جنگ میں جھونکے ہوئے عراق، آتش ولہو میں ڈوبے لیبیا میں جا موجود ہوئی.....وہ خود روتے ہوئے اپنی خدا ترس فطرت میں تیس ممالک میں آفت زدگان کے آنسو پونچھتی رہی۔ وہ بے شمار فلاحی اداروں کو چندہ دیتی ہے۔ وہ ایشیا اور افریقہ سے بے شمار غریب و بے وارث و بیمار بچوں کو لے پالک بنا کر امریکہ لے گئی، اور وہاں انہیں ماں بن کر پال رہی ہے۔

یہ دلچسپ خاتون جب سیلاب متاثرین کی امداد کے لیے پاکستان آئی تھی تو یہاں یوسف رضا گیلانی وزیراعظم تھا۔ اُس نے انجلینا کو ظہرانہ دیا۔ انجلینا نے بعد میں کہا کہ کھانے کی میز پر اس قدر شان دار اور وافر کھانا دیکھ کر وہ نہایت آزردہ رہی۔ آٹے کی ایک تھیلی اور پانی کی ایک بوتل کے پیچھے دوڑتے ہوئے سیکڑوں سیلاب متاثرین کے لیے یہی کھانا کافی تھا۔ وزیراعظم ہاؤس کے شاہانہ اخراجات، نجی چارٹرڈ طیاروں میں سفر اور دیگر ایسی تعیّشات آپ کو بے چین تو کرتی ہی ہیں جب کہ آپ کے سامنے ایک المیہ موجود ہو۔ چنانچہ انجلینا نے اقوام متحدہ میں اپنی رپورٹ میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ اقوام متحدہ پاکستان کو مجبور کرے کہ کسی قسم کی عالمی امداد طلب کرنے سے قبل حکومت اور اس کے اعلیٰ حکام اپنی تعیّشات اور شاہ خرچیوں میں کمی کریں۔..... ہے نا بڑی عورت!!۔

اُسی زمانے میں ہم نے اپنے رسالے میں اِسی ہنگول علاقے کے قدرتی سیکڑوں میٹر بڑے نسوانی مجسمے کو ٹائٹل بنایا تھا۔ ارے ہمارے دائیں جانب افق کے پس منظر میں وہی حیرت کدہ تھی۔ بلوچستان کی براعظمی وسعتوں میں تنہا کھڑی ایک طویل قامت نازک دبلی پتلی، مہین چٹان ہے جو ایک باوقار خاتون سے مشابہت رکھتی ہے۔ ہم بلوچستان کو بخشی ہوئی فطرت کے سب سے حسین منظر کا نظارہ کر رہے تھے۔

اقوام متحدہ کی ''خیر خواہی'' کی سفیر، محترمہ انجلینا جولی 2002ء میں اس علاقے سے گزری تھی۔ دراز قد، بلند بخت، پرہ چہرہ، اور حسین بدن والی اس پری کے حسین دماغ نے عورت کے اس بہت بڑے مجسمے کو دیکھا تو ہم تصور کر سکتے ہیں کہ حیرت سے اس کی موٹی اور متحیّر آنکھوں کو کتنی خوب

صورتی عطا ہوئی ہوگی۔ استعجاب سے اس نے دراز و بہشتی انگلی اپنے صدف صورت دانتوں میں دبائے بلوچ ارض مقدس کی تقدیس میں اپنی نرم دلی ڈال دی ہوگی.....اس نے اُس قدرتی طور پر بنے ہوئے مجسمے کا نام دُہرایا اور لعل و گوہر جیسے یہ الفاظ بولے: Princess of Good Hope۔ کتنا معتبر و محبوب نام ہے یہ!!۔

مجھے فیس بک پہ امجد نامی ایک صاحب نے اس کی ایک وضاحت کر دی۔ اس کا کہنا ہے کہ ''پرنسس آف ہوپ'' دراصل بلوچی نام ''ایتانی بانک'' کا ترجمہ ہے۔ صدیوں سے اس علاقے میں اس مجسمے کو ''ایتانی بانک'' کہا جاتا ہے، کہ بے اولاد عورتوں کی امیدیں اس مجسمے کے سائے میں بر آئیں۔ اُس کے خیال میں انجلینا جولی نے بلوچوں کی ''ایتانی بانک'' کا ترجمہ کر کے اسے ''پرنسس آف ہوپ'' کہا۔ یعنی یہ صرف امید کی شہزادی نہیں، یہ خیر کی امید کی شہزادی ہے۔ ''اچھی امید کی رانی .....ھیرہ اومیثہ بانک''۔ الفاظ اتنے بھی بے توقیر نہیں ہوتے کہ اُن کے آگے پیچھے کرنے، یا حذف کرنے سے کچھ فرق نہیں پڑتا ہو۔ بھئی ہنگول کی ہماری یہ شہزادی خیر اور نیکی کی امید کی علامت ہے۔ خیر ہو وطن کی، خیر ہو بلوچستان کی، خیر ہو کُل جہان کی!!

انجلینا جولی ہمارا شکریہ کوئی نہ کوئی تو تمہیں پہنچا دے گا ہی۔ نام تو بے نامی، گم نامی کا الٹ ہوتا ہے۔ تم نے ہمیں گم نام رہنے نہ دیا۔ اس عجوبہ قدرت کو اُس وقت نہ صرف انسانی آنکھ نے دیکھا تھا بلکہ ایک اور آلے کی آنکھ نے بھی، جسے انسان، کیمرہ کہتا ہے۔ تب ہمارے کوہستانوں کی یہ رانی، امید کی یہ شہزادی اچانک مشہور ہوئی، پورے لولاک میں۔ ایک نیلا بورڈ لگ گیا۔ جس پر اُس کا نام لکھا تھا: ''امید کی رانی''۔

مجھے پھر اچھا لگا۔ ایک اور مائنھا لوجی۔

وہیں میرا دل خود اپنے ساتھ چھیڑ خانی میں لگ گیا: کہ آج زندہ انسانوں میں ''اچھی امید کی رانی'' کون ہو سکتی ہے؟۔ انجلینا جولی کی عظمت، دانش ورانہ برتری اور اچھے فیصلے کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہوئے میں نے شش و پنج میں ''رتھ فاؤ'' کا نام واپس دل کی جیب میں رکھ دیا۔ نہ ہم

انسانیت کی اس محسن رتھ فاؤ کو نوبل پرائز دلا سکتے ہیں، نہ اس کے نام کا کوئی مجسّمہ کھڑا کر سکتے ہیں۔
کاش ہم کسی ہسپتال کا نام ہی اُس پر رکھ سکتے۔.....''رتھ فاؤ ہاسپٹل''!!

اور آج، ہم تقدس کی قدموں میں تھے۔ میرا وطن ایسا شان دار کہ اپنے مظاہر کے آگے جھکا جھکا کر غیر کے آگے جھکنے کے سارے امکانات ختم کر دیتا ہے، ہاں مگر باضمیروں کو۔ ہم ''پرنسس آف گڈ ہوپ'' کی عظمت میں حیران تھے۔ ہم لولا کی احترام میں ایک دوسرے سے لفظ بھی کہے بغیر، گاڑی سے نیچے اترے۔ سانس تھامے، ساری توجہ اُسی عظیم ساخت کی شہزادی کی طرف۔ اب ہم بہ یک وقت ساٹھ سالہ بچے بھی تھے، اور دھرتی کے کلچر اور سولائزیشن کے ذمے دار ترجمان بھی۔ ہم اسی مٹی کے عاشق بھی تھے، اور محبوب بھی۔ ہم منظر ہم ناظر۔ سامع بھی ناطق بھی، عکس بھی عکاس بھی، حیرت بھی حیران بھی، خمار بھی مخمور بھی۔ ہم اس کے محافظ بھی تھے تباہ کن بھی.....سرزمین تیرے ساتھ کتنا پیچیدہ رشتہ ہے ہمارا۔

اگر یہ منظر امریکہ میں ہوتا تو ''سونے کی تلاش'' اور ''میکانا زگولڈ'' نامی بے شمار ناول لکھے جاتے، کئی فلمیں یہاں بنائی جاتیں۔ کئی امین مالوف کتنے جبل الموت تخلیق کرتے۔ بلوچ! تو نے کتنے مواقع ضائع کر دیے، تیری کتنی صدیاں خالی گزر گئیں!!

ہم نے توقیر کی، ادب احترام کیا، نشے کی اتاہ حالت میں موجود فطرت کو سلام کیا، ہم جتنا قریب جا سکتے تھے گئے، مگر امید کی دیوی کا دامن پھر بھی سو ڈیڑھ سو میٹر دور ہی رہا۔

نہ جانے وہ کب سے اُس بیابان میں بے نام کھڑی تھی۔ ہوا کی تھپیڑیں کھاتی ہوئی، یا پھر اُس کی موسیقی سنتی ہوئی۔ ہوا جو ریت سے آلودہ رہتی ہے۔ جب راہ، شاہراہ نہ تھی تو وہ کس قدر تنہائی محسوس کرتی ہوگی۔ نظر اندازی کا غم بہت اندوہ ناک ہوتا ہے۔ بس ایک عظیم الجثّہ Splinx (ابوالہول) ہی اُس کا پڑوسی تھا مگر وہ بھی اس حال میں کہ خود بھی گِل اور اس کے پا بھی بہ گِل۔ اردگرد تو بس مٹی کے مٹیالے رنگ کی عجیب اور بڑی بڑی بے ترتیب سیکڑوں میٹر طویل ڈھیریاں ہیں۔ سیکڑوں میٹر بلند اشکال۔ یہیں سوگنا بڑا ابوالہول کا مجسّمہ فطرت نے بنایا ہوا ہے۔

سیکڑوں میٹر بڑا یہ Sphinx مٹی کے بہت اونچے پلیٹ فارم پہ بنا ہے۔ اتنا دیوہیکل کہ انسان دنگ رہ جائے۔ ایسا لگتا ہے جیسے سر عورت کا اور بدن شیر کا ہو۔ فطرت کی شاہ کار۔ سب سے بڑا انسان کا بنایا ابوالہول تو مصر میں ہے۔ سالانہ ہزاروں لوگ دنیا بھر سے اِسے دیکھنے آتے ہیں اور اس کے بنانے والوں کی تعریف کرتے ہیں۔ حیرانی ہوتی ہے کہ بلوچستان کے ساحلی علاقے میں ایک قدرتی Sphinx موجود ہے جو مصر والے سے عظیم مشابہت رکھتا ہے۔

صدیاں اور ہزاریاں اسی طرح گزر گئیں تب چین نامی ملک کو بہت بھوک نے ستایا۔ بلوچی زبان میں ''آف ڈھاگ'' ایک ایسی حالت کو کہتے ہیں جب آپ پانی پیتے جاؤ پیتے جاؤ مگر پیاس مٹتی نہیں۔ چین بھی ایک ایسی حالت سے دو چار ہو گیا ہے۔ بحیثیت ملک اُسے ''زر ڈھاگ'' ہو گیا ہے۔ زر کی پیاس، پیسہ جمع کرنے کی لت۔ پیسہ پیسہ!!!۔ اسے سونے چاندی سے دفنا دو، تب اُس دَم گھٹی کیفیت میں بھی وہ ''پیسہ پیسہ'' مانگے گا، آکسیجن نہیں۔

وہ زمانہ گیا، یا پھر جانور میں فرق ہے، جب ہم کہا کرتے تھے کہ ڈائن بھی پڑوس کے سات گھر چھوڑ کے تباہی مچاتی ہے۔ لگتا ہے کہ ڈائن اور ڈریگن میں فرق ہے۔ ڈریگن کے لیے اڑوس پڑوس، حلال حرام، ذبیحہ جھٹکا سب بکواس۔ چنانچہ زر و جواہر کے لیے بھوکے چین نے اپنے بہی خواہوں کی مدد سے اپنے ڈریگن کا منہ ہماری طرف کر کے اُس کا کانٹے دار لگام کھول پھینکا۔ اُس اژدہا کے منہ سے نکلے آگ کے شعلے خالص نہ تھے۔ اب کے وہاں سے ابلتا ہوا ایک سیاہ مائع نما زہر آتش فشاں کی طرح بہنے لگا۔ جس کا ایک سرا کاشغر تھا، اور دوسرا گوادر۔ راستے میں جو چیز بھی آئی، سلامت نہ بچی۔ سب ہم وار۔ اِسے وہ ''شاہراہ'' کہتے ہیں: ہائی وے۔ کاشغر گوادر کا ہمارا حصہ ''کوسٹل ہائی وے'' کہلایا۔

اور یہ لاوا بالکل ''اچھی امید کی شہزادی'' کے مجسمے کے قریب سے گزرا۔ اچھا ہوا شاہزادی محض مجسّمہ ہے۔ اگر یہ ذرا بھی حرکت کرتی ہوتی تو آج وہ بھی چین کے ڈریگن کے بے انت و مہیب پیٹ کے کسی کونے میں ہوتی۔ سرمایہ داری نظام سے بڑا اژدھا کیا ہو سکتا ہے۔ سامراجیت سے بڑا

ڈریگن ابھی تک دنیا نے نہ دیکھا۔

اس شہزادی کے پاس سے گزرتے ہوئے اس جمے ہوئے لاوا کو کوسٹل ہائی وے کہتے ہیں۔ اور اِس کے اوپر کاروں، ٹرکوں، ویگنوں، اور بسوں کی ''گوش وہوش شکن'' ریل پیل ہے۔

آج ہم اکیسویں صدی کی مغربی دنیا کی شہزادی کے متبرک ذہن و دہن سے مشہور کردہ نام والی قدیم سے بھی قدیم اپنی مشرقی شہزادی کے درشن کر رہے تھے۔ اس درشن میں ہم سب اپنے ہوش وہواس کی گم شدگی سے بھی بے خبر کھڑے تھے۔

بلوچستان آفاقی مصور کا ورکشاپ ہے۔ اس کی ہوا آزر، اس کی مٹی پکاسو، اس کا پانی وان گوغ، اور اس کا سورج صادقین۔ ایک وسیع کینوس ہے بلوچستان۔ یہ اپنے بچوں سے بھی [redacted] ہے، اور خود بھی خوب صورت پینٹنگز کرتا ہے..... بس آپ ہنگول ہو آئیں، شرطیہ طور پر آپ بلوچستان کی جمالیاتی حس کی تکریم کرنے لگیں گے۔

ہم حکومت کو ''خدارا، خدارا'' والا غلامی بھرا لفظ نہیں کہیں گے، ہم اُسے اپنی فولادی کُوھلی (مٹکے نما بہت بڑا مٹی کا برتن جس میں اناج ذخیرہ کیا جاتا ہے) سے پیسہ نکالنے کو بھی نہیں کہیں گے۔ ہم اُس کے ورلڈ بینکی سوچ سے عاری پولٹری فارمی چہروں اور نازک دماغوں پہ زور دینے کی بات بھی نہیں کریں گے۔ وہ کچھ نہ کرے۔ بس ''اے سکندرِ اعظم، تم موسمِ سرما کی سردی میں فلاسفر، ڈایوجنیز اور دھوپ کے بیچ کھڑا مت ہو''۔ بس اے حکومت! تم انسانوں اور اِن مناظر کے بیچ رکاوٹ نہ بنو۔

یہ ہم اس لیے کہہ رہے ہیں کہ ہنگلاج کو پیسوں، دماغوں، مددگاروں، ماہروں کی ضرورت نہیں۔ اس لیے کہ ہنگلاج اب محض مقامی عجوبہ نہیں رہا۔ ٹورازم کا یہ وسیع وعریض خطہ اس قدر اہم اور زرآور ہے کہ پاکستان نے اِسے صوبائی نہیں، مرکزی کنٹرول میں دے رکھا ہے۔ اس کی دیکھ بھال کے لیے ورلڈ بنک پیسہ دیتا ہے، بے شمار این جی اوز اِس پہ پل رہے ہیں۔ اس لیے یہ ایک بین الاقوامی درجے کی جگہ ہے۔..... یہ جگہ اس قدر خوب صورت ہے کہ ملین ڈالروں کی سالانہ آمدن ٹورازم سے ہوسکتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ کالج اور یونیورسٹی طلبا کے ہنگول پارک کی بہ نسبت بہت کم خوب صورت اور کم دلچسپ علاقوں کے مطالعاتی دوروں پر حکومتِ بلوچستان ہر سال کروڑوں روپے خرچ کرتی ہے، کوئی اسے یہ سمجھائے کہ ذرا یہ مناظر بھی تو دیکھو، ورطہِ حیرت میں رہتے ہوئے ساری زندگی، زندگی سے محبّت کرتے رہو گے۔

ہمارا مشاہدہ ہے کہ آپ جب بھی مڈل کلاس اور اپر مڈل کلاس کی سڑاند بھری محفلوں میں بیٹھتے ہیں تو آپ کو اُن کی گفتگو میں دبئی، فرانس اور امریکہ کے حرام کے ذرائع سے کیے گئے متعفّن دوروں کی قے آور دوہرائی ملے گی۔ جہازوں، ایرپورٹوں، کافی ہاؤسوں، لفٹوں ٹراموں، اور ٹائیوں کی خریداری کے قصے ملیں گے۔ جب کہ یہاں اپنے وطن میں محض آواز لگانے کے فاصلے پر بین الاقوامی معیار کے عجوبے موجود ہیں۔ بالکل پڑوس میں۔ جہاں فطرت بھرپور شان اور جوانی اور حسن میں جلوہ افروز ہے۔ سینما ہال میں نہیں، لیپ ٹاپ میں نہیں بلکہ پہاڑوں دریاؤں کے بیچ وخم میں۔ یہاں فیس بک اور ٹوئیٹر آپ کو کچھ نہیں دے سکتے، بلکہ الٹا آپ انہیں مالا مال کر سکتے ہیں۔ نہ یہاں ڈوبتے ٹائی ٹانک پہ آئس برگ کی بولیاں لگتی ہیں نہ ٹی وی ریٹنگ کے لیے کھردری بھدی بھاری آوازوں کو گلیمرائز کیا جاسکتا ہے۔ یہاں انفرادی گلیمر چلتا ہی نہیں۔ ضم ہو جائیے فطرت میں، حصہ بن جائیے بلوچستان کا، حسن وشان وتمکنت وبھاری پن آپ کو گود لے گا۔

ہم گود لیے چار بچے نہ تھے، ہم تو ماں جائے بچے ہیں، سمو کی ماں بلوچستان کے۔

ہم نے اُس روز قلم کو نہیں چھوا، ہم کیمرے کی عظیم ترین نعمت سے مزین ومسلح تھے۔ ہم آج سب سے زیادہ مقروض تھے عراق کے سائنس دان ابن الہیثم کے جس نے پہلا کیمرہ ایجاد کیا تھا۔ ہم نے کتنی تصویریں اتروائیں۔ نیلگوں آسمان کی، مٹیالے دیوہیکل قلعوں مجسموں کی، ساتھ ہی موجود شفاف نیلے سمندر کی۔ عجیب زمانہ آ گیا کہ اب اپنے سارے جذبات کا اظہار موبائل فون کے کیمرے سے فوٹو کھچوا کر کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ہیثم صاحب کے بیٹے کی ایجاد اب بہت بہتر بنائی جا چکی ہے۔ ہم اِس زبردست ایجاد کی نعمت (فوٹوگرافس) کو وہیں سے دنیا کے کسی بھی کونے، جی ہاں

کسی بھی کونے کو بھیج سکتے تھے۔ اور وہ بھی پلک جھپکتے میں۔ سرمایہ داری نظام برباد بھی بڑا کرتا ہے، مگر آسائشیں بھی بڑی دیتا ہے۔

ہم ٹکنالوجی کی نعمت پر شکر وصبر کرنا چاہتے تھے کہ ایک بار پھر نظر پُرشکوہ شہزادی پر پڑی۔ وہ ابھی تک دور دیکھ رہی تھی۔ یعنی ابھی انسانی علم نے مزید بے شمار ایجادات کرنا تھی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ شہزادی اُس وقت بھی نیچے نہیں دیکھے گی۔ ارے بلوچو! چلتے ہی جاؤ، کوئی سٹاپ، فل سٹاپ نہیں۔ اچھی امید کی شہزادی کا حکم ہے کہ سائنس اور علم کے حصول کے لیے نگاہیں دور افق پر ٹکائے چلتے جاؤ۔ سچ، سائنس اور اِنسانوں کے لیے سہولتوں کی جستجو اور تقسیم میں کوئی آرام، کوئی سستانا نہیں۔

ہم نے شہزادی کی منشا پڑھ لی، اُس کا فرمان پلو میں باندھا، اور نہ رکنے کے لیے چل پڑے۔

اور ماڑہ اور پسنی کے بیچ

ہم اور ماڑہ گئے۔ جمعہ کا دن اور وقت تھا، اس لیے بازار تقریباً بند تھا۔ وہاں ایک شخص سے شہر کے اِس عجب نام کے بارے میں پوچھا۔ اُس کی معلومات تھیں کہ یہاں سے گزرنے والی سکندر کی فوج کے کمانڈر ''ہرمز'' کا نام بگڑتے بگڑتے اور ماڑہ بن گیا۔

اور ماڑہ کی حالیہ صدیوں کی تاریخ دنیا بھر میں اپنی نوعیت کی انوکھی تاریخ ہے۔ یہ قلات کا حصہ ہوا کرتا تھا۔ پھر نصیر خانِ اعظم نے اُسے جہیز میں اپنی بیٹی (جام غلام شاہ کی بیوی) کو دیا۔ جس نے بعد میں بیلہ کے جام میر خان اول کے ساتھ شادی کی۔ اور ماڑہ پھر قلات کو ملا جب اُسے محراب خان دوم کی بیوی، جام علی دوم کی بیٹی بی بی عائشہ کے جہیز میں دیا گیا۔ پھر اسے اوتھل کے ساتھ ملا کر بیلہ کے جام کو اس وقت دے دیا گیا جب جام میر خان دوم نے خان خدائیداد خان کی بہن بی بی اللہ ڈنی سے شادی کی۔

آج تو یہاں کا سمندر (اور یوں شہر بھی) نیوی کے زیر استعمال ہے۔ ہم بس گئے اور کار موٹر میں ہی شہر اور بازار میں سے گزرے اور واپس مین روڈ پر آئے۔ اِدھر مست توکلی کے بقول ہمارے ''ابّا بچ مری آنی'' نہ تھے، ڈاکٹر فضل خالق ٹرانسفر ہو کر گوادر چلا گیا تھا اور غوث بہار خود ساختہ، خود سوختہ اور معروض کی ماری جلاوطنی کی ٹھوکروں میں۔ اور اپنا کوئی واقف نہ تھا۔

ہم اور ماڑہ سے نکلے اور موبائل سگنل کی آمد کے مواقع پر دوسرے دوستوں سے رابطہ قائم

کر کے بالآخر سڑک کے کنارے ایک ہوٹل میں کھانا کھانے رکے۔ارے ادھر تو اپنوں نے ایک دنیا بسائی ہوئی تھی۔نوشین تھی ناں۔نادر جان کی ملائکہ بیٹی اور اُس سے وابستہ لوگ تھے۔یہ عورت ہو بہو بلوچستان جیسی ہے۔قحط وسیر سالی کی دو انتہاؤں کے بیچ کے سارے سپیکٹرم سے مزین۔مسیحی لوگوں کی طرح love اور beloved اُس کے بے معنی تکیہ کلام ہیں۔جتنے ذاتی وسماجی دکھ ایک بلوچ تعلیم یافتہ خاتون کے لوحِ محفوظ میں لکھے ہوتے ہیں وہ اُن سب کا ذائقہ چکھ چکی ہے۔ابتدائی انسان کی طرح بکھری فطرت کے اندر سیاسی اور سماجی، معبود پاتی اور مسترد کرتی رہی۔پاتی تھی تو ارشمیدسی نعرے لگاتی تھی، مگر جب ''جاننے'' کے بعد مسترد کرتی تھی تو تاسف کا گہرا گھاؤ اس کے دل پر ایک چیر کا نشان بنائے بنا کبھی نہ لگا۔اس کی باطنی دنیا جب اعتماد کرتی ہے تو اپنی صندوق میرے سامنے الٹ دیتی ہے مگر مردم گزیدگی میں مہینوں سالوں تک دبیز دھند اوڑھے رکھتی ہے۔مجھے ''ماما'' کہنے والے میرے میڈیکل کے شاگردوں شاگردنیوں کی بیماری اُسے بھی لگی تھی مگر اب کئی دہائیاں بیت گئیں، وہ اس تکلّف کو ترک کر گئی۔.....(اردو زبان میں ''ماموں بنانا'' ایک محاورہ بھی ہے۔مگر اِس گہما گہمی کے عہد میں آپ کس کس بھانجے اور بھانجی کو روک کر اُس کا منہ سونگھتے پھریں گے کہ اُس کے ''ماما'' کے خطاب میں کہیں ''ماموں بنانے'' کی الکوحل کی آمیزش تو نہیں)۔

نادر قمبرانڑیں اِس قوم کو دو گڑیائیں دے گیا ہے۔افشیں اور نوشیں۔چاہے تو اُن سے فیضؔ ترنم میں سن لو، چاہے تو گل خان کے ترانے۔نوشین نے اپنی شاعری ہمارے رسالے سے شروع کی تھی اور اب تو وہ جائز طور پر بلوچ عورتوں کی ''شاعرِ مشرق'' بن چکی ہے۔مگر اپنی ملنگ طبعی میں نیپ کی فضیلہ عالیانڑیں نہ بنی۔اور ہمارے رسالے میں بھی بار بار یاد دہانیاں اُسے نظم بھیجنے پہ مجبور کرتی ہیں۔بلوچستان کی ثبینہ رفعت!

نوشین جہاں موجود ہوتی ہے ایک مختلف النوع حلقہ اپنے گرد بنا لیتی ہے۔آج اس چھپر والے ہوٹل کے ایک چھوٹے سے چھپر کے کمرہ نما حصے میں درجن بھر لوگ پروانگی کو جامد وموجود تھے۔

ایک ننھّی بلوچ بچی رژنا وہاں تھی۔متحرک ومستعد۔فطین و ناطق۔ذہین وتفتیش کار۔

اعتماد سے بھری، سوالات سے پُر۔مجھے گل خان نصیر کی، بلوچ کے بارے میں دعا یاد آئی۔(یا خداوندا بلوچانہ چوشیں مردم بہ دئے)۔سواد ومنٹ کے اندر اندر اُس بچی نے ہمیں بچہ بناڈالا.....اور مجھے بچہ بننا بہت اچھا لگتا ہے۔

وہاں سے چلے تو آگے ماکولا آیا۔مچھیروں کی بستی اور عین سامنے سمندر۔

ہم پسنی کے لیے مڑ گئے، بائی پاس کے راستے۔پسنی تو گوادر کی طرح بلوچ کی درخشاں تاریخ کا سنہرا باب ہے۔اُسے گوادر کی طرح اس وقت جل کر خاکستر ہونا پڑا تھا، جب اُس کے وطن دوست اور آزادی پسند بچے 1581ء میں پرتگالی سامراجیوں کے خلاف لڑے تھے۔

ہم نے ہر حال میں پسنی جانا تھا۔ہمیں ایک آدھ قرض چکانا تھا، ایک وفا نبھانا تھی، ایک رواج کی برآوری کرنا تھی۔ہمیں اپنے آفت زدہ اور شاعر یار، مبارک قاضی سے ملنا تھا۔کچھ اشکوں کا لین دین کرنا تھا.....

مگر قاضی ملے تو سہی۔اِس دکان میں ہوگا نہیں نہیں اُس اوطاق میں ملے گا، ارے نہیں ابھی ابھی گھر چلا گیا۔ہم نے یہ ''چیز جاہ'' (کھلونوں کی دکان)، چھان ماری، وہ ''سرٹاپ جاہ'' (بار بر شاپ) جھانکا، وہ ''ٹیکی جاہ'' (گفٹ سنٹر) جھاتی ماری۔ہم نے شہر بھر پھر کر جانی، انجانی، شناسی، اور تلاشی متلاشی نگاہیں خود پہ ڈلوائیں۔وفا، رفیق ورقیب دونوں کے نوٹس میں رہتی ہے.....اور اب تو سارا شہر (اور بلوچستان کا ہر شہر) رفیق ورقیب کی ٹاپوں کی آماج گاہ بن چکا ہے۔.....ہم نہ رقیب کی اندوہ کاری سے ہاتھ ملا پائے، نہ رفیق کی کرخت انصافی ڈنڈے ماری سے نباہ کر سکے، اور نہ ہی اپنی، تیسری آواز بہت لوگوں تک پہنچا پائے۔

ہمیں انور صاحب خان بھی مطلوب تھا، مگر یونہی خیر سگالی کے لیے۔آپ پیروں فقیروں کے شہر ملتان جائیں، رکن الدین کی زیارت کریں مگر یوسف مگسی کے والد کی قبر کو سلام نہ کہیں، یہ ممکن ہے کیا؟۔آپ پسنی جائیں، قاضی کے دربار جائیں اور انور صاحب خان نامی مرشد زیارت سے رہ جائے تو خلش کہاں چھوڑے گی۔ادب سے وابستہ یہاں کے سیاہ اور ماہ لنج دونوں ہمیں پیارے۔

(سیاہ ہمل کی گھوڑی کا نام تھا اور ماہ لنج اُس کی محبوبہ تھی)۔اب قاضی اور انور میں سیاہ کون ہے اور ماہ لنج کون؟.....دل بتانے سے قاصر ہے۔

قاضی کو تلاشنے میں ابھی بھنبھوریوں کو مزید ریت پھانکنا تھا۔منزل معلوم ہونا چاہیے، راہ شناسی تو اضافی نعمت ہوتی ہے۔ہمارے ہاں تو غضب یہ ہے کہ منزل کا تعین ہی نہیں کیا ہوتا، راستہ کے انتخاب پر فرقے کاریاں اور بیان بازیاں ہوتی رہتی ہیں۔

انور صاحب خان مل گیا۔''شاباش شابش'' یعنی جلدی کرو جلدی کرو پیٹتے ہوئے وقت نے یہ موقع تو نہ دیا کہ ہم اُس کے ساتھ دو گھڑی بیٹھتے، بہت ادب اور توجہ سے اُس کی زبانی اُس کا کلام سنتے، اُس کی کتابیں اُس سے وصول کرتے۔مگر یہ کیا کم نعمت ہے کہ بلوچستان کا مشرق، اپنے مغرب سے عصر کے وقت گلے ملے؟۔جوانوں نے ہمیں ایک بار پھر احسان مند کر دیا کہ اُس کے ساتھ فوٹو گرافی کا موقع بخشا۔بس ایک لمحہ ملا تھا دید کو۔ایک گرم جوش خیر مقدمی گلے ملائی کے دس منٹ بعد ہی ہم الوداعی گلے ملے، اور قاضی مبارک کی طرف چلے۔

مبارک قاضی پسنی میں بارہ دسمبر 1955ء کو کہدا امان اللہ کے ہاں پیدا ہوا۔پسنی ہی میں دس جماعت تک پڑھا۔1976ء میں وہ کراچی سندھ مسلم کالج میں داخل ہوا۔مگر وہاں تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور واپس پسنی میں دکانداری کرنے لگا۔کراچی سے پرائیویٹ ایف اے کر لیا اور اُردو آرٹس کالج میں بی اے کرنے داخل ہوا۔1983ء میں بی اے کر کے بلوچستان یونیورسٹی سے IR پاس کیا 1986ء میں۔پسنی چلا گیا اور فش ہاربر کا ڈائریکٹر بنا۔

بنیادی طور پر اس نے اپنی شاعری کا آغاز 1976ء میں کیا جو ہنوز جاری ہے۔کیا خوب صورت شاعری کرتا ہے۔سامراج کے خلاف، سردار کے خلاف، فیوڈل و مارشل لا کے خلاف، رجعت و قدامت پرستی کے خلاف، ناانصافی و امتیاز کے خلاف۔

ہون تنگ ایت او پشو مان نہ بیت اے مولا
آدمی ذاتئے سرا چونیں زوالے آتنگ!

ذرا دیکھیے افغانستان کے تناظر میں وہ گوادر کے کوہِ باتیل کو کس طرح سراہتا ہے:

کوئی زلزلہ کسی روز تھا
تہہ و بالا منظرِ کوہ تھا
جو نشان تھا، وہی مٹ گیا
جو گمان تھا، وہ بھی مٹ گیا
یہ کھلونا سا میرا دل کہیں
اس شکست و ریخت میں گم ہوا
میں تلاش بھی نہ کر سکا
خطِ تعزیت میرے دل کہ اب
کوئی آئینہ ہی نہیں بچا
نہ ہی التفاتِ زر و فا
پہ جو دست بدست ہے اسلحہ
یہ مراد تو نہیں خاک کی
نہ اندوختہ کسی آگ کی
ابھی خانہ سوزی روا نہیں
نہ خریدار را کھ دعاؤں کی
کہ میرا خدا!
رکھے بدنظر سے امان میں
یہ گوادر دل آشنا

وہ شاید (بزرگوں میں سے) بلوچی زبان کا اولین شاعر ہے، جو انفارمیشن ٹکنالوجی استعمال کرتا

ہے۔ٹوئٹر پر ایک ایک شعر کر کے ساری غزل بھیجتا ہے۔

اور کون کہتا ہے کہ وہ میدانی فیوڈل [redacted] ہے؟۔ارے وہ تو جوتی کی نوک پر لکھتا ہے جاگیرداری کلچر سے۔ عام گلی کی، عام مکرانی کی زبان استعمال کرتا ہے۔ وہ سنا کر چلا جاتا ہے، دیمک زدہ اذہان سوچتے رہ جاتے ہیں کہ اخلاق زدہ زبان استعمال کرنے میں قاضی نے کہاں کہاں جھول دکھایا۔لگتا ہے شعر شناسی کے دعوے داروں کو شعر کے اوزان وفریم میں عام گلی والی بولی کی شمولیت بہت ناگوار گزرتی ہے۔

گرانڈ ڈرک یعنی کہکشاں نے اچھی جوانی (فش ہاربر میں گریڈ 19 کی افسری) سے بھرپور اِس حافظِ قرآن کو شاعری کی صلاحیت سے نوازا ہوا تھا۔زرنوشت (1990ء)، شاک مس سبزیں ساوڑا، منی عہدئے غمئے قصہ، اور، حانی منی ماتیں وطن، اُس کے مجموعہ ہائے کلام ہیں۔اگلی کتاب کا نام ہے: ''چولاں دریایل داتگ'' (2012ء)۔

یہ بہت دلچسپ ہے کہ قاضی دریا (سمندر) اوڑھتا ہے، بچھاتا ہے، اور سمندر کے ساتھ ہی رہتا ہے۔ وہ اُس کے ساتھ مذاق کرتا ہے، ہنستا ہے، پیتا ہے، اور اُسی کے گلے لگ کر روتا ہے۔ پختہ پکا ناتا، جنم جنم کا ناتا۔

وہ اپنی سنجیدہ، اور منجمد ذہنوں کی پرتیں وا کرنے والی شاعری کی مطابقت میں بولنے اور چلنے کی پاداش میں 1981 میں ایک سال مچ جیل بھگت چکا ہے۔ پھر 2006ء میں اس تسلسل کے ارتکاب میں چھ ماہ تربت جیل میں رہا۔اس پر دو دفعہ جان لیوا حملے ہوئے۔2013ء میں گھر پہ گرینیڈ حملہ ہوا، گھر تباہ، بیوی سخت زخمی۔ چھ ماہ بعد 2014ء میں دوسرا حملہ۔

الزامات؟.....بغاوت!!

کیا لوگ ہیں یہ ہمارے گل خان، عطا شاد اور مبارک قاضی!!

چشیں قاضی یے کہ مبارک انت پدا
مشکل انت کہ ودی بہ بیت

ہم گلیوں بازاروں کے جھروکوں سے سمندر سے آنکھ مٹکائیاں کرتے اپنے جواں مرگ اور بہت ہی پیارے شہید شاگرد کے ''بڈھے بلوچ'' کا دروازہ کھٹکھٹا رہے تھے۔بھئی اپنے سٹوڈنٹس بہت پیارے لگتے ہیں۔

قاضی کے دو ہی بچے تھے۔ ایک میرا محبوب شاگرد قمبر، اور دوسری بیٹی۔ اور یہ قمبر عام سٹوڈنٹ نہ تھا۔اُسے تو باپ نے کالج بھیجا ہی اُس وقت تھا، جب فون کر کے مجھے اس کا ہر طرح سے خیال رکھنے کا حکم جاری کر دیا تھا۔ اور وہ تھا بھی بہت فرماں بردار، پرکشش، شعروادب سے دلچسپی رکھنے والا۔لیڈری والی روایتی گردن اکڑائی اُس میں تھی ہی نہیں۔ ہمارا بہت اچھا، بہت ہی برخوردار اور بہت ہی تخلیقی شاگرد۔ پتہ ہی نہ چلا کہ وہ کب سیاست کے کوہستانی مکتبِ فکر میں جا شامل ہوا۔

مگر اب یہاں معاملہ دوسرا ہے۔قمبر اب میرے ادارے میں زیرِ تعلیم نہ تھا، وہ کب کا فارغ ہو کر چلا گیا تھا۔ دور دراز بلوچستان میں فاصلے دور ہیں، روابط نہیں ہیں.....۔اور پھر خبر آتی ہے کہ فلاں شاگرد روڈ ایکسیڈنٹ میں فوت ہوا، فلاں بیمار ہو کر، یا فلاں مسخ شدگی میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھا.....بس کسی کی شکل یاد رہتی ہے، کسی کی کوئی بات یا کوئی تحریر۔ ٹیچر سپیزنڈ پہ لگا سنگِ میل نہیں ہوتا، بلکہ گوشت پوست سے بنا ایسا انسان ہے جسے اپنے شاگردوں کے دکھ سکھ متاثر کرتے ہیں۔ وہ جو اپنے شاگردوں کی زندگی پر، اُن کے مستقبل پر اثر انداز ہوتا ہے تو اُس کے لیے واحد شرط ہی یہ ہے کہ وہ اُن اُن کے غم سکھ میں شریک بھی رہتا ہے۔

قدم بھی عجب مظہر ہوتا ہے۔ پل کو شیطانی پل کو رحمانی، پل کو حاسد پل کو مقدس۔ اب ہمارے قدم خود بخود تقدس کے موزے اوڑھ چکے تھے۔ ہم شہید کے بیتِ اقدس کے دروازے پہ جو تھے۔شہید کا روحانی باپ، بلوچستان بھر کا فاصلہ طے کر کے اُس کے طبعی باپ سے تعزیت کے لیے آیا تھا۔

ہم گلے ملے۔ میں نے اپنے اِس ہم زاد سے اتنا ہی کہا کہ ''ہم کچھ نہیں بولیں گے''۔ مجھے معلوم تھا کہ بولنا کبھی کبھی اَن کہی کی گراں قدری کو کم کر دیتا ہے۔لہٰذا ہم مرکزِ ثقل کی بڑی تصویر کے

نیچے بیٹھے صاحبِ تصویر اور قدِ مشترک کے بارے میں کچھ نہ بولے، ہم نے آسمان کی طرف ہاتھ بھی نہ اٹھائے۔ کچھ رسوم، تو، رواج سے بالاتر ہوتے ہیں ناں! لہٰذا ہم نے کچھ بھی نہ کہا، ہم نے کچھ بھی نہ کیا۔ اور شاید، ہم بہت کچھ کہہ اور سمجھ گئے۔ بلوچ معاشرے میں طرفین کا سببِ آمد واضح ہوتا ہے۔

کسی کے زخموں کو کھرچنے سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا؟ مگر مبارک قاضی تو گوشت پوست کا نہیں ہے۔

قاضی سراپا درد ہے، درد کے خمار میں مخمور۔ درد باہر ہو تو باطن میں بھی طوفان برپا کر دیتا ہے، مگر اندر ہو تو باہری موسم کے تیور اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔

دکھ سکھ تو باریاں بدلتے رہتے ہیں۔ کون بنی آدم ہے جسے دکھ کا تلخ ترین ذائقہ چکھنا نہ پڑا ہو۔ قاضی شاید بہادر ترین باپ ہو، یا، شہید بچے باپ کو مضبوط بناتے ہیں؟۔ قاضی سے دل کو شکنجے میں کسنے والا دکھ اُس وقت آ ٹکرایا جب وہ اُس کے اپنے چل چلاؤ کا وقت تھا۔ کچھ لوگوں کو البتہ بالکل الٹا تجربہ ہوتا ہے۔ قاضی ساٹھ سال پہ کمر شکن چوٹ کھا گیا، ہم چھٹی جماعت میں ہی سایہ سے محروم کر دیے گئے تھے۔ وہ تقدس کا بار اٹھانے کو زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکے گا، ہم ذاتی حساب چکانے کی صورت سماج کو بہت کچھ دینے کو لڑکپن اور جوانی رینگ کر ساٹھ سال گزار چکے ہیں..... پتہ نہیں کس کا دکھ بڑا ہے۔ شاید قاضی کا کہ بڑھاپے میں صرف بیماریوں کے خلاف ہی مدافعت کم نہیں ہوتی بلکہ دکھ کے خلاف بھی امیونٹی گھٹ جاتی ہے۔ اور وہ بھی جب بچپن کی نسبت بڑھاپے میں دکھ کا شعور بھرپور ہوتا ہے۔ اور مفلس کی قبا کی طرح دکھ ایک ایک کر کے اس کا پیوند بنتے جاتے ہیں۔

وہ زمانہ بہت پرے ہے جب دکھ کی گہرائی گیرائی کے ٹورنامنٹ کبھی منعقد نہیں ہوں گے، یہ تو ہمارے فیوڈل اور ماقبل فیوڈل طبقاتی سماج ہیں جو دشمن کو خود سے بڑا درد پہنچانے کو اکساتے رہتے ہیں۔

سنجیدگی، سنگینی کی اس نشست میں اُس نے بس اتنا کہا کہ میری تو خواہش تھی کہ وہ دوائیوں سے انسانوں کی خدمت کرے مگر اُس نے انسانوں کی خدمت کی یہ راہ چنی، میں راضی بہ رضا۔..... آہ!!

میں تو کوئٹہ سے موضوع اُس کے حوالے نہیں کرنے دینے کا فیصلہ کر کے چلا تھا۔ میں موضوع کو یہاں بھی اپنے کنٹرول میں رکھنا چاہتا تھا۔ باطن کو ہلا ڈالنے والی قاضی کی شاعری کی تازہ کتاب چھپی تھی۔ اس پہ وزیرِ اعلیٰ مالک بلوچ کی طرف سے ''مالی امداد سے چھپنے کا فقرہ'' لکھا تھا۔ قاضی نے مدافعتی بات چھیڑ دی۔ میں نے اُسے یہ کہہ کر روک دیا: ''قاضی تم کئی چیزوں سے بالاتر ہو۔ چھوٹی چیزوں پر صفائیاں دیتے رہنا ہم جیسے چھوٹے لوگوں کا کام ہے''۔

کسی کے پُر سے پر ہونے والی گفتگو سے زیادہ بکواس، روایتی اور ہر طرح کی جدت و اضافہ و ترمیم سے مبرا گفتگو دنیا میں موجود نہیں۔ ناقابلِ منسوخ اور اعصاب شل کر ڈالنے والے نقصان پہ مالک سے کیا لفاظی کی جا سکتی ہے۔ فرار ڈھونڈنے، میں قاضی کے داماد رستم کے ننھّے سہراب کو گود میں لیے کتاب، شاعری کے استفسار و معلومات کی جگالی کرتے، سپیس اور ٹائم کے باہمی تعلّق کو گہرائی تک محسوس کرتے، بالآخر ٹوٹی کمر کے بڈھے کے دُکھستان سے نکل پڑا۔ ٹائم' سپیس کا بھٹہ بٹھا دیتا ہے۔ عام حالات ہوتے تو میں کہہ رہا ہوتا:

حیف درچشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گُل سیر نہ دیدم کہ بہار آخر شد

مگر آج میرے پاس لفظ نہ تھے، اور وہ بھرا بیٹھا تھا۔ زبان اور آنکھوں سے چھلک چھلک جاتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ کور بہادر قبرستان کی دنیا میں بالکل بھی نہیں رہے گا۔ مجھے یقین تھا کہ اُسے اپنی آنکھ، جگر، اکلوتا بیٹا بھولے گا بھی نہیں مگر وہ اُس کے ساتھ مرے گا بھی نہیں۔ زندہ شاعر زندگی کی باتیں کرے گا، زندگی کو باشرف اور شریف بنانے کی باتیں، روشن تر کرنے کی باتیں، سہل تر بنانے کی باتیں۔ مگر ایسے میں اپنے کسی قریبی آدمی کے ساتھ رونے کی خواہش تو ہوتی ہی ہے ناں!۔ سانحہ کی باتیں، اندھیر برپا ہونے والی ساعت کی باتیں..... ہم ایسا موقع دینا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا ہم بھاگ کھڑے ہوئے اور قاضی کا اپنے اکلوتے اور نوجوان لختِ جگر کے لیے کہا ہوا مرثیہ ہمارا پیچھا کر رہا تھا:

بر ے بر ے اپیتک باں
زہیر کہ جنت مناں
سُچنت دل وجگر منی
کفاں میں تر انگاتئی
تو گیرہ کا یئے بے کساس
تا دل منی حیال کنت
وتا گوں گپ وگال کنت
او چو گُشیت
''تر اغریبیں شوانگے مناں خدائل ئے بکنت''

****

بدوک میں ایک دلچسپ چیز دیکھی۔ وہاں ملیشیا کی چیک پوسٹ ہے ۔آس پاس بلوچستان ہے ....ذومعنویت مت تلاش کیجیے، مطلب ہے کہ آس پاس کوئی آبادی، کوئی بستی گاؤں وغیرہ نہیں ہے۔مگر پھر بھی وہاں عصر کی اذان بہت زوردار لاؤڈ سپیکر پر دی جارہی تھی۔آواز میں البتہ مؤذن، عمر خیام کا بیان کردہ جیسا، تھا۔

96

پھر گوآدر میں

اور پھر ہم داخل ہوئے گوادر......

اسے گوادر (Gawadar) کی بجائے گوآدر (Guadar) پڑھنا چاہیے۔اس کی شکل کیا ہے؟۔جیسے پانی کے بڑے تالاب کے کنارے یعنی خشکی سے ایک دیوہیکل پیر پانی میں رکھا ہوا ہو۔ اس کی ایڑی کی طرف بھی خشکی، خود سارا پاؤں بھی خشکی ہے البتہ اس کے پنجے کی صورت باشیل پہاڑ کا ابھار ہے۔پیر کے دائیں بھی پانی اور بائیں بھی سمندر۔پیر کے دائیں بائیں موجود پانی نیم دائرہ کی شکل کے کنارے بناتا ہوا نیلگوں سمندر کا پانی ہے۔

گوآدر پرشیں گلف کے دھانے پر واقع ہے۔سٹریٹس آف ہرمز سے ذرا سا باہر۔پرشیں گلف میں آنے جانے کے بحری جہازوں کے اہم ترین روٹ پر۔یہی تو وہ اہم ترین سمندری شاہراہ کی اہم ترین جگہ ہے جہاں سے دیو کے دادا ہیکل سے بھی بڑے بحری جہاز خلیج فارس آتے جاتے ہیں۔اسے اسی خطے میں موجود مغربی بلوچستان کے چاہ بہار بندرگاہ جتنی اہمیت حاصل ہے۔قلات ریاست میں شامل 72 کلومیٹر کے فاصلے پر موجود اِن دو بندرگاہوں کو گولڈسمتھ نامی ایک بدبخت کی تیار کردہ سرحد صدیوں کا فاصلہ دیئے بیٹھی ہے۔

عجب چکر چل رہے ہیں۔ایران، گولڈسمتھ کے عطا کردہ چاہ بہار کو گوادر کے مقابل کھڑا کر رہا ہے۔چاہ بہار جو اُس کا اپنا نہیں ہے۔چاہ بہار بھی گوادر کی طرح مہرگڑھ والوں کا ہے۔ایران،

افغانی بلوچستان میں زرنج نامی علاقے تک ریلوے لائن لے جائے گا۔ جہاں سے تاجکستان کو ریل سے ملایا جائے گا۔ایشیائی عظیم الجثہ ڈریگن، چین، خود کو تاجکستان سے ریل کے ذریعے ملائے گا۔ ابھی تو ایران اُس بین الاقوامی شاہراہ سے کام لے رہا ہے جو اس نے چاہ بہار سے زرنج تک بنائی ہے۔اسی شاہراہ کو کئی ممالک ٹرانزٹ ٹریڈ کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔

اِدھر پاکستان چین کے ساتھ مل کر گوادر کو ''ترقی'' دے رہا ہے۔Root کی ساری کہانی چھپا کر محض Route کے قصے اخبارات اور ٹی وی پر دھڑا دھڑ چل رہے ہیں۔زون ہی زون۔ پیسہ ہی پیسہ۔لہٰذا جھگڑے ہیں،فساد ہیں،اخباری بیانات ہیں،ٹی وی ٹاک ہیں،شاک ہیں،صدمے ہیں،زور ہے،شور ہے،زبردستی زیردستی ہے۔کوئی ناک کو اِدھر سے مسخ چاہتا ہے،کوئی اُدھر سے۔

مگر، گوادر بے چارہ سے کوئی پوچھتا ہی نہیں ہے کہ بھائی صاحب! بتا تیری رضا کیا ہے۔ اور یہی ہے خرابی کی اصل بنیاد۔ گوادر سے پوچھنا بہت ضروری ہے۔ آج، کل، یا پرسوں۔ پتہ نہیں ہم اپنے نواسوں پوتوں کے لیے مسائل کیوں چھوڑ جانا چاہتے ہیں؟۔ بھلا ایسا کہیں ممکن ہوا ہے کہ اتنے بڑے بین الاقوامی منصوبے، بغیر مقامی رضامندی سے کامیاب ہوئے ہوں۔اور مقامی رضا صرف سیاسی نہیں ہوتی۔ آپ کو جغرافیائی موجودات تک کی رضا کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ ڈنڈے اور پیسے سے رضا نہیں خریدی جاسکتی، صرف معاہدے مسلّط ہو جاسکتے ہیں۔اور معاہدے طے اور قائم صرف اُس وقت تک رہتے ہیں جب تک اُس کا مصنّف طاقت ور رہتا ہے۔اور طاقت تو بہت خانہ بدوش چیز ہوتی ہے۔آج یہ آپ کے پاس ہے کل یہ آپ کو ہلاکت میں ڈال کر کہیں اور مہمان بن جاتی ہے۔

گوادر کو ساتھ لیا جاتا تو گوادر بلوچ کی زندگی بدل ڈالنے کا وسیلہ ثابت ہوتا۔ہم فیوڈل ازم سے ایک ہی جھٹکے میں باہر نکلتے، ہماری غاروں والی زندگی اور مائنڈ سیٹ یک دم بخارات بن جاتا۔ ہمارا تعارف اور ہماری شناخت دنیا سے ایک اور، اور ایک بلند صورت ہوتی۔علم حلم کے ساتھ مل جاتا، ٹکنالوجی، سائنس کی ہم جولی بنتی، اور ہم ایک باوقار مددگار کے بطور دنیا کے کام آتے۔ گوادر ہماری تہذیبی، معاشی اور سیاسی، ہمہ جہت ابھار کا موجب ہوتا۔گلف سے لے کر ایران و افغانستان

اور پاکستان تک بلوچ سماج میں صدیوں بعد، گوادر نے محسوس کی جانے والی ہلچل پیدا کرنا تھی۔ایک بین الاقوامی سطح کا پروجیکٹ بننا تھا اسے، بہت بڑی سرمایہ کاری ہونی تھی یہاں.....اگر ہم ہوتے۔

شام سات بجے، ہم پلٹتی لپٹتی راہوں کو کار موٹر کی بانہوں میں سمیٹے سیدھا ایک لاکھ آبادی والے گوادر میں اپنے میزبانوں کے پاس پہنچے۔.....موبائل فون پر دوستوں سے راستہ کی ہدایات لیتے لیتے ہم بالآخر ایک بنگلہ کے مین گیٹ پر تھے۔تقدیر نے میرے اچھے دوست بخشی کو قبرستان بدر کر دیا تھا، مگر اُس کا بھتیجا بہرام تو موجود ہے۔ اتنا اچھا اور متحرک بلوچ کہ سارے مہمانوں کو اپنے بڑے گھر میں جمع کر دیا۔ دعوت کھلائی اور کچھ احباب بالخصوص خواتین مہمانوں کو اپنے گھر ٹھہرایا بھی۔خدا گھروں گھرانوں کے گیٹ دوستوں کے لیے بند نہ کرے شالا۔

بہت پرانے احباب سے ایک بار پھر ملاقات ہوئی۔اپنے پسندیدہ فن کاروں، دانش وروں، لکھاریوں، اور ادب دوستوں سے بالمشافہ ملاقاتیں ہوئیں۔میل ملاپ کے لائق لوگوں سے میل کے بغیر میلہ کیسا؟۔جلدی جلدی دوستیاں نبھاؤ۔اس لیے کہ بعد میں وقت نہیں ملے گا.....گوادر اور چینی شہر ژوہائی کو جڑواں شہر قرار دیا گیا۔

شامیں، گوادر کی شامیں۔'' آنکھوں میں تو دم ہے'' والے غالب کو دو شاموں کے لیے گوادر لاؤ، وہ پوری کلیات بلوچستان کو نہ بخش دے تو جو سزا ضیا الحق کی وہ میری۔مگر، ایک حقیقت بتاؤں؟۔ برا لگتا ہے وہ شاعر جس نے زندگی بھر محبّت کا قطرہ نہ چکھا ہو مگر عشقیہ شاعری کے مجموعے در مجموعے شائع کرتا ہو۔ برا لگتا ہے وہ آدمی جو پیتا نہ ہو اور ساغر و مینا پہ صفحے پہ صفحے کالا کرتا جائے۔ چنانچہ،.....ہم گوادر پہنچے۔

یہ چار روزہ کتابوں کا میلہ تھا۔مگر اِسی میلے کے اندر سیمینار بھی تھے، پینٹنگز کی نمائشیں بھی تھیں، ڈرامہ، مشاعرہ تھے، ''سینڈ آرٹ'' یعنی ریت سے مجسمے بنانے کی فن کاری تھی۔موسیقی کی بزم آرائی تھی۔گویا آرٹ و ادب کی بلند ترین سطح کی سرگرمیاں تھیں۔

میلے کا افتتاح اُسی روز ہمارے پہنچنے سے پہلے جان بلیدی کر چکا تھا۔ جان بلیدی عام

سیاسی ورکر سے کم رفتاری مگر مستقل مزاجی سے ترقی کرتا رہا۔ اپنی سیاسی پارٹی کے لیے ایک روزنامہ کی ایڈیٹری کرتا رہا اور بالآخر اب اپنی پارٹی کے وزیراعلیٰ کا سیاسی مشیر اور حکومت کا ترجمان بنا۔ مدہم طبیعت کا بظاہر مؤدب نظر آنے والا یہ سیاسی کارکن اپنی سیاسی (وغیر سیاسی) شرارتوں کے حوالے سے کبھی کبھی اخباروں میں آجاتا ہے۔ مگر مجموعی طور پر گفتگو کے قابل انسان ہے۔

دو لاکھ روپے امداد کے اعلان کے ساتھ اس نے یہ افتتاح'' فرمایا''۔ اچھا ہوا کہ ہم ''اپنے'' کرنے کے کام کے وقت ہی پہنچے۔ افتتاح و اختتام تو سرکار کے سیشن ہوتے ہیں۔ سپاسنامے، مطالبات، اعلانات، انعامات۔ ہمیں بتایا گیا کہ مقررین کتاب کی اہمیت اور علم کی ترویج کی ضرورت پہ بھی بولے۔ کچھ کچھ وزیراعلیٰ اور اُس کی حکومت کی تعریف بھی ہوئی۔ اصل میں جس تنظیم نے چار روز تک گوادر کو جنگل منگل کرنا تھا اس کا سربراہ، واجہ سورابی سمیت تقریباً سارے عہدیدار اِسی پارٹی سے قربت رکھتے ہیں۔ لہٰذا اگر سیدھا سیدھا نہ بھی کہیں تو بھی اشاروں کنایوں میں، مونچھوں کے نیچے، چھپ چھپا کر، اس حکومت کی تعریف تو کرنا تھی۔

ہم گوادر، بخشی کے بھتیجے بہرام کے گھر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہاں تو ایک ''مچیں پور'' سجا ہوا تھا۔ کراچی کی بہت اچھی شاعرہ شہناز نور کو ہم نے پہلے نہ دیکھا تھا نہ پڑھا تھا، لہٰذا سنا بھی نہ تھا۔ میں نے اُسے یہ بتایا تو وہ بالکل بھی حیران نہ ہوئی۔ اُسے پتہ تھا کہ اِس دیس میں علم وفن کی دنیا کے ستاروں پہ کمندیں پھینکنے والوں کے ساتھ ساتھ مجھ جیسے بہت سے ''خلیفے'' بھی موجود ہیں۔ لہٰذا، وہ بس مسکرادی۔ شہناز نور میری طرح بے وفا نہیں، اس نے تو ابھی تک سگریٹ سے دوستی نبھائی ہوئی ہے۔ .....ہم نے سب سے پہلے اُسے سنا، اُس کی تکریم کی۔

یہاں ایک عدد اور نور بھی موجود تھا۔ مگر وہ ''تھی''، نہیں، ''تھا''، تھا۔ وحید نور جس نے کراچی کے کسی ادبی سیمینار میں میرا مذکر و مؤنث سے خالی ایک مقالہ سن رکھا تھا..... وہ اُس کے متاثرین میں سے تھا اور ابھی تک اُسی مقالے کے سامع کے بطور اپنا تعارف کراتا ہے۔ سادہ آدمی! اپنی بلند قامتی کسی کے سیمینار کے پیچھے کب تک چھپا سکو گے؟۔ مجھے اپنا ہر سامع دانش میں بلند قامت بنتا اچھا لگتا ہے۔

عمران ثاقب اپنی بھرپور جواں شاعری کے ساتھ وہیں تھا۔ یہ نوجوان تو کافر قسم کی گلوکاری بھی کرتا ہے، اُس دن معلوم ہوا۔

یہاں بلوچستان یونیورسٹی میں بلوچی ڈیپارٹمنٹ کا اُستاد سنگت رفیق موجود ہے۔ چھلاوہ روح کا آدمی۔ ابھی تک جدیدیت میں جگہ پانے کی تگ و دو میں ہے۔ فارم اور کانٹینٹ میں سے کسی ایک کے انتخاب کی روح سوز جدوجہد میں غلطاں ہے۔ اُسے ہم سب کی طرح ''بلوچیت'' اپنی رو میں بہا کر سیدھی راہ دکھا ہی دے گی کہ وہ ادبی طور پر بے برگ و بے طرف و بے راہ خطے میں نہیں رہتا۔ اُسے اس کی دھرتی کے فن وادب کے'' گام گیژ'' مہرگڑھ تک لے جائیں گے۔ ذرا اُس کے شعور کے سر کے دوبال سفید تو ہو لینے دو!!۔

مگر اس کی موجودہ متجسّس ذہنی کیفیت مجھے بہت اچھی لگتی ہے۔ خواہش ہے کہ وہ دوبارہ ''سنگت اکیڈمی'' راہبروں کی صف میں آن موجود ہو۔ بے شک وہ ٹائم لے لے، پہلے ستاروں کو معبود بنائے، پھر چاند کو، پھر سورج کو.....اور بالآخر حقیقت تک آن پہنچے۔ راستے میں پیر چھالے تو ہو ہی جاتے ہیں۔

شُکر ہے کہ اُس نے لفظ'' ڈیپارٹمنٹ'' کا بلوچی ترجمہ کرنے نہ دیا۔ کچھ لوگوں نے ''تخلیقیت'' کی ٹانگیں توڑ ڈالیں جب انہوں نے لفظ''ناول'' کا بلوچی میں ترجمہ کرڈالا۔ نہیں نہیں ''رومان''، نہیں، ''گدار''۔ انہوں نے نیٹ کو بلوچی میں ''دام'' بنایا، نیٹ ورک کو کاردام، انٹرنیٹ کو دلگ، ویب کو تَند، ویب سائٹ کو تَنجاہ، ویب پیج کو تَندیم، ہوم پیج کو لوتاک، لِنک کو کرس، لوڈ کو گیج، اپ لوڈ کو سرگیج، ڈاؤن لوڈ کو ایرگیج.....سب بلند آواز میں بولو''لاحول ولاقوۃ اللہ باللہ العلی العظیم!!''

مُراد اسماعیل بھی اِدھر تھا۔ وہی ڈیلٹا والا جس کے پرائیویٹ تعلیمی ادارے کی شان دار پیداواریت نے تشویش کی لہریں دارالحکومت تک پہنچادیں۔ اور اباسین کے اُس پار سے خرد کے ویریوں کو جمع کرکر کے علم کے''بلوچستان چیپٹر'' پر حملے کرنے پر اکسائے رکھا۔ بھئی یہاں فرد کی طرح اداروں کی گردنیں بھی بلند نہیں چاہئیں۔

محفل میں ظہیر ظرف بھی تھا، حب کے چیکو کی طرح خوش ذائقہ گفتگو کرنے والا اچھا شاعر، اُس کی جونیئری، مؤدبی دومنٹ میں تحلیل ہو چکی تھی.....ہم سے جو ملا تھا!

سعدیہ بلوچ اور رژنا کی ماں نوشین تو ہمارے ساتھ ہی آئی تھیں۔..... رژنا کا باپ بھی تھا بھئی۔ میرے یار کا بیٹا، سیف۔ ڈاکٹر عثمان بادینی کا بیٹا سیف واپڈا میں انجینئر ہے۔ ڈاکٹر عثمان میڈیکل کالج میں مجھ سے ایک دو سال جونیئر تھا۔ شام کے وقت وہ ریڈیو پاکستان میں بلوچی کا ایک دیہی پروگرام کرتا تھا۔ ہم جب چھٹیوں پر گاؤں جاتے تھے تو ہر شام اس کا پروگرام سنتے۔ اس لیے کہ وہ اشاروں کنایوں میں کالج کی خبریں سناتا۔ ہم لیٹ ہو جاتے اور کالج میں باز پرس کا خطرہ ہوتا تو وہ اپنے پروگرام کے مخصوص انداز میں کہتا: ''ناکو شاہ محمد! بختاور، تو کجائے من پرتہ زہیر کرتہ، بیا.....'' اور بس ہم گاؤں سے واپس کالج لوٹتے۔ امتحان ملتوی ہوتا تو وہ ریڈیو پہ کہتا: ''ناکو قرار بہ کن، سردیں۔ ماہے آپد شہرا بیا''۔

ڈاکٹر عثمان کا دوسرا بھائی بھی میڈیکل کالج میں تھا، ڈاکٹر عنایت۔ اب سب بڈھے کھوسٹ ہو چکے ہیں۔ عمر بھی عجیب مظہر ہوتی ہے۔ شروع ہوتی ہے ''فریش، اور ری فریش'' سے، اور انجام پاتی ہے ''ٹائرڈ، اور ری ٹائرڈ'' میں۔

گوادر کی اس محفل میں ٹی وی پروڈیوسر حفیظ بلوچ موجود تھا۔ جوان، متحرک اور سنگین متین۔ پروفیسر اعجاز بھی موجود تھا۔ بھئی میں نے ''ماس کمیونی کیشن'' کے کسی ٹیچر کو اس قدر خاموش کبھی نہیں دیکھا۔

نوجوان دلوں میں موجود دھڑکنوں کے سیاق وسباق کا مجھے کچھ پتہ نہیں کہ انہیں ڈی کوڈ کرنا ایک الگ اسپیشلٹی ہے۔ مگر انہوں نے شاید اپنی کوششوں کو بارآور نہ پا کہ مجھے موبائل ملا کر دیا۔ درخواست کی کہ مناظر کی سیم وسرحد، رستراٹی کی خاتون کو یہاں آنے کا حکم دوں۔ میں نے اپنے سے بہت بڑے انسان کا واسطہ دیا: ''پروین ناز، تمہیں عبداللہ شاہ غازی کا واسطہ چلی آؤ''۔ ایک چھت پہاڑ قہقہہ حاضرین کی طرف سے گونجا، اور ایک بے ساختہ بلبل فون کے ذریعے کان میں چہکی، ''پیدا کوں''۔

.....اور پھر میرا پرانا یار، بجار آ گیا، اس اعلان کے ساتھ کہ وہ میرا سُن کر آ گیا۔ مجھے اُس کے خلوص پر شک ہو تو شالا محبوبہ کی خود پہ کی گئی شاعری سے محروم ہو جاؤں۔ مگر یہ بھی تو معلوم تھا اُسے کہ جب ہم ہوں گے تو رانجھے کی ونجلی تو بجے گی۔ اور موسیقی تو بجار کے نبض کی ہارمنی کی چغلی ہے، اُس کے ذائقے کی چیز۔ وہ دور رہ ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ فضا میں موسیقی کی بُو سونگھتا سونگھتا پہنچ گیا۔ بہانہ ''مندرجا نے کا''.....اور میں تو عمر بھر اجڑی روحوں کا مندر ہی بنا رہا۔ شکتی، اور شکتی شالی کی تمنا کے بغیر۔

بجار ایک بے لوث، selfless، chrismatic شخص ہے۔ یہ شخص مجھے بہت اچھا لگتا ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ مجھ سے مشرقی بلوچی بول لیتا ہے۔ اُس سے بھی بڑھ کر اس لیے کہ اس سے میری پہلی ملاقات اُس وقت ہوئی جب میرا مورچے کا ساتھی امیر الدین ابھی زندگی سے، زندگی کو حسین بنانے کی جدوجہد سے، اور مجھ سے، دور نہ ہوا تھا۔ جب میں اور امیر الدین ہیومن رائٹس کمیشن کے وفد کے بطور تربت گئے تھے۔ وہیں ہم بجار سے پہلی بار واقف ہوئے تھے۔ اب جب بھی ملتا ہے تو مجھے زندگی یاد آ جاتی ہے، زندگی کو حسین بنانے کی جدوجہد کا اپنا رفیق یاد آتا ہے۔ بجار مجھے سب سے بڑھ کر اس لیے بھی اچھا لگتا ہے کہ اُسے اچھا لگنے ہی کے لیے خلق کیا گیا تھا۔

وہ اکیلا نہ تھا، ہمارے ایک اور ممدوح گلزار بلوچ کو بھی ساتھ لایا تھا۔ گلزار ایک بسیار نویس شخص ہے۔ اُس کے مضامین ''سنگت'' میں چھپتے رہتے ہیں۔ تحریریں تازگی جوانی کا پتہ دیتی ہیں۔ مگر ہم پہلے ملے نہ تھے۔ آج جب وہ گلے ملا تو خاموشی سے مؤدب ومہذب بن کر کان میں اپنا نام بتایا: گلزار لچکی۔ میں نے اُسے خود سے دور کیا، غور سے اُسے دیکھا، اور دوبارہ گلے لگاتے ہوئے بے ساختگی میں کہہ بیٹھا: ارے میں تو تمہیں جوان سمجھتا تھا!!۔ بس پھر یہ ہم دونوں کا سمجھوتکیہ کلام بنا۔ ایک اچھا دوست پا کر بھلا کون خود پہ فخر نہیں کرے گا۔!!

ہم تھکے ہوئے تھے، مگر جب مغربی، جنوبی اور وسطی بلوچستان کے آرٹسٹ، شاعر اور دانش ور مشرقی بلوچستان کے ایک ہم قوم سے ملتے ہیں تو پھر محفل نے تو جمنا ہی ہوتا ہے نا۔ سو جم گئی۔ ایک چھوٹا سا شاہ عنایتی ''دائرہ'' فوراً ہی قائم ہو گیا۔ لہٰذا ایک غیر رسمی مشاعرہ ہم نے کر ڈالا۔

مشاعرے کی بھرپور فصل کی کٹائی کے بعد اب ہم اُس کے بچے ہوئے اکادکا خوشے (پڑنج) جمع کررہے تھے کہ منظرنامہ بدل گیا۔ میوز نے اپنے دوسرے بچے کو آگے کردیا۔ یہ کراچی سے آیا ایک یار باش اور فن کا دل دادہ نوجوان روفی تھا۔ اس نے ایک کتاب فرش پر رکھ دی۔ سب کی نظریں تجسّس میں اُس کی اگلی حرکت کے لیے اُس پر ٹکی ہوئی تھیں۔ ہماری حیرت میں اُس نے اس کتاب کو طبلہ بنا کر اُسے بجانا شروع کردیا۔ .....یاد ہے، تُرک دربار میں بے تیغ چاکر نے مدِمقابل بدمست ہاتھی پر بلی کا بچہ پھینک کر کے اُسے پسپا کردیا تھا؟!

روفی کا ہنر کارہاتھ لگے تو طبلہ محبوبہ کے کان کے جھمک کی ژلک ژلک جیسا مدہر ساز کیسے نہ بجائے گا۔ روفی اُس برادری سے تعلّق رکھتا ہے جس نے پانچ سو برس قبل دولو برڈرز کے معدے بھرنے اور ستر ڈھانپنے کا سامان کیا تھا۔ مجھے تصور میں دشمن گوئہرام لاشاری کی پناہ میں آئے بیورغ رند اور اُس کی محبوبہ کے لیے لایا ہوا لباس اور ذائقہ دار کھانے روفی کے ہاتھ میں دکھائی دیے۔ اور تصور ہی میں میں نے اُس کے ہاتھ چومے: بطور بیورغ کے میمن کے بھی اور بطور فن کار کے بھی۔

روفی کا طبلہ دھم دھم کرے تو فی البدیہہ انداز میں گلے کھنکھارنے لگتے ہیں۔ کوئی مدھم مدھم گنگنانے لگا، کوئی ہلکی سیٹی سے ساتھ دینے لگا، کوئی گلے کی بجائے گردن کا رقص کرنے لگا، اور روفی دونوں ہتھیلیوں سے طبلہ کاری کرتے ہوئے اپنی گردن کو پورب پچھّم پنڈولم بنانے لگا.....

اور پھر مردِمیدان بجار کو گانے کی جیسے بشارت ہوگئی۔ وہ سنتیا گو سٹیڈیم میں وکٹر ہارا بن کے اترا تو پھر گلزار ساتھ ہولیا۔ عمران ثاقب مل گیا، پروین، نوشین .....سب The Beatles بینڈ کے ممبر بن گئے۔ گلوکاری شروع ہوئی تو شیطان اپنے اصلی اڈے یعنی دارالحکومت کی طرف دُم دبا کر فرار ہوگیا۔

بلوچی، اردو، غزل، سوت، فلمی، غیر فلمی، انقلابی، ترانے، گیت.....بجار کے ذہن میں ذخیرہ کرنے کی وسیع صلاحیت موجود ہے اور گلے میں ایسی بیورغی تاثیر کہ ''مڑاگاہ قندہار'' کے شاہی محل میں چاندی سی الھڑ جوانیاں مچل مچل جائیں۔

ایسی حسین محفل میں داد کے نام پر گیدڑی اور کوّا گیری کرنا دخل در معقولات سے بھی بڑھ کر ہے، روزہ مکروہ ہونے جیسا۔

بجار.....دُردانغیں بجار سے ہم نے بلا مبالغہ دو درجن سے زائد گانے جھومتے لہکتے سنے .....اور میں نے بے ساختگی میں کہا: ہم مریوں میں بجارانڑیں' گزینی کا تفرقہ ڈالا گیا تھا تو ہر غیر بلوچ افسر پوچھتا آپ مریوں میں بجارانڑیں ہو یا گزینی ہو؟۔ میں بجارانڑیں ہوتے ہوئے بھی اس سوال کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا تھا۔ اس لیے کہ اس سوال کے پیچھے سوال کنندہ کے دل میں مسرت کا بپھرتا سمندر نظر آتا تھا۔ جمہوری تحریک کے دشمن، تحریکوں میں بجارانڑیں گزینی کا زہر انڈیلتے رہتے ہیں۔ کبھی اِس شکل میں کبھی اُس صورت میں۔ اب آرٹسٹ بجار کو اس فن کاری کے ساتھ دیکھا تو زور سے چیخ بیٹھا: ''میں بجارانڑیں ہوں''۔

اور ایسے مواقع پر گھڑی کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو کلائی میں بے کار بندھی ہوئی ہے۔ آنکھیں موسیقی کے ساتھ ہارمنی پیدا کر چکنے والے کانوں میں ضم ہوجائیں تو روح کائنات کے ساتھ مکمّل طور پر Synchronise ہوجاتی ہے۔ تب وقت کو گننے کا بور کردینے والا عمل موقوف ہوجاتا ہے۔ گھڑی اشرف المخلوقات میں ڈھل جاتی ہے۔ اُس کی پھرکیاں، اس کی سوئیاں اور سوئیوں کی معدومیت کی حد تک خفیف ٹک ٹکیں، طبلہ کے ساتھ سنگتی میں ڈھل گئیں۔ اب یہ وقت بتانے کی بے رحم مشین نہ تھی، موسیقی کا مقدس آلہ تھی۔

ہم ٹائم سے بہت دور کبھی پانچ دریاؤں میں اٹھکیلیاں کررہے تھے، کبھی بھنبھور کی دھوبن کے ہاتھ سے ہاتھ ملائے چل رہے تھے، کبھی سخی سرور کی ''ملخ'' کے نور میں نہا رہے تھے، کبھی مرشد کی تقلید میں اپنے پر گناہ پنجوں کے ساتھ مقدسات کی جھالریں ہلا رہے تھے، اور کبھی گورغیں بلوچستان کے قدموں میں مہر کی تجدید کررہے تھے۔ موسیقی ''گداز ساز'' فیکٹری کا سب سے بڑا پہیہ ہوتی ہے۔

حسن مولانغوں کے بیچ میرا حسن موڈو بننا ہمیشہ سے یقینی رہا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ فطرت سے میری یاری ایسی بنی رہی کہ لنگوٹ کس کر کسی ارینا میں اترنے کی نوبت آنے سے پہلے ہی فطرت

عرض داشت سمجھ لیتی ہے۔ پردہ پال ہے مولا!!

میں دیکھ سکتا تھا کہ جیئند جمالدینی، ضیا شفیع اور عابد میر بھی اپنے اپنے مقدر کی پیشانی پڑھ رہے تھے.....ہفت جہاں گم۔عشق، پیراکی کے ورلڈ چیمپیئنز تک کو ڈبو دینے کی کرامت کا خاوند ہوتا ہے۔

کس وقت کھانا آیا، ہم نے کیا کھایا، احساس ہی نہ ہوا .....ہم جو بن پیے بھی کوہساروں کے نایاب بھنگ کا سمندر پیے ہوئے تھے، اتاہ خامشی اور استغراق میں پیٹ بھرنے کا جبلتی کام سرانجام دیتے رہے۔خاموشی اس لیے کہ کائناتی ہینگ اوور کے تحلیل ہونے کا خدشہ تھا۔کوئی اس کیف کیفیت، اس ٹرانس سے نکلنے کی خواہش نہیں کرسکتا تھا۔سب ''کچھ نہیں'' بن گئے تھے، سب ''سب کچھ بن'' بن چکے تھے۔مشیتِ ایزدی کا یہ فیصلہ کتنا اچھا فیصلہ تھا جس کے تحت اس نے آدمی کو سماجی جانور قرار دیا تھا۔

ہم ایک طویل سفر، بہت سارے مقامات کے دورے، بے شمار دوستوں سے ملاقات، ایک شان دار مشاعرہ گزارنے، ایک غنی اور مغنی محفل موسیقی سے اپنا حصہ روح کے پھیپھڑوں میں جذب کرکے اور تازہ مچھلی کی بے شمار ڈشوں کی دعوت اڑا کر، رات کے کسی پہر تھکے ہارے ریسٹ ہاؤس میں عظیم سمندر کی پُرمہر لوریوں میں اُس کے پہلو میں ایک پرسکون نیند سوئے۔

لوری کے بول تھے:

''راج بلوچی ئے پہ وسغا جوانیں''

******

اگلے دن بندرگاہ کا ایک افسر، داؤد بلوچ ہمیں پورٹ میں گھما رہا تھا۔جب ہم چینیوں کے رہائشی/دفتری علاقے سے گزر رہے تھے تو وہاں مجھے دیوار پر ایک چینی کہاوت (انگریزی میں ترجمہ شدہ) بہت ہی موٹے الفاظ میں لکھی نظر آئی۔میں نے وہ فقرہ پڑھا، اور جیئند خان، ضیا شفیع اور داؤد بلوچ کے لیے دوبارہ اُسے زور زور سے پڑھا۔اس سے ہمیں چین کی آج کی صورت حال، گوادر پر اُس کی مہربانی، اور پاکستان کے ساتھ اُس کی گہری دوستی کا سارا فلسفہ پہلے سے زیادہ شفاف اور وضاحت

کے ساتھ سمجھ میں آ گیا۔فقرہ تھا: ''پیسے کے بغیر آدمی اُس کمان کی طرح ہے جو تیر کے بغیر ہو''۔

ہت تیرے کی!۔اب میں سمجھا ہوں تیرے رخسار پہ تل کا مقصد۔اچھا!!! یہ تم اپنے کمان کے لیے تیر کی تلاش میں ہو۔اُس ٹرک سے بھی بدتر جس کے پیچھے لکھا ہے: ''ڈالر کی تلاش، لوڈ کی پرواہ نہیں''۔پیسہ جس کسی کا بھی زندگی کا مقصد ٹھہرا، زمانے نے اُسے انسانی شرف اور عزت مندی سے دور دیکھا۔

میں دوستوں کو مشورہ دوں گا کہ وہ آج کے چین کو سمجھنے کے لیے امریکی ''کاؤبوائے'' سلسلے کی دو چار فلمیں دیکھیں، انہیں ''سونا اور سفاکیت'' کی جوڑی سمجھ میں آئے گی۔

بھئی، کپٹلزم اخلاقیات پہ زیادہ بھروسہ نہیں کرتا۔دوستیاں اور وفاداریاں، منافع خوری میں کسی کام نہیں آتیں۔چین ''پیسہ ازم'' کی طرف رواں دواں ملک ہے۔ہمارے کچھ احباب ابھی تک پچھلی صدی کی ساٹھ کی دہائی والی چینی روسی جھگڑے کے نفتھالین بھرے آکسیجن سیلنڈر میں جی رہے ہیں۔اُن کے پیشِ نظر راہداریوں کے نام پہ انفراسٹرکچر کی فوری معاشی، کلچرل اور سیاسی قیمت ہے ہی نہیں۔ذہنی طور پر پرانے زمانے کے اِن دوستوں سے کیا مباحثہ، ہمیں تو تیر اور کمان کی بات پہ غور کرنا ہے۔اندازہ ہوا کہ ہمارے انفراسٹرکچر پر اس قدر اضافی پیسہ لگانے سے چین کی کم زور ہوتی معیشت کو مدد ملے گی۔اس کی کمپنیوں کو زبردست اور دیرپا منافع ملے گا۔اُسے اپنے زرمبادلہ ذخائر اضافہ کرنے میں مدد ملے گی۔

اِس وقت صورت حال یہ ہے کہ چین گلف کے تیل کو خلیج ملاکا کے ذریعے اپنے بحرالکاہل کے ساحل تک لے جاتا ہے۔چین، پُرخطر ''ملاکا خلیج'' پر انحصار کو ختم کرنا چاہتا ہے، اس لیے کہ اِن جزائر پر بہت جھگڑا رہتا ہے۔دراصل چین، عرب خلیجی ممالک کے تیل اور توانائی کو مغربی چین تک لے جانا چاہتا ہے۔منصوبہ یہ ہے کہ چین عرب خلیج کے ذریعے گوادر تک آئے۔اس کی اس اہم خواہش کا جواب گوادر کے پاس ہے۔گوادر گہرے پانیوں کی بندرگاہ کے بطور بے شمار فوائد رکھتا ہے۔یہ قریب ترین روٹ مہیا کرتا ہے اور یہ بندرگاہ ہر موسم اور پورا سال چلنے والی ہے۔گوادر کو سڑک اور ریل کے

ذریعے پاکستان کے شمال میں قراقرم شاہراہ سے ملایا جائے۔ یہ روٹ اُسے ملاکا روٹ سے بہت نزدیک پڑتا ہے۔خلیجی عرب دنیا سے تیل سیدھا،توانائی کے لیے بھوکے اندرونِ چین۔

تو دوستو! یہ صرف پوٹھوہار نہیں جسے گرم پانیوں کی تلاش ہے بلکہ یہ تو پیکنگ بھی ہے جسے راہوں کو مختصر کرنے والا پانی چاہیے۔ اِس بین الاقوامی اور قریب تر روٹ نے چین کی کپٹلزم کی خدمت میں دینے کی آرزو کو تکمیل بخشنا ہے۔چین' گوادر سے کاشغر تک اپنا مال لانا لے جانا چاہتا ہے۔بارہ ہزار میل کا فاصلہ کم ہوکر 2395 کلومیٹر رہ جائے گا۔

اِس کے علاوہ چین کا مغربی علاقہ پسماندہ ہے۔اس نے اسے ''ترقی'' وغیرہ دینا ہے۔ گوادر اُس کے لیے تو یوں گیم چینجر ہے کہ اس کی مسافت کم ہوجائے گی، ہمارے لیے اس لیے گیم چینجر ہے کہ یہاں ہماری شناخت، ملکیت اور اقتدار اعلیٰ کا خاتمہ ہوجائے گا۔اور، ایک مدہم وموہوم و غیر یقینی ہماری قومی بصیرت کی آنتڑیاں اکھاڑتی رہے گی۔

لہٰذا ہمیں چین کی شرافت معلوم ہونی چاہیے۔ ہمالیہ سے اونچا یہ دوست تو سمندر کی گہرائی سے ہماری ہڈیاں تک نکال لے جانے کو کدالیں بیلچے لیے آن موجود ہوا۔چین کے ساتھ جو نظریاتی رشتے تھے وہ اُس دِن بخارات بنے جس دن سے اس نے سوشلزم سے بے اعتنائی برتنا شروع کردی اور سرمایہ داری کی مکھیوں مچھروں کی آمد کے لیے کھڑکیوں کی جالیاں اکھاڑ پھینکیں۔اب وہ بلوچ عوام کو مدد دینے نہیں بلکہ ہم غریب لوگوں کا پیٹ چیر کر اپنی تجوریاں بھرنے آتا ہے۔ یہ گوادر، یہ کوسٹل ہائی وے، یہ رنگینیاں، یہ چِینیاں بے چَینیاں، یہ وفود یہ دورے، یہ چکا چوند، یہ دبئی گیریاں ہمارے وقار اور ہمارے خزانوں کا دوپٹہ نچوڑ ڈالنے کے لیے ہیں۔

کون کہتا ہے کہ گوادر نہ بنے، اس کا پورٹ نہ بنے، اُس کی بے مثال ترقی نہ ہو۔مگر بیل کے مالک سے یہ پوچھنا ضروری ہوتا ہے ناں کہ وہ اپنے بیل کو ہل چلانے کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے یا ذبح کرنے کے لیے۔

اِدھر دوسری مصیبت یہ ہے کہ بلوچستان ایسا نازک ہے جیسے پیلوں کے درخت پہ لگا پھل

جو بالکل آبلہ کی طرح ہے، ذرا ہاتھ لگا نہیں آبلہ پھٹ گیا۔ ہماری آبادی میں ایک لاکھ بھی گھس جائیں تو سمجھو بلوچ اقلیت۔ یہ احتیاط تو صرف ماں ہی کرسکتی ہے، تاجر ایسی ناز برداریاں کہاں کرتا ہے۔ دکان اور بلوچستان کبھی دوست نہیں بن سکتے۔

اُس روز میں نے آس پاس نظریں گھما کر دیکھا، اِس سمندر کن (بمشابہ گورکن) کے گینتی بیلچے کی حفاظت کو لوگ موجود تھے!۔

گوادر ایک مستقبل بدبختی ہے اور بدبختی کا منیجر.....اور ہیڈ ماسٹر تو سب سے بڑا بدبخت ہوتا ہے۔جس نے چارج میں یہ بدبختی لی، وہ برباد ہوا۔ یہ بدبختی پیدائشی طور پر بلوچ کے ساتھ تو ہے ہی، مگر جس بھی خارجی نے اس کی چمک دمک کا دھوکہ کھایا وہ دوبارہ پیروں پہ کھڑا نہ ہوا۔ ایسا زندہ کیکڑوں بھرا نوالہ جو کھانے والے کے گلے میں اپنے کانٹوں نوکوں سے بری طرح چپک جائے۔نہ نگلا جائے نہ اُگلا جائے۔مرگ تک۔

ہم سیاہیں ڈِک (سیندک) میں چینیوں کے ہاتھ بلوچ کا لُٹنا دیکھ چکے ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سام راج (جو کہ سرمایہ داری نظام کی معراج کا نام ہے) جب کسی سونا چاندی والی جگہ سے واپس جاتا ہے تو پیچھے نہ سونا بچتا ہے اور نہ کاپر۔بس انسانی آہوں، پشیمانیوں اور احساسِ شکست کے کھنڈرات چھوڑ جاتا ہے۔

گوادر کی ''ترقی، تنزلی'' کا تھرمامیٹر تو پراپرٹی ڈیلر ہیں۔ یہاں تو جب گوادر بے چارہ خود بھی دوسروں کی وجہ سے ناچ رہا ہے تو اُس کے ''پراپرٹی'' کے ڈیلروں کو بھی ناچنا ہوگا۔ پراپرٹی ڈیلرز کبھی تُو تُو بجاتے آتے ہیں کبھی بَین کرتے جاتے ہیں۔اور یہ پراپرٹی ڈیلر ہیں کون؟۔ڈیلر ہیں یار۔ پراپرٹی کی صورت کچھ بھی ہو۔سوات اور بھجے کے پائے کے بیچ ڈیلنگ ہو یا بحریہ ٹاؤن اور بل نگوئر کے بیچ۔جسمانی عصمت کی ہو یا ماں زمین کی۔

چنانچہ گوادر کا ڈیلر پہلی بار جب آیا تھا تو گوادر نے اُسے امید سے کرلیا تھا۔ پھر اِدھر اُدھر کوئی سمال یا بِگ بینگ ہوا تو حمل ضائع اور وہ واپس اپنے وطن چلا گیا۔مگر اونٹ تو دس برس پرانی

چراگاہ کو بھی یاد کر کے رسیاں تڑوا کر وہاں جاتا ہے۔ ڈیلر بھی ایسا ہی ہے۔ پیسہ اُسے کھینچے ہے تو گوادر دھکیلے۔ پیشہ وروں کا بھی اعتماد ہوتا ہے۔ ''اُن'' کا بھی اعتماد بحال یا ٹوٹ سکتا ہے۔ ڈیلر اپنے پیسہ کی تولید در تولید کی خاطر ملک وقوم کی خیر و برکت کو، لائی گیشن کا آپریشن کرنے کو ہمہ وقت تیار رہتا ہے۔

بہر کیف چین کی راہداری کی نئی کروٹ کے ساتھ ڈیلر پھر واپس آنے لگے ہیں۔ کبھی کبھی ''راہداری'' لفظ کے پرانے معانی کو نئے میں ڈھلتے ہوئے عجب محسوس ہوتا ہے۔ راہ، راہ داری، سپردگی، خود سپردگی.....کیا کیا لفظ ہیں ڈکشنری میں۔

پھر یہ ڈیلر خود کچھ بھی نہیں ہیں جب تک لینڈر یونیو میں موجود کوئی '' بُڑھیا'' ان کی راہ ہموار نہ کرے۔ اور ''بڑھیاؤں'' کے ہاتھ تو اس قدر لمبے ہوتے ہیں کہ گوادر سے سول سیکریٹریٹ کوئٹہ اور فلاں حتمی سیکریٹریٹ تک ایک پوری زنجیر ہوتی ہے۔ ہائے رے کارل مارکس، تمہیں بھی تب مرنا تھا جب گوادر کی '' گاہ'' ابھی جُتی نہ تھی۔ ارے یہ منڈی تو ابھی سجی ہے۔ خوشبو، بوتلیں، دھوتی ٹائی، کٹورے، کوٹھا، جھنجھنے، حقہ، تاپ، تھاپ، نغمہ، آواز لکھنؤ.....۔

گوادر بلوچستان نہیں، پلاٹستان ہے۔ گوادر میں پلاٹ انڈے دیتا ہے۔ ہم آپ تصور تک نہیں کر سکتے کہ ارزاں فروشی کسے کہتے ہیں۔ ہم مڈل کلاس پارٹیوں کو سمجھاتے سمجھاتے عمر بتا چکے ہیں کہ ''رموزِ سرکار سرداراں می دانند!! سائیں''۔ اور سردار وزرائے اعلیٰ کے فیصلے تم مخلوط و رنگ برنگی بیساکھیوں کے مڈل کلاسیے کہاں Undo کر سکتے ہو۔ قاری، کیا آپ کو پتہ ہے کہ گوادر ایئر پورٹ کے لیے جو زمین گئی وہ لندن کے ہیتھرو ایئر پورٹ کے رقبے سے دوگنی ہے؟۔.....گوادر اور ہیتھرو!۔ چنانچہ سب کچھ پلاٹستان قائم کرنا ہے۔ نقلی میگا، نقلی پراجیکٹس، نقلی شوشا۔ بس پلاٹ اصلی۔

زمینوں پر قبضے کرنے، خریدنے اور الاٹ کرنے کے تماشے تو ہم سب کے دیکھے ہوئے ہیں۔ مگر اصل بات تو چین اور گوادر کا ہے۔ معاہدوں اور معاہدوں کے بیچ چپکے چپکے سے کیے گئے اضافوں، ترمیموں، تحریفوں پر مشتمل دستاویزات کی بھرمار ہوتی رہی ہے یہاں۔ یہ باہمی بات یک طرفہ بات ہے۔ یہ تو گوادر کو کاٹن پیک کر کے چین کے حوالے کرنے کی بات ہے۔ گوادر ''پاک چین

دوستی'' کا سب سے بڑا شکار ہے۔

بتانے والوں نے بتایا کہ پورٹ کی آمدنی میں 95 فیصد چین کا اور محض پانچ فیصد ہمارا ہے۔ ہم تو اس پہ ماتم کریں گے ہی مگر یہ بھی یقین ہے کہ ہمارا خدا ابھی مکمّل طور پر چین کی طرف نہیں ہوا ہے۔ اسی لیے گوآدر اپنی تمام تر موزونیت کے باوجود ایک پورٹ نہ بن سکا۔ افلاطونی دماغوں نے اپنی طرف سے تو 1993ء میں یہ پراجیکٹ منظور کیا تھا۔ 2002ء کو اِس پراجیکٹ کا افتتاح بھی ہوا۔ 2007ء کو گوادر پورٹ کا افتتاح ہوا۔ اسے ٹرانزٹ ٹریڈ، ٹرانس شپمنٹ کے بطور تصور کیا گیا۔ اب وہارف کا 600 میٹر تعمیر بھی ہو چکا۔ تقریباً 14 میٹر گہرا کھدائی کیا ہوا۔ اسے اگلے پانچ سال میں 900 کلومیٹر تک بڑھانے کا منصوبہ بھی ہے۔

پھر، یہ پروگرام بھی ہے کہ اس پر ماڈرن پورٹ کا انفراسٹرکچر بھی تیار ہوتا جائے، جس میں سٹوریج، ویئر ہاؤس وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح ہوٹل، موٹل، ٹریول اینڈ ٹورازم کا فروغ ضروری ہو جاتا ہے۔ صنعتی شعبے میں سمندری خوراک کا پراسسنگ اور ایکسپورٹ،، کھجور کی پراسسنگ اور برآمد بہت منافع بخش ہوگا۔ دفاتر اور رہائشی تعمیرات کا طوفان آنا تو یقینی بن جاتا ہے۔

بھئی کوئی مانے یا نہ مانے اصل مقصد تو گوآدر بندرگاہ کو اپنانا تھا۔ وہ (اُن کی نظر میں) ہو گیا تو گویا ایک بہت بڑا مسئلہ حل ہو گیا۔ دوسری بڑی خواہش معدنیات بھرے بلوچستان کو گوادر پورٹ سے ملانے کی ہے۔

مگر کون یہ راز فاش کرے کہ دلہن گوادر، پیدائشی لنگڑی ہے۔ کون عقل مندوں کو بتائے کہ سہاگ رات ہی کو یہ ڈائن بن جاتی ہے۔ اس نے جب اپنے مالک کو کہیں کا نہ چھوڑا یہ دوسروں کو کیا چھوڑے گی۔ پرتگالیوں نے اُسے، اور اس نے پرتگالیوں کو تار تار کیا، مسقطیوں نے اسے اور اس نے انہیں نوچا دبوچا، انگریز نے اسے چیچک لگایا تو اس نے انہیں حتمی بونے پن کی بدعا پھونک دی۔ سنگاپور والا سیٹھ اپنے سایہ دار ہیٹ اور سگار لٹکے منہ کے ساتھ آیا، اُس نے گوادر کی اور گوادر نے اُس کی شکل بگاڑ کر رکھ دی۔ اور اب چین کی باری ہے ..... دیکھیں!!۔ کسے یقین نہیں کہ زمانے نے

راکھشس کو زخم اور درد میں کراہتا چنگھاڑتا ابھی دیکھنا ہے۔

بلوچی زبان کی ضرب المثل ہے کہ ''بد بخت کے ریوڑ میں بھیڑیا گھس جاتا ہے اور خوش قسمتوں کو اُس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ علاقے میں بھیڑیا موجود ہے''۔ مندرجہ بالا بد بخت لوگوں کو گوادر نے چباڈالا تو خوش قسمتوں کو پتہ چلا کہ یہاں سرمایہ کاری خطرناک ہے۔ تاجر کو تو منافع چاہیے ہوتا ہے، فوری اور یقینی منافع۔ اور یہ گوادر نہ ''فوری'' منافع دیتا ہے نہ ''یقینی'' منافع۔ اسی لیے امریکہ اور یورپ یہاں سرمایہ کاری نہیں کر رہے۔

مگر اندھا معاشرہ اندھے کام کرتا ہے۔ دیکھیے ناں پورٹ بنا تھا وسطی ایشیا کی مارکیٹ کے لیے، مگر وہاں تک نہ سڑک بنائی گئی اور نہ ریلوے۔ لہٰذا گوادر ایک مفلوج شوپیس کے بطور سرمایہ داری نظام کا منہ چڑانے موجود ہے۔ وہاں پہ مستقبل قریب میں بلوچ پرولتاریہ کی تشکیل کا پراسیس شروع ہونے کے کوئی امکانات موجود نہیں ہیں۔

اے بابو لوگو! گوادر کو دبئی بنانے کے لیے سڑک اور ریل چاہئیں۔ وہ کم بخت بن نہیں پا رہیں۔ انہی سڑکوں ریلوں کو دالبندین اور وہاں سے ایران اور پھر وسطی ایشیا تک جانا تھا۔ یوں سرمایہ داری نظام کا ایک اور سرکٹ بن جاتا۔ مگر سرمایہ داری نظام تو، لگام ٹوٹے گھوڑے کی طرح بدنظم و خودسر ہے۔ چین امریکہ سے تمام تر یاری اور اتحادی گیری کے باوجود، معاشی بقا کے لیے اُس سے مقابلہ میں ہے۔ دبئی گوادر سے کہنی بازی میں لگا ہوا ہے۔ چاہ بہار گوادر سے خاموش خاموش مسابقت میں ہے، بھارت الگ مفادات رکھتا ہے.....

ریل اور سڑک صرف جغرافیائی مسائل والے ہوتے تو شاید بن جاتے۔ مگر یہ تو سیاسی بھی ہیں۔ اس لیے بغیر گفت وشنید کے، بغیر سمجھوتہ کے کیسے بن پائیں گے۔

اور اگر بن گئے بھی تو بدمزگی تو رہے گی ہی۔ اور قوموں کی بدمزگی فرد کی بدمزگی سے بہت شدید بہت گھمبیر ہوتی ہے۔ اور اگر یہ سارے باہم مخاصم سرمایہ دار ممالک ایک بھی ہو جائیں، اور طویل بلوچ بغاوت کو پالتو بھی کر لیں تب بھی اس قدر طویل اور کٹھن و دشوار علاقے میں سے، اور

بلانوش مون سون سے بچتے بچاتے سڑک ریل بنانے میں دہائیاں لگ جائیں گی۔

سنٹرل ایشیا تک ریل، روڈ بنانا جب نہ ہوا تو سمجھو پورٹ بے کار ہے۔ جی ہاں بے کار ہے۔

ہنسی آتی ہے جب بلوچستان کے باہر کے سرمایہ داروں کے مفادات کو بلوچستان کا مفاد قرار دیا جاتا ہے۔ سڑک اور روٹ کے اوپر بلوچستان و خیبر پختونخواہ کے کچھ ٹی وی اینکرز، اور مذہبی اور لسانی پارٹیاں نواز شریف کی پنجاب پرست حکومت سے زبردست تنازعے میں ہیں۔ یاروں نے گویا گوادر ہڑپ کر بھی لیا۔ اور اب محض اس کی مردہ لاش لے جانے والی روٹ پہ بحث مباحثہ جاری ہے۔ لاش برداری پہ پیسے کمانے کے لیے ٹی وی چینلوں پہ چیخ و پکار، علاقوں کو ''ترقی'' دینے کی عرضیاں دھمکیاں۔ انہوں نے اپنے خیال میں گوادر چین کو کامیابی سے بخش بھی دیا، اور یار لوگ اب دنیا بھر کا سامان گوادر سے چین تک پہنچانے کا روٹ طے کر رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے حسن ابدال، کوہاٹ، ڈی آئی کوئٹہ، پنجگور گوادر والا راستہ ہو۔ دوسرا ایم 4,3,2 ملتان، راجن پور، حب اور وہاں سے گوادر جانا چاہتا ہے۔ تیسرے کی خواہش ہے کہ حسن ابدال سے موٹروے کراچی، رتو ڈیرو، خضدار، آواران، خوشاب گوادر ہو۔

''بھائی صاحب'' کا خیال ہے کہ وہ ریل کے ذریعے سنٹرل ایشیا تک اِن راستوں سے پہنچے گا:

1۔ گوادر، دالبندین (تقریباً 515 کلومیٹر)

2۔ گوادر قلات مستنگ ..... (تقریباً 625 کلومیٹر)

3۔ گوادر خضدار، ڈی جی خان، پشاور، طورخم

اسی طرح گوادر چین وہ اِس راستے سے جانا مانگتا ہے:

4۔ گوادر، ملتان، فیصل آباد، پنڈی، گلگت سے خنجراب کے ذریعے چین۔

طاقت ور کبھی انشا اللہ بولتا ہی نہیں!!

مگر اب تو ''فری اکنامک زونز'' کا سن کر دریائے سندھ کے اُس پار کے سرمایہ داروں اور سیاست دانوں نے چین گوادر روٹ ہی پر اکتفا کرنے کا ارادہ باندھا ہے۔ ٹیکس سے آزاد فری اکنامک زون پنجاب میں بن جائیں تو اور مزے ہوں گے ناں!!۔

اِدھر، تقدیر مہدی پہاڑ کی بلند چوٹی پر بیٹھی زہریلی مسکراہٹ مسکرا رہی ہے۔ ساحل بلوچ کا، معدنیات بلوچ کی، اور گزرنے والا راستہ بھی بلوچ کا، اور اُس پر لڑ رہے ہیں خارجی گدھ۔ ارے بھائی، گوادر کا روٹ بلوچستان ہی میں سے ہو کر گزرتا ہے۔ چینی بھائی، گوادر کا قبضہ بے کار جب تک بلوچستان کا قبضہ نہ ہو۔ اور اکیسویں صدی میں قبضوں کا تصور محض عقل سے کھسکی ہوئی کوئی قوم ہی کر سکتی ہے۔ کیا وہ اس بات میں کامیاب ہوں گے کہ ہم اچانک مالک نہیں رہیں گے بلکہ اُس کے ''روٹ'' کی مینڈکوں، کتوں، گدھوں کے گوشت کے حفاظتی لیویز والے ہوں گے؟۔

کسی نے مجھے بتایا کہ یہ بندرگاہ تب ہی خود کفیل اور مکمّل ہو جائے گی جب ہفتے میں 21 کمرشل بحری جہاز یہاں آئیں۔ اور تصور کریں کہ ہر ہفتہ 21 دیوہیکل بحری جہاز جو سامان لائیں گے لے جائیں گے، اس کے لیے حکومت اور سرزمین کتنی تیار ہے؟۔ چیونٹیوں کی قطاریں لگ جاتی ہیں ٹرالروں کنٹینروں کی۔ سڑکوں کی نہیں شاہراہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض شاہراہوں کی نہیں مصروف ترین ریلوے لائنوں کی بھی۔

اسی طرح ملک میں گھر کا بلب جلانے کو بجلی نہیں ہے۔ جب کہ ایک پورٹ 24 گھنٹے کی بجلی اور وہ بھی وافر بجلی مانگتا ہے۔ گنریش دیوتا لاؤ، یا شاؤلین کا پورا جوڈو کراٹے والا لشکر، یا جوج ماجوج لاؤ یا چین کے سارے تصوراتی راکھشس جمع کرو۔ ساری دنیا کی بلائیں اکٹھی کرو لاؤ مگر بقول شہ مرید گوادر نامی ''ہندو مسلمان نہ ہوگا''۔ واللہ اعلم بالصواب۔

******

RCDC (رورل کمیونٹی ڈویلپمنٹ کونسل) ایک غیر سرکاری ادارہ ہے، نیم این جی اوٹائپ کا۔ یہ ادارہ 1961ء میں قائم ہوا۔ اس کے ممبروں کی تعداد 63 ہے۔ یہ ادارہ بہت ساری سرگرمیاں کرتا ہے۔ خاموش مگر بہت متحرک اور وسعت والی این جی او۔ وہی این جی اوؤں والا ''وژن''، جس میں وہی جینڈر ایکوئیلٹی، سوشل جسٹس، ڈیموکریسی اور ٹالرنس والے بڑے بڑے لفظ شامل ہیں۔ یہ ورلڈ بنک، نیوزی لینڈ سفارت خانہ، عورت فاؤنڈیشن، آکسفام، سیپ، سیودہ چلڈرن سے مالی مدد لیتی ہے۔

ہم ربع صدی سے این جی اوز کو قریب سے دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ اور اس ذاتی تجربے کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ RCDC نامی یہ این جی او کام ''بھی'' کرتی ہے۔ ہم نے اس کا کام خود دیکھا ہے۔ موقع ملے تو یہ جہازوں ہوٹلوں کی لابیوں میں بھی لابی انگ کرتی ہے، مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ بلوچستان کے دل گوادر اور آس پاس دیہاتوں بستیوں میں خیر کے کام بھی کرتی ہے۔ اس کی اس بڑی کمپلیکس نما عمارت میں ایک بڑا ہال ہے، تین ہزار کتابوں پر مشتمل لائبریری ہے، کمپیوٹر سیکشن ہے اور ایک ہائیر سیکنڈری سکول چل رہا ہے۔ یہی تنظیم یہ کتب میلہ منعقد کروا رہی تھی، جس میں ہم اپنی کار موٹر اور اپنے خرچے پر کوئٹہ سے شرکت کر رہے تھے۔ ''کتاب میلہ''..... یہ لفظ ہی متبرک ہے۔

کتاب دنیا سے وابستہ بے شمار لوگوں اور پبلشروں نے اپنے سٹال لگا رکھے تھے۔ دوسرے لفظوں میں، کتاب میلہ دراصل کتب کے سٹالوں کا میلہ تھا۔ ہال کے اندر سامعین کی کرسیوں کے پیچھے اور پہلوؤں میں انگریزی لفظ U کی شکل میں یہ سٹال لگائے گئے تھے۔ ہر موضوع پہ کتب موجود تھیں۔ کہیں 30 فیصد رعایت کی پرچی لگی ہوئی تھی، کہیں 50 فیصد کی۔ تاریخ سے لے کر عمرانیات تک، اور سائنس سے لے کر مذہبیات تک، بلوچ سے لے کر انگریز و امریکہ تک، اور، بچوں کی کتابوں سے لے کر فلسفہ تک نوع بہ نو اور تازہ ترین کتب دستیاب تھیں۔ پرنٹ کی صورت میں نظریات تجربات اور علم کا تازہ بہ تازہ خون بلوچ رگوں میں آرہا تھا۔ صرف ایسا نہیں کہ بلوچ بیرونی دنیا سے واقف ہو رہا تھا بلکہ وہ تو خود سے بھی معانقہ کر رہا تھا۔ بلوچی زبان میں بے شمار کتابیں بک رہی تھیں۔

اور مکران تو کتاب کا بھوکا ہے..... کیا مرد کیا عورتیں، اور کیا سکولی کالجی بچے بچیاں۔ (واضح رہے کہ دو لاکھ کی آبادی والے پورے گوآدر میں ایک دانہ ڈگری کالج قائم ہے)۔..... دھڑا دھڑ میزیں خالی ہو رہی تھیں۔ بلوچستان کی آنکھ، گوآدر کے اس شان دار این جی او کا ہال، کمرے، احاطہ اور پورا شہر ادب دوستوں، ادیبوں اور فن کاروں سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ وطن جو صبح و شام اپنے ہی لہو میں نہاتا ہے، اس کی جی داری اور حوصلے کی داد دیجیے کہ وہ آج بھی ادب کو سر آنکھوں پر رکھتا ہے، ادیبوں اور فن کاروں کی راہ میں آنکھیں بچھاتا ہے۔ کتاب دوست

معاشرے ہی انسانی معاشرے ہوتے ہیں۔

کتاب کیا ہے؟۔ یہ پیچیدہ ترین مخلوق یعنی انسان کی پیچیدہ ترین تخلیق ہے۔ کتابوں کے ساتھ انسان کا سلوک بھی عجب رہا ہے۔ ابھی چھ آٹھ ماہ قبل پورے مکران ڈویژن میں کتاب گھروں پر سرکاری یلغار کی گئی تھی۔ بے شمار کتابیں ضبط کی گئیں اور ہم مصنّفوں کو خطرہ ہوا کہ پھر ضیاالحقی گرفتاریاں جیلیں نصیب ہوں گی۔ مگر، پھر آج صوبے کے وزیراعلیٰ کا دستِ راست کتب میلہ کا افتتاح کرتا ہے۔ اور انہی لوگوں کی کتابوں پر مشتمل میلے کا افتتاح کر رہا ہے جن کی کتابیں محض چھ ماہ قبل ضبط کر دی گئی تھیں۔ کتاب حیران، قلم حیران، کاغذ حیران۔ کل یہ کہہ کر بک شاپس پہ چھاپے مارے جا رہے تھے کہ کتاب ریڈیکلائزیشن کراتی ہے، آج یہ کہہ کر افتتاح ہو رہا تھا کہ کتاب ریڈکلائزیشن سے بچاتی ہے۔

کتاب سے عشق زندگی کا ایک ایسا خوب صورت تجربہ ہے جو آخری سانس تک ساتھ دیتا ہے۔ کتاب پکی اور بہت دیر تک رہنے والی دوست ہے۔ انٹرنیٹ، فیس بک اور اس کے منابع و شاخیں آج کی حقیقت ہیں لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ کتاب ختم ہونے والی ہے۔ وہ چھ ہزار برس سے کسی نہ کسی رنگ روپ میں ہمارے ساتھ ہے اور اس سے عشق، زندگی کا سب سے خوب صورت عشق ہے۔ کتاب سے اختلاف بھی ہوسکتا ہے، اور اس کی رائے سے متفق بھی ہوا جاسکتا ہے۔ ہم نے محبّت اور نفرت دونوں جذبات کے ساتھ کتاب پر حملے دیکھے ہیں۔ یہ اگر برناڈ شاہ کی ہے تو ہنسائے گی، اسکائی لس کی ہوگی تو دھڑکنیں کو غم ناک سینہ کوبی کی ریکارڈنگ بن جاتی ہیں۔ نیند نہ آئے تو سونے میں مددگار ہوگی، حرکت کرنا چاہو تو یہ تحریک دے گی۔ اپنے حلقے، حصار میں رکھے گی، راہنما بنے گی۔ کتاب ہمیں انسانی زندگی کی نزاکتوں سے آشنا کرتی ہے۔

شکر ہے کہ بلوچستان محض کتاب جمع نہیں کرتا، محض اسے سٹور نہیں کرتا، بلکہ وہ اسے پڑھتا بھی ہے۔ مہذب انسان اور مہذب معاشروں کی پہچان۔

کتاب ..... یہ لفظ اگر عبرانی، لاطینی اور عربی میں ہے تو کیا تقدس بھرے مذہبی معنی دیتا ہے۔ کتاب، اگر فارسی بلوچی میں کہیں تو کیا کیا تنوع ہوگا اس کے معانی میں۔ بنیے کی دکان میں اس کا

مطلب وہی ہوتا ہے جو کھلونے بیچنے والے کی ریڑھی پر رکھے چینی کھلونے کا ہوتا ہے۔ لائبریری میں ہے تو آن شان اور ہے، گھر میں ہے تو مقام کچھ اور۔ فٹ پاتھ پہ وصل کے لیے پڑی ہو تو اُس کا عاشق سب سے وفادار، اپنا سب کچھ لٹایا ہوا، اور مقدس ترین روح کا مالک ہوگا۔ کتاب اگر ردی فروش کے ترازو میں ہے تو گویا انسانی شرف وقار اور عصمت سرِ عام وحشی اور ناپالتو آدم نما مردم زاد کے گوح جیسے کھردرے پنجوں ناخنوں میں تار تار ہو رہی ہو۔ کتاب کورس کی ہو تو بلوچستان میں اُس کے ساتھ امتحانی ہال میں بدن دریدگی ہوگی، اور اگر عبادت گاہ میں ہو تو اُس کے متن و معانی کا اِس زندگی اِس دنیا سے تعلّق باقی نہیں رہتا۔ کتاب اگر فرقہ وار کے حوالے کیا جائے تو یہی کتاب بربادی کا موجب ہوگی۔ اور کتاب جب تقدس کی علامت بنتی ہے تو قتل و جائیداد کے فیصلوں کے لیے محض اس کا نام لینا ہی کافی ہوتا ہے۔ کتاب وکیل کے پاس ہوتی ہے تو اس کے بخیے ادھڑ دیے جاتے ہیں، اسے ننگا کیا جاتا ہے۔ عدالت میں ہو تو اسے جذبات و محسوسات کی قبر بنایا جاتا ہے۔ اور اگر پھانسی گھاٹ میں ہے تو عزم و استقلال، شاشان کوہ سے بلند ہو جاتا ہے۔

آئیے ہم وہ چینی نظم پڑھ لیں جو بدھ مت سے دور لے جانے والی ''اس'' چیز کی مذمت میں کہی گئی ہے۔ اور وہ چیز ہے کتاب:

نہ پڑھ کتابیں
نہ گا نظمیں
جب تم کتابیں پڑھو گے تو تمہاری آنکھوں کے ڈھیلے سوکھ جائیں گے،
جب تم نظمیں گاؤ گے تو تمہارا دل آہستہ آہستہ باہر کو بہہ نکلے گا
ہر لفظ کے ساتھ،
لوگ کہتے ہیں کتاب پڑھنا مسرت بخش ہوتا ہے،
لوگ کہتے ہیں نظمیں گانا پر لطف بات ہے،
لیکن اگر تمہارے لب متواتر ایسی آواز نکالیں
جیسے خزاں میں جھینگے جیسا کیڑا نکالتا ہے

تو تم محض ایک بڈھے باتونی لاغر شخص میں تبدیل ہو جاؤ گے
اور اگر تم ایک بڈھے لاغر باتونی شخص میں تبدیل نہ بھی ہو جاؤ
تو بھی دوسروں کے لیے تمہارا سننا ناخوش گوار ہے
یہ بہت بہتر ہے کہ
تم اپنی آنکھیں بند کرلو، اپنے کمرے میں بیٹھ جاؤ
پردے گرادو، فرض جھاڑ دو،
خوشبودار جھاڑی کا دھواں کرو
ہوا کو سننا خوب صورت ہے،
بارش کو سننا،
جب تو انا بنو تو ایک چہل قدمی کرلو،
اور سو جاؤ جب تم تھک جاؤ!!

اب ہم ماؤزے تنگ جتنے بڑے تو ہیں نہیں کہ اس موضوع پہ کتابچہ لکھیں: ''کتاب پرستی کی مخالفت کی جائے''۔ نہ ہی ہم نے ایک بار سی آر اسلم کے جھڑکنے کے بعد بُلھے شاہ کا یہ مصرعہ دہرانے کی دوبارہ کبھی جرأت کی: ''علموبس کریں او یار''۔

ہمارا بس یہ خیال ہے کہ کتاب احمقی کے تسلسل میں رکاوٹ بنتی ہے۔ کتاب جہالت کا انٹی ڈوٹ ہوتی ہے، کتاب وحشی کے پتھر دل کو موم بناتی ہے (بشرطیکہ آسمان بھی اُس پہ مہربان ہو)۔

جس گھر میں کتاب نہ ہو، وہ گھر نہیں مارشل لا ہیڈ کوارٹر ہے۔ جس گاؤں میں کتاب گھر نہ ہو، ویرانی اس کا مقدر ہو۔

میں نے سٹال میں بلوچی کی کتابوں پر دھاوا بول دیا اور بے شمار کتابیں خرید ڈالیں۔

.....ناصر رحیم سورابی تم زندہ رہو، اچھا!!

عبدالباسط شیخی کا تعلّق (پیدائش 23 ستمبر 1981ء، چاہ بہار) مغربی بلوچستان یعنی ایران کے چاہ بہار شہر سے ہے۔ ایک صحت مند جوان، ہو بہو مکران کا بلوچ۔ قد مناسب، جسم متوازن، بلوچ رنگت۔ مزاج میں متین و سنجیدہ، با حجاب و منکسر۔ کوئی گھمنڈ کبر نہیں، کوئی شو، شا نہیں۔ سادہ، صاف اور ستھرے من کا مالک نوجوان۔ اصول ضابطے کا آدمی۔ ایک عظیم آرٹسٹ کے خُو بو کا انسان۔ بہت ہی شیریں فطرت۔

شیخی اُس کا ذیلی قبیلہ ہے جب کہ بڑے قبیلے کا نام ملازئی ہے۔ ملازئی شاید ایران کے بلوچوں کا سب سے بڑا قبیلہ ہے۔ اسی طرح خان زئی بھی وہاں کا اچھا خاصا بڑا قبیلہ ہے۔ ''بدپا'' بھی بڑے قبائل میں آتا ہے۔ اس کے علاوہ سردار زئی، جمل زئی نام کے قبائل قابل ذکر ہیں۔

باسط خود چاہ بہار کا نہیں، پیشین کا ہے۔ چاہ بہار کے باشندوں کو ''امانی'' کہتے ہیں۔ جو ماہی گیر (مید) ہیں۔

وہاں گوادر میں ملا تو جیسے ایک ارمان پورا ہو گیا ہو۔ میں اس بڑے آرٹسٹ کے کام سے خوب واقف تھا۔ آرٹ تو انسانی روح کو جمالیات عطا کرتا ہے۔ ایک نرمگی عطا کرتا ہے قلب و رویوں کو۔ یہ تہذیبی سطح کو بلند کرتا ہے۔ باسط نے اپنے اندر موجود ٹیلنٹ پر ہی بھروسہ نہ کیا بلکہ خوب محنت کر کے اُسے اجلا، ستھرا اور مزید تخلیقی بنا دیا۔

آج ملا تو جیسے برسوں کا شناسا دوبارہ دیدار کرا رہا ہو۔ ہم نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ اُس نے بتایا کہ چاہ بہار میں کوئی ادارہ وغیرہ تو نہ تھا جہاں سے وہ باقاعدہ آرٹ سیکھتا، لیکن چوں کہ اسے بچپن میں ہی آرٹ اچھا لگتا تھا تو اس کے والد عبدالغنی نے اس کی خوب حوصلہ افزائی کی (وہ پانچ بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہے)۔ والد خود بھی آرٹسٹ تھا مگر وہ پروفیشنل آرٹسٹ نہ تھا، بس شوقیہ ڈرائنگ اور پینٹنگ کرتا تھا۔

ہم نے ڈھیر ساری باتیں کیں۔ اُس خاموش طبع نے کم، میں نے زیادہ۔ اور جب میں نے اُس کے اپنے بارے میں بہت پوچھ گچھ کی تو اس نے بالآخر گویا سیشن ختم کرانے کی خواہش میں پوچھا،

''آپ تاج بریسیگ کو جانتے ہیں؟''۔ میں نے کہا،''ہاں، میرا محترم دوست ہے وہ''۔ تو بولا''وہ میرا چاچا ہے''۔ اور میں ڈاکٹر تاج بریسیگ اور اُس کی باوقار بیگم کی باتیں کرنے لگا جو اپنی گراں قدر بیگم کے ساتھ یہاں بلوچستان یونیورسٹی میں کچھ عرصہ پروفیسری کرنے آیا تھا۔ مگر سویڈن کا رہائشی تاج، کوئٹہ کے رویوں کی کرختگی کی دیر تک تاب نہ لا سکا اور واپس یورپ چلا گیا۔ بلاشبہ بلوچستان دنیا بھر کے بلوچوں کا سرچشمہ اِنسپائریشن ہے۔ مگر، شاید ابھی تک یورپی بلوچوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔

دو بچوں کا باپ باسط حدوحساب سے زیادہ بڑا آرٹسٹ ہے۔ اس کی اب تک سات نمائشیں گروپ میں، اور پانچ سولو نمائشیں ہو چکی ہیں۔

باسط کے شہر چاہ بہار کے دو اور بڑے آرٹسٹ ہیں: اِن میں سے ایک تو محترمہ سیما سردارزئی ہے جو بلوچ عوام کی خواہشوں کی ترجمان اور بین الاقوامی سطح کی آرٹسٹ ہے۔ سماجی معاملات بالخصوص عورتوں کے بارے میں پینٹ کرتی ہے۔ حسن یادگارزادہ تو رنگوں کا بادشاہ ہے۔ جدید تقاضوں سے آشنا، اپنے وطن کی حقیقتوں سے باخبر۔ یہ تینوں ہم بلوچوں کا 'نرم چہرہ' ہیں۔ ہمارے سفیر ہیں۔

باسط جان کا مشن ہے کہ وہ بلوچ شاعروں، ادیبوں، دانش وروں اور آرٹسٹوں کو دنیا کے سامنے متعارف کرائے۔

باسط نے ماما عبداللہ جان جمالدینی، عطا شاد، مبارک قاضی، کمالان، جواں سال اور بے شمار بلوچ آرٹسٹوں اور علم وادب سے وابستہ لوگوں کی بہت ہی خوب صورت پینٹنگز بنائی ہیں۔ اس کی بے شمار پینٹنگز کو میں ''سنگت'' کا ٹائٹل بناتا رہا ہوں۔

انٹرنیٹ اور ای میل کی آفاقی مہربانیوں کی بدولت اُس سے میری سلام دعا تھی۔ مگر یہاں تو آج اس کی پینٹنگز کی نمائش رکھی گئی تھی۔ لہٰذا وہ موجود تھا۔ میں اس سے بغل گیر ہو کر کتنا خوش ہوا تھا۔ مگر یہ خوشی اُس وقت اعتماد وفخر واطمینان اور گہری دوستی میں ڈھل گئی، جب اُس کا افتتاح کرنے کو مجھے منتخب کیا گیا۔ مجھے پتہ ہے اُسے بھی بہت خوشی ہوئی تھی۔

یہ نمائش باسط جان کے ساتھ ساتھ گوادر کی دو عورت آرٹسٹوں کے فن کی بھی تھی۔ ہم اُن

تینوں کے آرٹ کی خوب صورتی سے لطف اندوز ہوئے۔ پورا شہر اور گردونواح اُمڈ آیا تھا یہ نمائش دیکھنے۔..... میں نے یہ ساری نمائش باسط کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے دیکھی۔

اُس نمائش کے فوراً بعد سیمینار شروع ہوا۔ یہ سیمینار بلوچی زبان کا ایک ابھرتا نوجوان، پروفیسر، اے آرداد (عبدالرزاق داد) کنڈکٹ کر رہا تھا۔ علم کا پیاسا، کتاب کا دل دادہ اور تخیّل وتفکّر کا دھنی اے آرداد۔ وہی اِس علمی سیمینار کا منتظم تھا۔ بس، اِسی سے اس سیمینار کی علمیت اور اعلیٰ معیار کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اے بلوچستان، تمہیں بلوچستان کا واسطہ ہمیں بڑی تعداد میں اے آرداد جیسے لوگ بخشتے رہنا!

مقررین نے بنیاد پرستی، انتہا پسندی اور دہشت گردی کے خلاف مدلل اور قائل کنندہ تقریریں کیں۔ مطالعہ کی عادت اپنانے اور بحث مباحثہ کرنے کی اہمیت واضح کی اور بلوچی کلاسیک اور فوک سے دلچسپی پیدا کرنے تلقین کی۔ بلوچستان میں موجود فیوڈل سرداری نظام اور مرکزی حکومتی اداروں کی ملی بھگت کو موجود وقائم عوام دشمن، استحصالی اور گھٹن کے ماحول کا ذمہ دار قرار دیا۔ ذکری اور شیعہ بلوچوں کے قتل کو ریاستی پالیسی کے تسلسل کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ بلوچ مسئلہ سیاسی ہے اور سیاسی طریقے سے ہی حل ہوسکتا ہے۔ اس کے لیے انتہا پسند جتھوں کے قیام اور فرقہ واریت کے نام سے انسانوں کا قتل کوئی کام نہ دے سکیں گے۔ سرکار اور سردار بلوچ مسئلے کا سبب ہیں۔

اس سیمینار میں کے بی فراق اور عبدالباسط شیخی ادب اور آرٹ پر پُرمغز بولے۔ میں نے بھی اپنی ''گنوخ سُدھا'' باتیں کیں۔

اسی دوران سکولی بچوں کے درمیان مضمون نویسی کا مقابلہ بھی کرایا گیا، اور مصوری کا بھی۔ اس کے علاوہ پسنی کے آرٹسٹوں نے ساحل پر ریت کے فن پاروں (سینڈ آرٹ) کی خوب صورت نمائش منعقد کی۔

گوادر جب بھی جائیں وقت کی کمی کا احساس ہوتا جاتا ہے۔ ہمیں پندرہ سال پرانا گوادر، سمندر، اور جیٹی دیکھنا تھا۔ ایک کار موٹر، دو کار موٹریں، تین .....ہم بھیڑوں والے ریوڑ کی طرح ایک ایک کر کے سب جیٹی پہنچے۔ ارے یہ تو وہی دیکھا بھالا علاقہ تھا۔ البتہ اب اُس کی وہ اہمیت نہ رہی

تھی۔ جیٹی آج دو شادیوں والے خاوند کی پہلی بوڑھی بیوی نظر آ رہی تھی۔ لائن میں گھونٹیوں سے بندھی کشتیاں، نیلام ہال میں بکتی ہوئی مچھلیاں، محنت کش مید و ماہی گیر.........مگر دیواروں پہ چینیوں کا نہ کوئی بکواس فقرہ تھا، نہ یہاں کوئی سپاہ و چوکیدار موجود تھا۔ لہٰذا ہم ذہنی اور بدنی دونوں اعتبار سے کھلے ڈلے عام سے انسان تھے۔

بھوک لگی ہوئی تھی اور سعدیہ بلوچ نے نہ صرف مچھلی خریدنے کی فرمائش کی بلکہ اس کو خود پکانے کا انتظام کرنے کا حکم بھی دیا۔ ایسی صورت میں ہمارے حسن مولانغ، یعنی جیئند خانِ المست نے جبلی سرعت کے ساتھ اپنا بٹوہ نکالا۔ مجھے لگا کہ اگر کچھ اور کی فرمائش بھی ہوئی تو آج نوشکی کے قریب اُس کے آبائی علاقہ یعنی بٹو میں اُس کے خاندان کی زمین کا تیسرا حصہ، گوادریوں کے ہاں رہن ہو جائے گا۔ ''جی، جی'' میرے اس حبیب کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ اتنے جی تو اگلی کو اُس کی مکہ ماں نے بھی نہ دی تھیں!!

ہم مچھلی سے لدے پھندے جیئند خان کی ڈرائیوری اور بجار و گلزار اور رفیق و عابد و ثاقب وضیا کے ساتھ، چاکری گھڑسواروں کی تیزی تندی میں وسعت یافتہ گوادر کی گلیاں چومتے بجار کے بن فیملی گھر پہنچے۔ ہم تو بیٹھے پنکھے کے نیچے، اور باقی احباب سعدیہ کی ہیڈ ماسٹری میں باورچی خانے میں۔ آج بھوک (؟) کے ہاتھوں ہمل جیئند کے سارے بچے، باورچی بن چکے تھے۔ بڑھ بڑھ کے برتن مانجھ رہے تھے، پیاز کے ساتھ آنکھیں دھو رہے تھے، منمنا رہے تھے، گنگنا رہے تھے.......... مجھے بلوچی ادب میں کردار نگار گورکی کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔

ہم نے برنج میں ماہی، یا ماہی میں برنج والی ڈش پہ ہاتھ صاف کیے۔ ہمیں فیوڈل ازم کے غلیظ جوہڑ میں پرورش یافتہ پیاسے اور محرومیت زدہ نوجوان دلوں کے احترام میں آنکھ، ناک، کان اور ہاتھ نیچے کرنے میں عافیت اور سکون محسوس ہو رہا تھا۔

ہم نے خوب کھایا اور تھال خالی کر دیے۔ ہم کسی بھی طرح بیورغ نہ تھے اور ہمارے ساتھ کوئی شاہی مالِ غنیمت نہ تھا۔ لہٰذا ہم نے اگلے کی آنکھ میں دھول جھونکنے کی خاطر نہ غالی کے نیچے کھانا پھینک کر تھال خالی کیے، اور نہ دریچوں سے باہر اچھال کر میزبان کو پیٹ بھر کر کھا چکنے کا یقین

دلایا۔ اس لیے کہ ہم گراں نازلے اڑے تھے اور نہ یہ گھر گوئہرام لاشاری کا عطا کردہ اوطاق تھا۔

شام کا مشاعرہ بھی سکالر، اے آر داد ہی کنڈکٹ کر رہا تھا۔ سیاحت میں سربراہ اچھا ہو تو مناظر تو مزید حسین ہوں گے ہی۔ اور یہاں تو شاعر نہیں شاہِ یار موجود تھے۔ لفظ اور لے کا مالک منیر مومن تھا، قافیہ ردیف سے محبّت کرنے والی شہناز نور تھی۔ حروف وہجہ اور زیروزبر کا ہیڈ ماسٹر علی عیسیٰ تھا، شعور و شاعری کو سنگم عطا کرنے والے عمران ثاقب اور بہادر علی گوہر تھے، سحر و شعر و حسن و ادائیگی کی ھداوند نوشین قمبرانی تھی، توصیف چین شاعر زبیر مختار اور وحید نور تھے، محبّت کی خفیہ گیری کو ڈانگ مارنے اور اسے طشت از کوہِ باشیل کرنے والی بہت اچھی شاعرہ سعدیہ بلوچ تھی، شعر کے فن سے آشنا کے بی فراق، ظہیر ظرف، آصف شفیق، عبداللہ عابد، ضیا شفیع، پھلان عمر، مجیب مجاہد، ڈاکٹر عظمیٰ قادری......... کتنوں کا نام لوں۔ اور کس ترتیب سے لوں کہ فیوڈل ازم کے پروردہ ذہنوں نے شاعروں کو ''پہلے اور بعد میں'' پڑھانے کے معاملے کو بھی ''جنگِ گوخ پروش'' بنا رکھا ہے۔

اس مشاعرے میں خوب صورت بلوچی اور اردو دونوں زبانیں شامل تھیں۔ یہ ایک ''مہذب ترین مشاعرہ'' اس لیے تھا کہ اس میں ہال کی طرف سے مکمّل خاموشی تھی۔ واہ واہ، مکرر وغیرہ سب اوپر سٹیج پر شاعر خود آپس میں بانٹ رہے تھے۔ بلوچ معاشرے میں مشاعرہ تو ابھی حال میں در آیا ہے۔ اس لیے واہ واہ اور مکرر اتنا زیادہ مقبول نہیں ہیں۔

جس بات کا دکھ ہوا وہ یہ ہے کہ ہماری اپنی اصناف میں ایک مصرع تک نہ کہا گیا تھا۔ ہم گوادر کے لوگوں سے تحریری شکایت کر رہے ہیں، کہ وہی ہمارے مستقبل کا ایک اہم ثقافتی مرکز ہیں۔ اُنہیں ہی احیائے نو کرنا ہوگا بلوچی کی اپنی اصناف میں شاعری کرنے کا، شاعری کرانے کا۔ لیلڑی، ڈیہی، دستانغ، زہیرونک، لیلی مور، لیکو......... ہم ایک گلستان رکھتے ہیں اصناف کا!!۔

لیاری کی پروین بے شمار انسانی دکھ (ذاتی، خاندانی، معاشرتی) اپنے سینے میں بھگت اور رکھ کر انسانوں کی بہبود کے لیے کام کرتی رہتی ہے۔ ایک ہاتھ میں کئی خربوز لیے ہانپ کانپ کام میں جتی رہتی ہے۔ وہ تو خود بھی بہت اچھی بیٹی ہے، اُس پہ یہ کہ وہ نور محمد شیخ کے لیاری کی ہے، لعل بخش رند کے

لیاری کی ہے۔ بلند قامت انسانوں کے علاقے میں پیدا ہونا ہی بلند توقعات وابستہ کرا دیتا ہے۔
..... وہ اس بار نوجوانوں کا ایک ڈرامہ گروپ لیاری سے ساتھ لائی تھی۔ باصلاحیت نوعمر بلوچ ڈرامہ آرٹسٹس۔عورت کے مسائل وحقوق پہ مبنی اُن کا پیش کردہ ڈرامہ بلوچ معاشرے بالخصوص کراچی کے بلوچ معاشرے کا خوب عکاس تھا۔

******

اِس بار ہم نے بہت برس بعد بخشی ہوٹل پھر دیکھا: گوادر، بخشی ہوٹل۔ بخشی ہوٹل، گوادر۔خود تو بل نگوئر کا ہمارا سرخ وسفید اور گپ شپی دوست اب حیات نہ تھا، مگر اُس کی نشانیاں باقی تھیں۔اور نشانیوں کو ہونہار بیٹے اور داماد جس قدر بھی سنبھال رکھیں، نشانیاں تو نشانیاں رہتی ہیں۔ اب میں دوستوں کی محفل میں بیٹھے اپنے دل کو چھیڑ رہا تھا کہ گوادر کے میلوں میں گوادر کے ''مری ہر دم یاد کرتے رہیں گے کہ ارے آج مست نہیں ہے، مست کی شاعری کے ریلے نہیں ہیں''۔ بخشی تم بہت یاد آئے، امیر الدین تم بہت یاد آئے ..... مجھے اپنا آپ اچھا لگا کہ میں اپنے یاروں کو بھولا نہ تھا۔ یادیں تو صرف ''انسان'' کے ساتھ ہوتی ہیں ناں!!

وہیں بخشی ہوٹل میں رات کو دوستوں نے موسیقی کا پروگرام منعقد کرایا، بہت محظوظ ہوئے۔ دوستوں کی طرف سے دوستوں کو بخشے احترام کے گھونٹ لیے۔خلوص میں خالص، مقدار سخاوت کی ہم پلہ، تناول بہت ہی حسبِ استطاعت۔کبھی نواسے پوتے ہنسیں گے کہ ''اُس'' نے کوئٹہ سے گوادر جا کر جینڈ کو ڈاچی کے دودھ کا انتظام کرنے کو کہا، جینڈ نے ضیا کو، ضیا نے عابد کو، عابد نے بجار کو، بجار نے گلزار کو، گلزار نے دکاندار کو.....۔

کچھ دوست سیروں اور کلوگراموں کے حساب سے کچلانگل کر رہے تھے اور کچھ بیچارے چھ فیصد والے نیم کڑوے بادام کے محض ایک ہی دانے سے مغز کو پر مغز بناتے جا رہے تھے۔کسی کسی نے تو پورا تاکستان گود میں لے رکھا تھا۔اُس پلنگ پہ دیکھو ایک دوست بیٹھا ذکر وفکر میں مصروف ہے، اِدھر دوسرا مینڈھے پہ مینڈھا خیرات کرتا جا رہا ہے۔اور ترسیل؟۔ وہ تو جیسے گاؤں کی تقریب میں اجتماع کے لیے

رکھے گھڑے پر مسیحائی ہاتھ لگا ہو، پورا گاؤں پی جائے، گھڑا کے اندر سیال کی سطح وہیں کی وہیں رہے۔

تفکّر کے نان سٹاپ پراسیس پہ شاہ لطیف کے جوگیوں کا کالا لباس ڈالے رہنے کے بعد بحال ہوئے تو بخشی ہوٹل کے لان میں اصغر بلوچ کی موسیقی کا انتظام ہو چکا تھا۔وہ آر سی ڈی سی سکول میں استاد ہے۔گاتا رہا، سناتا رہا۔ میں نے جب غور سے محفل کا جائزہ لیا تو خوش گوار حیرت ہوئی کہ ہم بلوچستان میں تھے۔زُہد وتقویٰ کے معانی بدل ڈالنے والے خالص بلوچستان میں۔الحمدللہ ہم فکری طور پر آلودہ شدہ کوئٹہ میں نہیں، ابھی تک خالص بلوچ وطن گوادر میں تھے۔ مجھے اپنا بلوچ ہونا اچھا لگا۔

خاصا وقت گزرنے نے، اور خنکی نے، سمندر کی گود میں بیٹھے ہمارے شعور وجسم کا مطلع صاف کر دیا تھا۔تب پروین کی اطلاع اور ہماری فرمائش نما اجازت سے لیاری کے دو نوجوان، استاد بن کر ساز وزیمل کی محفل پر باقاعدہ چھا گئے۔ایسا لگا جیسے شانتی نکیتن یہاں آ چکا تھا، جیسے شوپین سویرکا نغمہ بجا رہا ہو۔ مجھے ارباب خان کھوسو کے یہ بچے فخر کے سلیمان تخت پر بٹھا چکے تھے۔ یہ دو بچے عادل مراد اور عاصم مراد گا رہے تھے اور، بہرام وگوہرام نامی دو بچے ہماری خدمت کر رہے تھے۔ جیتے رہو۔

اگلے روز ہم کوہِ باثیل پر تھے۔اُسے، اور اُس کے ایک قدم کے نیچے موجود آبِ حیات، اور دوسرے قدم کے نیچے موجود خاکِ وطن کو خدا حافظ کہنے۔کوہِ باثیل تو دنیا میں مٹی اور پانی کا بٹوارہ کرتا ہے۔ایک طرف بلوچستان کی وسیع زمین ہے جو یہاں سے جھنگ وجیکب آباد وچاہ بہار تک پھیلی ہوئی ہے اور دوسری طرف بے انت پانی ہے جو نیل اور سرخ اور کالا پانی سے جا ملتا ہے۔ تصویریں، تبصرے، قہقہے۔.....انسان کے بنا نہ سمندر نہ خشکی نہ باثیل۔

ہم نے دوپہر کا کھانا کھایا، سورج کے شہر اور سورج طلوع ہونے کی طرف روانہ ہوئے گوادر کو الوداع کہا۔